اردو نظم میں مناظر فطرت

(قطب شاہی دور سے گلوبل وارمنگ تک)

ڈاکٹر صبیحہ ناہید

ڈاکٹر صبیحہ ناہید کا تعلق درگاہ بیلا' ویشالی' بہار کے ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ انہوں نے متھلا یونیورسٹی دربھنگہ سے اردو میں ایم اے اور بی ایڈ کیا نیز جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق تعلیم کے زمانے سے ہی تھا۔ اسکول کے زمانے میں اکثر آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس پر ان کے خطوط و مضامین شامل ہوتے رہے ہیں۔ ادبی' معاشرتی' سماجی اور اصلاحی موضوعات پر مضامین مختلف رسائل و جرائد میں بھی آتے رہے ہیں۔ کئی درجن بک ریویوز بھی انہوں نے کئے ہیں۔ شاعری سے بھی شغف ہے اور مشاعروں میں ان کی شرکت ہوتی رہتی ہے۔

نام کتاب	:	**اردو نظم میں مناظر فطرت**
مصنفہ و ناشرہ	:	ڈاکٹر صبیحہ ناہید
مطبع	:	نیو پرنٹ سینٹر، دہلی
سرورق کی پینٹنگ	:	انیقہ نرگس
زیر اہتمام	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Urdu Nazm mein Munazire Fitrat
by **Dr. Sabiha Naheed**
1st Edition: 2019 ` 350/-

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی-6	011-23260668
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی	011-23276526
رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد	+91 7905454042
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	+91 9358251117
بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ-4	+91 9304888739
کتاب دار، ممبئی	+91 9869321477
ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد	+91 9246271637
مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد	+91 9325203227
عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ	+91 9433050634
قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر	+91 9797352280
امرین بک ایجنسی، احمد آباد، گجرات	+91 8401010786

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +91 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

انتساب

میں اپنی یہ کتاب

اپنے ابّو **محمد علی اختر**

اور

امّی طلعت بانو

کے نام منسوب کرتی ہوں

جن کی محبت اور دعائیں

میری زندگی کا

سب سے قیمتی

سرمایہ

ہیں

فہرست

❁ ❁ ❁

پیش لفظ

بزرگوں سے یہ قول سنا کرتے تھے کہ غصّہ اور عقل میں سوتیلا پن کا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک آئے تو دوسرا چلا جاتا ہے۔ یعنی دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہی قول کلّی طور پر مناظر فطرت اور گلوبل وارمنگ پر صادق آتا ہے۔ یعنی گلوبل وارمنگ کی موجودگی میں مناظر فطرت نہیں رہ سکتے یا بہ الفاظ دیگر، اگر مناظر فطرت اپنے پورے آب وتاب سے قائم رہیں تو گلوبل وارمنگ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ انھیں ادھیڑ بُن کا نتیجہ ہے میری یہ کتاب "اردو نظم میں مناظر فطرت: قطب شاہی دور سے گلوبل وارمنگ تک"۔

منظر نگاری ایک ایسا موضوع ہے جس کا ذکر تمام مذاہب کے صحیفوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ قرآن مجید میں خاص طور سے مناظر و مظاہر کے تذکرے خدا کے وجود کو پہچاننے کے حوالے سے جا بجا موجود ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی ادب منظر نگاری کے تذکروں سے اچھوتا نہیں۔ اردو زبان جب اپنے ابتدائی مراحل میں تھی تب بھی شعرا کرام نے منظر نگاری کو موضوع کلام بنایا۔

قلی قطب شاہ کو پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے۔ انہوں نے مناظر فطرت پر کافی توجہ دی۔ انہوں نے اپنے دور سلطنت میں جہاں مناظر فطرت کو فروغ دینے والے کام، مثلاً باغ لگوانا، نہریں کھدوانا وغیرہ کیے نیز منظر نگاری کو اپنے کلام میں بڑی اہمیت کے ساتھ جگہ دی۔ کلیات قلی قطب شاہ کا مطالعہ کرنے سے اندازا ہوتا ہے کہ فطری منظر نگاری ان کے کلام کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دکن اور شمالی ہند کے متعدد شعرا نے بھی کسی نہ کسی شکل میں مناظر فطرت کو اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ نظموں، مثنویوں، قصیدوں

اور دیگر اصناف سخن کے علاوہ مرثیہ جیسے سنجیدہ اور خشک صنف میں بھی انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ نویسوں کے کلام میں منظر نگاری کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اردو ادب کی بساط بھی الٹ پلٹ کا شکار ہوئی۔ نئی تحریکات اور رجحانات نے جنم لیا اور اردو شاعری بھی زمانے کے ان حوادث کا شکار ہوئی نیز منظر نگاری بھی پھیکی پڑنے لگی اور زمانے کی گرد نے اسے اور دھندلا کر دیا۔ نئے عوامل اور نئی ترجیحات نے جنم لیا اور شعرا نے اسے موضوع بحث بنا لیا اور مناظر فطرت کے تذکروں سے ہماری اردو شاعری خالی ہونے لگی۔ صنعتی انقلاب اور صارفی معاشرے نیز short term gain کی لوگوں کی خواہش و خود غرضی نے بھی منظر نگاری اور فطری مناظر دونوں کو متاثر کیا ہے۔

پچھلی دو صدیوں میں اردو دنیا میں اس موضوع پر تحقیقی کام جو بھی ہوئے ہیں وہ بہت کم ہیں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی ایک مربوط اور ضخیم کتاب 'اردو شاعری میں منظر نگاری'' دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں موضوع کا واقعی حق ادا کیا ہے لیکن ان کے علاوہ چند دیگر مصنفین ہی ہونگے جنہوں نے کوئی قابل ذکر تحقیقی کاوش اس موضوع پر کی ہو۔

ظاہری بات ہے ہر عہد کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس عہد کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن میں ایک تقاضے کا نام ''ماحولیات'' ہے۔ ماحولیات کا سیدھا تعلق مناظر فطرت سے ہے اور ماحولیات کو آلودگی سے بچانا موجودہ دور کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس پر مباحث کئے جا رہے ہیں اور اسے بچانے کے لئے مختلف اقدام بھی اٹھائے جا رہے ہیں۔

شعرا حضرات نے اپنے کلام کے ذریعے ہر دور میں پائی جانے والی مختلف آلودگیوں کو دور کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر نظم جدید کی تحریک نیز آزادی کے بعد تک سیاسی' سماجی' معاشی' معاشرتی وتہذیبی آلودگیوں کو دور کرنے کی کوشش اپنے فکر وفن کے ذریعے کی ہے۔ موجودہ دور میں ان آلودگیوں کے علاوہ ایک ہولناک قسم کی آلودگی 'فضائی آلودگی' ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس آلودگی کو دور کرنے کی بھی اسی sprit کے ساتھ کوشش ہمارے شعرا کو کرنی چاہئیے' جیسا کہ ماضی میں مختلف قسم کی آلودگیوں

کے لئے کی جاتی رہی ہے۔ یہی جذبات و خیالات میری اس کتاب کا محرک بنے ہیں۔ میں نے اپنی اس کتاب میں جہاں مناظر فطرت کی اہمیت و افادیت اور اس پر مزید فکر و تحقیق کرنے کی بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اسے براہ راست ماحولیات اور گلوبل وارمنگ سے جوڑنے کی سعی بھی کی ہے۔ اگر منظر نگاری پر خصوصی توجہ دی جائے اور اس سمت مناسب اقدام اٹھائے جائیں نیز اسے تحقیق کا ایک اہم موضوع بنایا جائے تو اس سے جہاں یہ کرۂ ارض خوشنما ہو جائے گا وہاں گلوبل وارمنگ یا فضائی آلودگی کو دور کرنے میں بھی بہت حد تک مدد ملے گی۔

میں نے اپنی اس کتاب کو بنیادی طور پر چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ یہ ابواب مختلف ادوار پر مبنی ہیں۔ پہلے باب کو منظر نگاری کے مختلف ادوار کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ اس میں مختلف ادوار میں منظر نگاری کے نشیب و فراز پر گفتگو کی گئی ہے اور گلوبل وارمنگ کا تعارف و اس کے اردو شاعری پر پائے جانے والے اثرات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح قطب شاہی دور (دکن و شمالی ہند)' انجمن پنجاب کا دور' آزادی سے قبل کا دور' (ترقی پسند تحریک سے قبل' ترقی پسند تحریک کے تحت' حلقہ ارباب ذوق کے تحت اور ترقی پسند عہد کے غیر ترقی پسند شعرا)' آزادی کے بعد کا دور (دور جدیدیت' دور مابعد جدید)۔ گلوبل وارمنگ اور مناظر فطرت، سبھی عنوانات کے تحت منظر نگاری یا ماحولیات کی مختلف انداز میں احاطہ بندی کی گئی ہے۔

فطری منظر نگاری ایک ایسا موضوع ہے جو دلچسپ، خوبصورت تو ہے ہی ساتھ ساتھ اس پر مزید فکر و تحقیق کا ہونا وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ اسباب خواہ جو بھی ہوں اس پر کام بہت کم ہوا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ضرور اس پر مربوط اور دقیق قسم کی تحقیق کی ہے لیکن وہ بھی آدھی صدی قبل کا کام ہے۔ اس کے بعد اردو دنیا میں بیشمار انقلابات آئے کئی رجحانات بدلے تو کئی نے نیا جنم لیا۔ ایسی صورت حال میں اس پر نئے سرے سے توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔

میں شکر گزار ہوں اس رب العامین کی جس نے مجھے اس دقیق اور وسیع موضوع کا

مطالعہ کرنے کی ہمت اور طاقت عطا کی ۔ میں مرہون منت ہوں اپنے استاد محترم خالد محمود صاحب کی جنہوں نے فطری منظر نگاری کو اپنی اس کتاب کا موضوع بنانے کی طرف متوجہ کیا۔ میں سپاس گذار ہوں مشفق استاد محترم کوثر مظہری صاحب کی جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل کے مرحلے میں کرم فرمائی' حوصلہ افزائی اور راہ نمائی قدم قدم پر کی ۔ مجھے اس موضوع پر کام کرتے وقت متعدد دانشوروں سے ہمت افزائی ملتی رہی جن میں استاد محترم مرحوم ماسٹر عمران (دربھنگہ) میرے ماموں ڈاکٹر ایم اعجاز حسین' سربراہ شعبہ فرزیوتھراپی' جامعہ ملیہ اسلامیہ، عزیز ڈاکٹر غلام نبی احمد' استاد شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی اور ڈاکٹر اقبال حسین' ایم ایس کالج موتیہاری میں انگریزی کے استاد قابل ذکر ہیں ۔ میں اگر اپنے شوہر اے یو آصف اور بچوں انیقہ' ثالث' ماریہ' سیف' نبیلہ اور ماہم کا شکریہ ادا نہ کروں تو ناانصافی ہوگی کیونکہ ان کی محبت' دلچسپی' موجودگی اور تعاون نہ ہوتا تو میں اس تحقیقی کام کو مکمل کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتی ۔ اللہ انہیں دین و دنیا میں سرفراز کرے ۔ طیبہ اور ذکیہ کو بھی میں کیسے بھول سکتی ہوں جن کی حوصلہ افزا باتیں میرے لئے ٹانک کا کام کرتی رہیں ۔ اللہ انہیں بھی جزائے خیر دے ۔ آمین

اس کتاب کا انتساب میں اپنے ابّو محمد علی اختر اور امّی طلعت بانو کو کرتی ہوں جن کی بے لوث محبت اور دعائیں میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں ۔ اس کتاب کا ٹائیٹل صفحہ میری بیٹی انیقہ نرگس کے آرٹ سے مزین ہے' جو قومی سطح پر اپنی پینٹنگ کے لئے جانی جاتی ہیں اور متعدد قومی ایوارڈز حاصل کر چکی ہیں ۔

23-11-2019

—— ڈاکٹر صبیحہ ناہید
mob-9810765575
email-snaheed3@gmail.com

تاثر

اردو میں نظمیہ شاعری کی روایت قدیم رہی ہے۔قلی قطب شاہی عہد سے لے کر دور جدید تک ایک نہایت ہی توانا اور مستحکم روایت ملتی ہے۔موضوعات کی سطح پر دیکھا جائے تو اس میں بھی گراں قدر تنوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔اردو شاعری میں مناظر فطرت کا بیان بھی ایک ایسا موضوع رہا ہے جس پر پُر کیف اور پُر کار نظمیں کہی گئی ہیں۔

صبیحہ ناہید نے اپنی اس کتاب میں دکنی شعرا میں قلی قطب شاہ، ملا وجہی، ولی دکنی وغیرہ سے لے کر شمالی ہند کے قدیم شعرا میں فائز دہلوی، سودا، میر انشا، انیس و دبیر وغیرہ تک کی نظموں میں مناظر فطرت کی جستجو کی ہے۔'انجمن پنجاب' کے قیام کو اردو شاعری بالخصوص اردو نظم کے باب میں ایک طرح سے ٹرنگ پوائنٹ تصور کیا جاتا ہے۔جہاں موضوعاتی سطح پر شرح ربط کے ساتھ نظمیں لکھی گئیں۔محمد حسین آزاد اور حالی وغیرہ کے یہاں اس نوع کی نظمیں خوب ملتی ہیں۔یہ وہ زمانہ ہے جب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم سامنے آرہے تھے جو اردو کے شعرا کو متاثر کر رہے تھے۔لہذا اردو نظم نگاری کو انگریزی شاعری سے بھی روشنی ملی۔ اب ایک ذرا ٹھہر کر نظیرا کبرآبادی کو دیکھیے کہ مناظر فطرت اور ہندوستانی رنگ کو جس شدّت اور پُرخلوص انداز میں انھوں نے پیش کیا ہے، وہ لائق توجہ اور قابل ستائش ہے۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نظیر تنہا ایسے شاعر ہیں جن کی متن کی تابندگی آج بھی برقرار ہے۔

اس طرح اسمٰعیل میرٹھی نے بھی ایسی پراثر اور رواں نظمیں لکھی ہیں جو دامن دل کو کھینچتی ہیں۔علامہ اقبال اور چکبست کے یہاں مناظر فطرت کی عکاسی پورے آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔صبیحہ ناہید نے ان شعرا کی نظموں اور ان کے ٹکڑوں کی مدد سے مناظر

فطرت کی تعبیر وتفسیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے بعد مصنفہ نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کہی جانے والی نظموں کا جائزہ لیا ہے۔اس باب میں فراق، جوش، اختر شیرانی، فیض، احسان دانش، سلام مچھلی شہری وغیرہ کی نظموں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ترقی پسند تحریک کے متوازی میلان کے طور پر حلقہ ارباب ذوق کا ذکر بھی اہم ہے، لیکن مناظر فطرت کا وہ رنگ یہاں کم ہی ملے گا جو ترقی پسندوں اور ان سے پہلے کے شعرا میں ملتا ہے۔ تاہم صبیحہ ناہید نے ایسی نظموں کی چھان پھٹک کرنے کی کوشش کی ہے۔اس طرح جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زمانے سے وابستہ شعرا کی نظموں میں مناظر فطرت کی تلاش کی گئی ہے۔آج کے تازہ کار شعرا نے مناظر فطرت اور گلوبل وارمنگ کے مابین کہیں نہ کہیں رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔فطرت اور نیچر کے ساتھ ہم رشتگی انسانی زندگی اور معاشرے کے لئے بے حد ضروری ہے۔روئے زمین پر پیڑ پودوں، پہاڑوں اور دریاؤں سے جو ماحولیاتی توازن پیدا ہوتا ہے، اس حقیقت سے بھی آج کے شعرا کو واقف ہونے اور اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔صبیحہ ناہید کی یہ کتاب اس کام کے لئے شعرا اور نقاد دونوں کے لئے مہمیز کرنے کا کام کرے گی۔اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

—— پروفیسر کوثر مظہری
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

بابِ اوّل

منظر نگاری کے مختلف ادوار

منظر نگاری کے مختلف ادوار

تاریخ گواہ ہے کہ کائنات ہو یا انسانی زندگی، نشیب وفراز اس کا جز لاینفک ہے۔ لہٰذا اردو شاعری کی تاریخ بھی اس سے اچھوتی نہیں رہ سکتی۔ اردو شاعری پر غور وفکر کرتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ قطب شاہی دور سے صنعتی انقلاب، انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی عہد، اقتصادی اصلاحات اور گلوبلائزیشن تک مختلف ادوار میں اتار چڑھاؤ کی منزلوں سے گذرتی رہی ہے۔ متعدد تہذیبوں، رجحانات اور تحریکات نیز حالات وواقعات نے بھی اس کو کسی نہ کسی طرح اثر انداز کیا ہے۔ سب سے افسوسناک بات تو یہ ہے کہ جوں جوں یہ کرۂ ارض مناظر فطرت سے محروم ہوتا جا رہا ہے، محض شاعری ہی متاثر نہیں ہو رہی ہے بلکہ بنی نوع انسان سمیت اس روئے زمین پر پائی جانے والی تمام مخلوقات کی زندگیوں کو بھی اس سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ دنیا کو درپیش گلوبل وارمنگ جیسا سنگین مسئلہ ہے۔

گلوبل وارمنگ اور اس کے اثرات

گلوبل وارمنگ ایسی ماحولیاتی تبدیلی ہے جو اس کرۂ ارض کو لگاتار گرم کرتی جا رہی ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی ایک موٹی چادر فضا کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں زمین کے ایک بڑے حصے میں پانی اور غذا کا شدید بحران ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اگر یہی صورت حال بنی رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ زمین جانداروں کے رہنے کے قابل نہیں رہ جائیگی۔

دنیا کے ممتاز سائنسدانوں کی ٹیم نے اپنے ایک تازہ تحقیقی مقالے میں خبردار کیا ہے کہ اگر انسان نے اپنا قبلہ درست نہیں کیا اور ماحولیاتی آلودگی کا سلسلہ یوں ہی جاری رکھا تو صرف چند عشروں بعد ہی زمین کا اوسط درجۂ حرارت' قبل صنعتی عہد کے اوسط سے دو درجہ سینٹی گریڈ بڑھ سکتا ہے۔ جس کے بعد زمین نہ صرف شدید گرم ہو جائیگی بلکہ اس کے نہ رکنے والے سانحاتی اثرات بھی مرتب ہونے لگیں گے۔ سائنس کی زبان میں اسے 'ہوٹ ہاؤس' یا 'گرم گھر' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی ممکنہ کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے گرمی

بڑھنے کے نتیجے میں قبطین اور دوسرے سرد مقامات پر موجود بیشتر گلیشیرز پگھل جائیں گے' جس سے سطح سمندر کے بلند ہونے کا خطرہ لاحق ہے جس کے نتیجہ میں زمین کے بعض علاقے زیر آب ہو جائیں گے۔ امریکی جریدے پروسیڈنگز آف دی نیشنل اکیڈمی آف سائنسز (پی این اے ایس) کے مطابق ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ درجہ حرارت میں اضافے کو دو درجہ سینٹی گریڈ تک برقرار رکھنے سے بھی انسانیت کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔ اور اس کے بعد ہولناک قدرتی آفات کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔

قدرتی سانحات پر بات کرتے ہوئے اسٹوک ہوم یونیورسٹی کے ماہر اور تحقیق ٹیم کے رکن پروفیسر جوہان راکٹروم کہتے ہیں کہ اوسط گرمی بڑھنے سے ڈومینو اثر کے تحت واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور زمین کے بعض علاقے رہنے کے قابل نہ ہونگے۔ اس ضمن میں ماہرین نے زمین پر رونما ہونے والے ۹ اہم قدرتی سانحات کا بھی ذکر کیا ہے' جن میں مستقل برفیلے علاقوں (پرمافروسٹ) میں برف کا پگھلنا' سمندری فرش سے میتھین ہائیڈریٹس کا اخراج' خشکی اور سمندروں میں کاربن جذب کرنے والے قدرتی نظام (کاربن سنک) کی کمزوری' عالمی تپش بڑھنے سے سمندری بیکٹریا میں اضافہ اور نتیجتاً سطح سمندر سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کا زیادہ اخراج' ایمیزون جنگلات کی موت' موسم گرما کے درمیان قطب شمالی پر برف میں غیر معمولی کمی' صنوبر کے جنگلات (کونیفیرس فوریسٹ) میں کمی' قطب جنوبی پر برف کا پگھلاؤ اور قبطین پر برف کی چادروں کا سکڑنا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی گلوبل وارمنگ کی وجہ سے مزید ایسے سانحات بھی ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں ہم نے سوچا بھی نہیں ہے۔

موجودہ تیز رفتار صنعتی ترقی سے پہلے جنگلات کی کثرت اور مظاہر قدرت سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنے کی وجہ سے آلودگی کا مسئلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اب کل کارخانوں کی کثرت' صنعتی فضلات کی نکاسی کے مناسب انتظام سے غفلت' آبادی کا پھیلاؤ' آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن کا بے دریغ استعمال' جنگلات کی بے تحاشہ کٹائی' دریاؤں میں فضلات کا بہاؤ' پرشور سواریوں اور مشینوں کا استعمال' اور اس طرح کے مختلف اسباب ہیں جن کی وجہ سے

ماحولیات میں عدم توازن پیدا ہوتا جا رہا ہے۔

حالات کی انہیں سنگینیوں کو دیکھتے ہوئے اور عالمی ماحولیات کی حفاظت اور کرۂ ارض کو بہتر بنانے کی تجدید عہد کے طور پر ہر سال ۵ جون کو عالمی پیمانے پر ''یوم ماحولیات'' منایا جاتا ہے اور بنی نوع انسان اور ماحولیات کو ایک دوسرے سے قریب کرنے واس کی اہمیت اور افادیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سنہ ۲۰۱۷ء میں منائے جانے والے سال عالمی ماحولیات کا مرکزی خیال تو ''انسان کو فطرت سے قریب کرنا'' طے پایا تھا۔ اس ضمن میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر لگاتار کوششیں جاری ہیں۔

ماحولیات کو بچانے میں اردو شاعری کا کردار

یہی وجہ ہے کہ اس وقت سبھی کی کوشش یہی ہے کہ کس طرح کرۂ ارض کو اس خطرے سے بچایا جائے اور اس سلسلے میں مختلف تدابیر بھی اختیار کی جا رہی ہیں۔ اردو شاعری جس نے ابتدا سے ہی اس جانب عام لوگوں کی توجہ مختلف ادوار میں مبذول کرا کے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، آج اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ بھی اس بحران سے نمٹنے میں ایک بار پھر اپنا کلیدی رول ادا کرے۔ مگر یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب مناظر فطرت قائم رہیں گے اور ان کا وجود باقی رہے گا۔ سڑکوں کے دونوں کنارے صرف درخت لگانے سے فضائی آلودگی تو کچھ کم ضرور ہو سکتی ہے مگر مناظر فطرت سے دوری اور کمی کا مسئلہ اپنی جگہ رہ جاتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو شاعری اور مناظر فطرت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

اردو نظم کی توجہ مناظر فطرت کے تئیں ابتدا ہی سے رہی ہے۔ مگر اس کی باضابطہ شکل قطب شاہی دور میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ''انجمن پنجاب'' جس کے روح رواں محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے، کے تحت اسے مزید فروغ ملا۔ نیز اس سے قبل اور بعد نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، اقبال، اسمٰعیل میرٹھی، سیماب اکبر آبادی، سرور جہاں آبادی اور چکبست کے کردار بھی اس کو پروان چڑھانے میں اہم رہے۔ گرچہ ترقی پسند تحریک کا زور ظلم

وجبر کے خلاف اور غریب کسان اور مزدور کے حق میں زیادہ رہا ہے، اس کے باوجود اس کے بعض ممتاز شعرا فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، سجاد ظہیر، اختر شیرانی، اختر اورینوی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور سلام مچھلی شہری و دیگر نے منظر نگاری پر خصوصی توجہ دی اور اس کا زکو کافی آگے بڑھایا۔ حلقہ ارباب ذوق بشمول ن م راشد، میرا جی، یوسف ظفر، قیوم نظر، ضیا جالندھری اور مختار صدیقی کی نظمیں بھی اس ضمن میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ خاص بات تو یہ ہے کہ ترقی پسند عہد میں بھی افسر میرٹھی، حفیظ جالندھی، جمیل مظہری، سلام سندیلوی ، احسان دانش، مجید امجد اور اختر الایمان و دیگر جیسے کچھ غیر ترقی پسند شعرا دکھائی پڑتے ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں خاصی شہرت پائی۔

آزادی کے بعد منظر نگاری کا سلسلہ کم تو ہوا مگر رکا نہیں۔ اس دور میں خلیل الرحمٰن اعظمی، شفیق فاطمہ شعریٰ، عمیق حنفی، مظہر امام، بلراج کومل، شہریار اور ندا فاضلی و دیگر نے اسے جلا بخشی۔ حتیٰ کہ 1980 کے بعد بھی عنبر بہرائچی، صلاح الدین پرویز، عذرا پروین، جینت پرمار، فرحت احساس، راشد انور راشد، عادل حیات و چند معدودے نے منظر نگاری کو بھی اپنی خصوصی دلچسپی میں شامل کیا ہے مگر اس تلخ حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ اس رجحان میں واضح کمی آئی ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ فطری وتعمیر پسند شعر وادب کا دعویٰ کرنے والوں کے یہاں بھی یہ رجحان خال خال نظر آتا ہے۔

منظر نگاری کی ابتدا

برصغیر میں ابتدائی دور میں مثنویوں کا رواج تھا اور فرضی قصے منظوم ہوا کرتے تھے۔ اس دور کی مثنویوں کو دکن اور شمالی ہند کے دوزمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دکنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلی بنیاد رکھی گئی۔ اردو کے ابتدائی شعرا کے یہاں قصیدہ، مثنوی، وغیرہ میں نیچر کے تذکرے نظامی، محمد قلی قطب شاہ، ولی، فائز کے یہاں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دکن کے شعرا نے مناظر فطرت کو زیادہ صاف اور واضح لفظوں میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے منظر کو بیان کرنے میں بیجا مبالغہ آرائی، تصنع

اور تکلف سے پرہیز کیا ہے۔ اپنے ان ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر منظر نگاری کی جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ دکنی شاعری میں حسن و عشق کے بھی وہی مضامین اور تصورات پیش کئے گئے جو ہندوستانی ذوق سے مطابقت رکھتے ہوں۔ غرض کہ دکن کی قدیم اردو شاعری پر ہندوستانی اقدار، ہندوستانی ماحول اور روایات کی گہری چھاپ شمالی ہند کے مقابلے زیادہ صاف اور واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

شمالی ہند کی ابتدائی دور کی شاعری کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے شعرا نے اپنی منظر نگاری میں دیگر ممالک کا خیالی اور تصوراتی نقشہ بھی کھینچا ہے اور اپنی تخلیقی اور فنی صلاحیتوں و تجربوں کا استعمال کر کے انہیں صداقت کا رنگ دے دیا ہے۔ شمالی ہند کی مثنویوں کی ایک اور خاص بات زبان و بیان کی صفائی، سلاست اور روانی ہے جو دکن کی اردو مثنویوں میں بتدریج کم پائی جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت دکن میں اردو زبان اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی لیکن شمالی ہند میں زبان و بیان کو سنوارنے اور نکھارنے کی باقاعدہ تحریک پہلے سے جاری تھی۔ شمالی ہند کی ابتدائی دور کی مثنویوں کے خاص موضوعات سراپا نگاری، جذبات نگاری اور منظر نگاری رہے ہیں۔ اس دور کے کلام میں ایک عالم گیر منظر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے 'غدر' اور جدو جہد کی ناکامی نے ہندوستانیوں کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ ملک پر برطانیہ کی حکومت کا تسلط مکمل طور پر قائم ہو گیا۔ بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ لہٰذا ادب میں بھی ان تبدیلیوں کا آنا ناگزیر تھا۔ ادب کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور اردو شاعری بھی اس سے متاثر ہوئی۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی مثبت تھی، لہٰذا اس کا اثر بھی مثبت ہی پڑا اور نظم نگاری کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔

سر سید کی فکر سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے "نیچرل شاعری" کی بنیاد ڈالی اور پھر باقاعدہ شعوری طور پر "جدید نظم نگاری" کی ابتدا ہوئی۔ اس جدید نظم نگاری کی تحریک کو "انجمن پنجاب" کا نام دیا گیا۔ یہ ایسی تحریک تھی جس نے اردو

وشاعری کو زلف ورخسار اور انگیا چوٹی سے باہر نکال کر زندگی کے گونا گوں مسائل اور عوامل سے روشناس کرایا۔ اس تحریک کا ایک قابل ذکر اور نمایاں کارنامہ اس دور میں پیش کی گئیں منظریہ نظمیں بھی ہیں۔ محمد حسین آزاد، حالی، کرنل ہالرائڈ اور دیگر رفقا کے ذریعہ چلائی گئی اس تحریک نے اردو نظم نگاری کے رخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ کل دس مناظموں پر مشتمل یہ نشستیں اردو شاعری کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس تحریک کے تحت ہونے والی نشستوں میں جو نظمیں پڑھی جاتی تھیں ان کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں منظر نگاری کے خوبصورت نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ خاص طور پر محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کے ذریعے جو نظمیں پیش کی گئیں ان میں بہت ہی خوبصورت منظر نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آزاد اور حالی کے علاوہ ''انجمن پنجاب'' کے ان مناظموں میں دیگر متعدد شعرا نے بھی اپنی نظموں میں مناظر فطرت کے نمونے پیش کئے۔ ان کے کلام یوں تو منظر نگاری سے بھرپور ہیں لیکن ان مناظر کی تصویریں دھندلی ہیں اور زبان و بیان میں سلاست وروانی کی کمی پائی جاتی ہے۔

مختلف زبانوں کے شعرا کی بھی توجہ اس جانب گئی ہے۔ حتیٰ کہ ہندی کے علاوہ پراکرت، سنسکرت، عربی اور فارسی میں بھی اس طرح کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جدید دور میں منظر نگاری کو انگریزی ادب نے سب سے زیادہ اہمیت دی اور اسے کافی وسعت بخشی۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگریزی ادب میں ایک انقلاب آیا جسے رومانیت کا نام دیا گیا۔ اس انقلاب نے منظر نگاری کے باب میں قابل ذکر اضافے کئے۔ اس دور کے انگریزی شعرا نے منظر نگاری کو اپنی شاعری کا ایک اہم موضوع تسلیم کیا۔ چونکہ اردو ادب میں رومانیت کا تصور بڑی حد تک انگریزی ادب کا رہین منت ہے، اسی لئے انگریزی ادب کی طرح اردو ادب میں بھی منظر نگاری کو رومانوی دور میں خاصہ فروغ حاصل ہوا۔

آزادی سے قبل کی نظم نگاری کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ بے شک وہ دور منظر نگاری کے حوالے سے ایک سنہرا دور گزرا ہے۔ اس دور نے ہمیں نظیر اکبرآبادی، اکبرالہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، علامہ اقبال اور دیگر بے شمار ایسے یکتائے زمانہ مفکر شعرا عطا کئے جن

کی شاعری فطری منظر نگاری سے بھرپور تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ فکر و فن کے بہترین امتزاج بھی ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان شعرا نے منظر نگاری کو اپنے کلام کا خاص موضوع بنایا اور بہت خوبصورتی سے برتا۔

نظیر اکبر آبادی گرچہ متذکرہ بالا دیگر شعرا سے کافی قبل کے شاعر ہیں لیکن اردو شاعری میں ان کا اس لحاظ سے ایک خاص مقام و مرتبہ ہے کہ انہوں نے عوام کے لئے شاعری کی اور اسے بادشاہوں کی محفلوں سے باہر نکال کر ہر خاص و عام کی زبان عطا کی۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنہوں نے زندگی کو جشن کی مانند جیا۔ اس بات کا اندازہ ان کی نظموں کے عنوان، بہار، چاندنی، برسات کا تماشا، برسات کی بہاریں، شب برات، بسنت، ہولی دیوالی وغیرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

جدید اردو نظم عظیم شاعر و فلسفی علامہ اقبال کے ہاتھوں معراج کمال کو پہنچی۔ اقبال نے اپنے تفکرانہ پیغام، حکیمانہ بصیرت اور منفرد انداز بیان کے سہارے اردو نظم نگاری کے معیار کو انتہائی بلندیوں پر پہنچایا۔ انہوں نے اسے معنوی وقار اور ظاہری حسن عطا کر کے اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی نظموں کے ربرو لا کھڑا کیا۔ ان کے یہاں صرف فطرت برائے فطرت کا تصور نہیں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے فطرت کو معرفت الٰہی حاصل کرنے کے وسیلے کے طور پر برتا ہے۔ ان کی تمام منظریہ نظموں میں فکر و فن کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، سیماب اکبر آبادی وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں کیونکہ ان حضرات نے بھی اپنے کلام میں منظر نگاری کے بہترین نمونے پیش کئے اور اسے وسیلہ پند و نصیحت بنایا۔

اردو نظم میں منظر نگاری کے حوالے سے تمام ادوار کا مطالعہ کرنے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزادی سے قبل اور اس کے بعد کا دور اردو نظم نگاری کی تاریخ میں بہت ہی افراتفری کا دور رہا ہے۔ اس دور میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات میں بے پناہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ظاہر ہے ہر دور کا ادب اس زمانے کا ترجمان اور آئینہ دار ہوتا ہے لہٰذا اردو نظم بھی بساط ادب کے الٹ پلٹ کا شکار ہوئی جس کے نتیجے میں جہاں کچھ نئی محرکات کا جنم ہوا وہیں بہت سی چیزیں مفقود ہوتی گئیں۔ لہذا منظر نگاری بھی آشوب زمانہ کا بری طرح شکار ہوئی۔

آزادی کے بعد جو شعرا ابھر کر سامنے آئے ان کے یہاں منظر نگاری کے نمونے خال خال دکھائی دیتے ہیں کیونکہ اس دور میں کئی دوسرے موضوعات نے جنم لے لیا۔ یہ موضوعات بظاہر انسانی زندگی سے براہ راست جڑے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ مثلاً آزادی کے بعد صنعت و حرفت کی ترقی، صارفی معاشرے کا رواج، تلاش معاش اور بہتر زندگی کے لئے ہجرت کا سلسلہ، اخلاقی قدروں کا زوال وغیرہ وغیرہ۔ شعرا اور مفکرین انہی موضوعات پر اپنے منظوم خیالات قرطاس ابیض پر بکھیرنے لگے کیونکہ یہ موضوعات براہ راست انسانی زندگی سے جڑے ہوئے محسوس ہو رہے تھے جب کہ حقیقتاً انسانی زندگی سے جڑا رہنے والا سب سے اہم اور زندۂ جاوید موضوع اگر کوئی ہے تو وہ ہے انسان اور اس کا کائنات قدرت و فطرت کا رشتہ۔ باقی تمام موضوعات وقت اور حالات کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ زندگی کے گوناگوں مسائل سے متعلق موضوعات میں الجھ کر شعرا و مفکرین فطرت سے بے اعتنائی کا ثبوت دینے لگے۔ ان کے یہاں اگر منظر نگاری دکھائی بھی دیتی ہے تو علامہ اقبال کی نظم ''ایک آرزو'' جیسی نہیں۔ اگر کہیں فطری مناظر دکھائی بھی دیتے ہیں تو وہ نہایت اداسی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اگر درخت کا تذکرہ ہے تو اس کے پتے زرد ہیں۔ اگر کھیت اور کھلیان کا ذکر ہے تو ان میں ہری بھری فصلیں نہیں ہیں بلکہ مرجھائے ہوئے پودے ہیں۔ اگر پرندوں کا ذکر ہے تو وہ بھی چہچہا نہیں رہے ہیں جیسا کہ اسمٰعیل میرٹھی اور نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ پرندے بھی اس دور کی شاعری میں خاموش اور ملول حالات کا ماتم کر رہے ہوتے ہیں جو کہ ان کی فطرت کے عین منافی ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد مادّہ پرستی اور موقع پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان سے مختلف ادوار میں منظر نگاری کم و بیش متاثر ہوئی ہے۔ گلوبلائیزیشن کے اس دور میں جہاں دنیا ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہے، وہیں فطرت سے بے اعتنائی اور اس کے ساتھ بے جا چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے دنیا گلوبل وارمنگ اور شدید ماحولیاتی بحران سے بھی دوچار ہو رہی اور رفتہ رفتہ ماحولیاتی توازن بگڑتا جا رہا ہے۔ یہ ماحولیاتی بحران جا بجا پھٹنے والے آتش فشاں کی شکل میں آگ اگلتے پہاڑ، بپا ہونے والے طوفان، قہر ڈھانے والی سنامی کی لہریں، بار بار آنے

والے زلزلے، بے موسم برسات، زمین کی بے تحاشا بڑھتی حدّت، گلیشیرز کا تیزی کے ساتھ پگھلنا، سطح سمندر کا بلند ہونا، چھوٹے چھوٹے جزیروں کا غرقاب ہونا، ٹھٹھرانے والی سردی، جھلسانے والی گرمی، مختلف پرندوں چرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کی عنقا ہوتی نسلیں، اس کے علاوہ ڈینگو بخار جیسی جان لیوا بیماری کے مچھروں کی افزائش کو روکنے والے فطرت کے ایک اہم جز مینڈک کی تیزی سے گھٹتی تعداد کی وجہ، بے تحاشہ جنگلوں کی کٹائی، ندی کے کناروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، پہاڑوں کی بیخ کنی، مختلف قسم کی آبی، فضائی اور سماوی آلودگی ہیں۔

اس سلسلے میں جے ڈبلیو بیچ کا قول قابل غور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> ''کسی عظیم شخصیت کی ضرورت ہے جو فطرت کی طرف مادہ پرستوں کو رجوع کرے۔ مثلاً اگر نیوٹن یا ڈارون جیسا موجد پیدا ہو جائے یا کانٹ یا افلاطون جیسا فلسفی پیدا ہو جائے تو پھر منجمد رجحانات میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے۔'' (The Concept of Nature by JW Beach-p 550)

چونکہ کائنات میں انسان اشرف المخلوقات کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سرزمین پر موجود تمام اشیاء خالق کائنات نے انسان کے فائدے کے لئے ہی بنائی ہیں۔ اس لئے پوری بزم قدرت اپنے تمام حسین و جمیل مناظر و مظاہر، تنظیم حیات اور تزئین ہستی کے ساتھ اپنی بقاء کے لئے انسان ہی کی طرف متوجہ ہے۔ اگر صنعتی و تہذیبی ترقی کے ساتھ ساتھ فطرت کی اہمیت کی اندیکھی نہ کی جاتی تو دنیا اس بحران کا شکار ہرگز نہ ہوتی۔ آج قومی اور بین الاقوامی سطح پر پوری دنیا فطرت کو بچانے میں سرگرم عمل ہے کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اس صفحۂ ہستی سے زندگی کا وجود ہی مٹنے کا خطرہ لاحق ہے۔

دنیا کی جتنی فلاحی تنظیمیں ہیں مثلاً UNO, WHO, UNESCO وغیرہ، سبھی ماحولیات کے تحفظ کے لئے مختلف طرح کے اقدام اٹھا رہی ہیں۔ اسی تعلق سے عالمی سطح پر Earth Day اور Environment Day بھی منایا جاتا ہے۔ ملکی سطح پر بھی حکومت نے فطرت سے جڑی ہوئی چیزوں پر کافی توجہ دی ہے۔ ہندوستان میں گوریا کی گھٹتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے Sparrow Day منانے کی ایک اچھی شروعات ہوئی ہے۔

چونکہ کائنات میں انسان اشرف المخلوقات کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سرزمین پر موجود تمام اشیاء خالق کائنات نے انسان کے فائدے کے لئے ہی بنائی ہیں۔اس لئے پوری بزم قدرت اپنے تمام حسین و جمیل مناظر و مظاہر، تنظیم حیات اور تزئین ہستی کے ساتھ اپنی بقا کے لئے انسان ہی کی طرف متوجہ ہیں۔ صنعتی و تہذیبی ترقی کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا اقدامات کے علاوہ ہمارے شعرا اور مفکرین اس طرف بھی توجہ دے رہے ہیں۔ کیونکہ فطرت سے ان دیکھی کرنا اور اس کے ساتھ بے اعتنائی برتنا ہمارے لئے مشکل کا باعث بھی ہے اور خالق کائنات کی عطا کی ہوئی اس سرزمین کے ساتھ ناانصافی بھی۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں منظر نگاری پر توجہ پھر سے دی جانے لگی ہے جس کی ایک زندہ مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر راشد انور راشد کی ہے جنہوں نے اپنا پورا مجموعہ کلام بعنوان ''گیت سناتی ہے ہوا'' عناصر فطرت کے نام کر دیا ہے۔اس مجموعے کا مطالعہ کرتے وقت قاری فطری مناظر کے کیف و سرور سے مکمل طور پر سرشار ہو جاتا ہے۔ اس مجموعہ کلام کے ہر نظم کا عنوان فطرت کے کسی نہ کسی عناصر کی نذر ہے۔ان کے علاوہ بھی متعدد شعرا اور مصنفین و مفکرین اس پر توجہ دے رہے ہیں جو ایک خوش آیند بات ہے۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مادّہ پرستی اور موقع پرستی کے دور میں بھی مناظر فطرت کی جانب توجہ بالکل ختم نہیں ہو سکی اور کرۂ ارض سے ختم ہوتے ہوئے قدرتی مناظر کی وجہ سے پیدا ہونے والے گلوبل وارمنگ کے خطرات کے پیش نظر شعرا اس جانب پھر سے مائل ہو رہے ہیں۔

ایسا بالکل نہیں کہ مناظر فطرت و قدرت اور سائنس ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم غور کریں تو قدرت کے ان نظاروں میں پائی جانے والی ہر ایک شئے میں اتنی سائنٹیفک باریکی دکھائی دیتی ہے کہ عقل و نگاہ متحیر رہ جاتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ فطرت اور سائنس دونوں کے درمیان ایک اعتدال کی فضا پیدا کی جائے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم ہونا چاہیے، منافی نہیں۔

❁ ❁ ❁

باب دوم

قطب شاہی دور

نظم کی ابتدا اور پہلا شاعر

شاعری کا انسانی ترقی میں خاصا حصّہ رہا ہے۔ اخلاق اور تہذیب و تمدن کی اصلاح میں شعر و ادب نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نظموں سے قدرتی جذبات متحرک ہوتے ہیں اور ان میں جوش و ولولہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کی نظموں میں پائی جانے والی منظر نگاری پر روشنی ڈالنے سے قبل اس بات پر تھوڑی بحث کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی اور پہلا صاحب دیوان شاعر کون تھا؟

اس امر کا ٹھیک سے پتہ لگانا بہت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتدا ہوئی لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالم وجود میں آئیں ان میں اوّل نظم ہی کا رواج ہوا کیونکہ نظم انسان کو بالطبع یعنی فطری طور پر مرغوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلمبند ہوا کرتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہیں تھا، سینکڑوں ہزاروں اشعار عرب یاد رکھتے تھے۔ اسی طرح فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لئے گئے اور شاعری بادشاہوں کی خلوت، جلوت، رزم و بزم کا غیر معمولی حصّہ رہی ہیں۔ اس دور میں شاعروں کی کافی عزت افزائی کی جاتی تھی اور انھیں ملک الشعراء کا خطاب بھی دیا جاتا تھا۔

یوں تو یقین کے ساتھ کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی لیکن اردو زبان کے آغاز کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان کا آغاز ۱۰۰۰ء لگ بھگ شمالی ہند میں ہوا۔ صوفی، فقیر اور مذہبی راہنماؤں کے اقوال فقرے اور جملے اردو کے ابتدائی نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک شمالی ہند میں باضابطہ کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ جب اردو دکن پہنچتی ہے تو اس میں تصنیف و تالیف کے کام کا آغاز بھی ہوتا ہے اور ادب بھی تخلیق کی جاتی ہے''[1]

---

[1] (ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''ادبی تحقیق'' میں مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو اردو زبان کی پہلی

موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (متوفی ۔۸۲۵ء) کو دکن کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ سیّد محمد حسینی گیسو درازؒ فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ گیسو دراز دہلی کے مشہور صوفی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے سب سے اہم شاگرد اور خلیفہ تھے۔ خواجہ صاحب کے ارشادات سے فیضیاب ہونے کے لئے بے شمار لوگ آیا کرتے تھے اور آپ اپنے درس قدیم اردو یا دکنی زبان میں دیا کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کی آسانی کے لئے اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دینے لگے۔ پچاس برس پہلے ان کی ایک کتاب ''معراج العاشقین'' منظر عام پر آئی ہے لیکن یہ کتاب ان کی ہے کہ نہیں؟ اس پر اختلاف رائے ہے۔ اس کے علاوہ ان کی چھوٹی چھوٹی منظوم کتابیں ''چکّی نامہ'' ''شکار نامہ'' وغیرہ بھی دستیاب ہوئی ہیں لیکن وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ انھیں کی تصنیف ہے۔

دکھنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلی بنیاد رکھی گئی۔ شاعری کی اصطلاح میں مثنوی اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کی ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور سب اشعار ایک ہی بحر میں ہوں۔ مناظر قدرت وفطرت، فلسفہ وتصوف کے طویل مباحث، حسن وعشق اور رزم وبزم کی داستانیں اس صنف سخن میں بخوبی نظم ہوسکتی ہیں۔ اس ہمہ گیر طرز کی ایجاد کا فخر غالباً ایران کو حاصل ہے اور فارسی شاعری کا گراں ترین گنجینہ اسی صنف کلام میں محفوظ ہے۔ مثنوی ایک ایسی بیانیہ طویل نظم ہوتی ہے جس میں واقعہ کی طوالت کو برقرار رکھنے کے لئے ڈرامائی کیفیت اور منظر کشی کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی نے بھی مثنوی میں حقیقی مناظر اور واقعات کی تفسیر کو ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ سراج اورنگ آبادی کی مثنوی 'بوستان خیال' مولانا محمد حسین آزاد کی مثنوی 'ابر کرم' 'موسم زمستان اور 'صبح امید' اکبرالہ آبادی کی مثنوی 'روانئ آب' اسمٰعیل میرٹھی کی 'برسات' بے

با قاعدہ تصنیف مانتے ہیں۔ ان کے مطابق ''معراج العاشقین جس کے مصنف خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں' کو 'کدم راؤ پدم راؤ'' کے فوراً بعد کی تصنیف مانتے ہیں۔)

نظیر شاہ کی مثنوی 'الکلام' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شوق قدوائی' دیا شنکر نسیم' میر حسن' اقبال' جوش' سردار جعفری' جاں نثار اختر غیرہ کی تمام مثنویوں میں بیان کئے ہوئے مناظر مصوّرانہ شاعری اور منظر نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ حالانکہ مختلف علوم وفنون کی ترقی اور مغربی ادب کے اثرات کی وجہ سے اردو شاعری میں بہت سے نئے نئے تجربے کئے گئے لیکن منظر کشی کے پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر منظر نگاری کے پہلو کو مثنویوں سے ترک کر دیا جائے تو یہ بے رس اور بے رنگ ہو جائیں گی۔ مثنویوں کے علاوہ مرثیہ اور دیگر اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی گئی جن میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دکنی شاعروں نے یقیناً فارسی زبان سے شاعری کا فن تو سیکھا مگر اپنی نظموں کے اکثر موضوعات کو ہندوستانی ماحول سے اخذ کیا۔ اس دور کے شاعروں نے اس وصف کو اتنی ہنرمندی سے برتا کہ خارجی اور داخلی دونوں کیفیات میں حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کہتے ہیں:

> ''دکنی مثنویوں کی منظر نگاری اگرچہ بڑی حد تک مبالغہ اور تصنع سے پاک ہے' تاہم یہ منظر نگاری زیادہ تر تخیلی ہے۔''[۳]

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شمالی ہند کی مثنویوں کی منظر نگاری صرف تخیلی ہے۔ ان کے ان خیالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند کی مثنویوں کے مقابلے دکن کی مثنویاں منظر نگاری کے باب میں بڑی حد تک حقیقت گوئی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ دکنی شاعروں نے مرقع نگاری کے موقع پر مناسب لفظوں کے ذریعے منظر کی ہو بہو تصویر بنائی ہے۔ ان شعراء نے خارجی حالات کی حقیقی مصوّری کے لئے قوت مشاہدہ' زور طبع' لہجے کی شگفتگی اور بیان کی فطری سادگی کو پوری توانائی کے ساتھ برتا ہے۔ ان مثنوی نگاروں نے لفظی اور معنوی صنعتوں کے پردے میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔

دیگر زبانوں کی طرح اردو کی شاعری میں بھی زمانۂ قدیم سے مناظر فطرت کی جھلک کسی نہ کسی انداز میں دیکھنے کو ملتی رہی ہے اور یہ اپنے ارتقائی منازل و مدارج کو طئے بھی کرتی رہی ہے۔ اسکی کوئی بھی صنف یا ہیئت اس سے اچھوتی نہیں ہے۔ اردو کے ابتدائی شعراء

کے یہاں قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ میں نیچر کا تذکرہ نظامی، محمد قلی قطب شاہ، ولی، فائز وغیرہ کے یہاں کافی مل جاتا ہے۔ اردو کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی لہٰذا یہ زبان ہندوستان کی سرزمین کی خارجی فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور شعراء حضرات نے ہندوستان کے فطری مناظر کی کیف سامانیوں سے خوب خوب استفادہ کیا۔ جس شاعر نے بھی بیانیہ شاعری میں دلچسپی لی اس نے نیچر کو اچھی طرح برتا۔ ہمالیہ کی برفیلی چوٹیاں، غروب آفتاب کے وقت آسمان میں تیرتے ہوئے بادل، زمین کی ہریالی، صبح و شام کا دھندلکا، برسات کی بہاریں، آموں کے باغوں کا پھولنا پھلنا، ساون کی پھواریں، بھادوں کی گھن گرج، جاڑوں کے موسم میں کھیتوں میں ہری ہری فصلیں، بسنت رُت میں سرسوں کا پھولنا، گھنے جنگلوں کا سکوت اور گرمی کی شدّت جیسے فطری مناظر نے ہمیشہ شعراء کو متاثر کیا ہے۔ فطرت کی منظر نگاری غزلوں اور قطعات میں بھی برائے تذکرہ ہی سہی یہ موجود ہیں۔ نیز مرثیوں میں تو مناظر فطرت کی جلوہ گری جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ نظم اور مثنوی میں تو مناظر فطرت کا بیان بدرجہ اتم دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک رباعی، قصیدے، شہر آشوب، کا سوال ہے تو ان میں مناظر فطرت کا تذکرہ بھی کسی نہ کسی حد تک پایا ہی جاتا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ ابتدائی دور میں نظم جب اپنی موجودہ خط و خال میں نہیں تھی، اس وقت کی نظمیں بھی مناظر فطرت کے تذکروں سے بالاتر نہیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دور قدیم میں نظموں کی تخلیق کم ہوئی ہے اس لئے نظم گو شعراء کم دکھائی دیتے ہیں لیکن اس دور میں مثنویاں کافی تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ ان مثنویوں میں فطری منظر نگاری کافی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''دکنی شاعری کے ابتدائی دور میں نظم گو شعراء کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر مثنوی گو شعراء کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان شعراء کی مثنویوں میں منظر نگاری کے نمونے بھی موجود ہیں۔''[۲]

فیروز، محمود، مقیمی، صنعتی، ملا خیالی، شیخ احمد گجراتی، وجہی، غواصی، عابد، طبعی، عاجز، ابن نشاطی، نصرتی، عبدل، وجدی، کے ساتھ ساتھ بادشاہوں میں ابراہیم عادل شاہ، چلی عادل شاہ ثانی،

عبداللہ قطب شاہ اور قلی قطب شاہ کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں اور ان کی مثنویاں فطری منظر نگاری کے لئے ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی۔

جن شعراء نے کسی بھی شکل میں نظمیہ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے انکی تخلیق میں مناظر قدرت وفطرت کی جھلک موجود ہے۔قدیم دور میں مثنویوں کی تخلیق زیادہ ہوئی ہے اس لئے اگر ہم دکنی شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کی مثنویوں میں شعراء نے مناظر فطرت کی عکاسی خوب کی ہے۔اس دور کے شعراء کی منظری شاعری کافی حد تک تصنّع سے پاک وصاف ہے کیونکہ انکی تخلیقات ان کی ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں۔

دکنی وشمالی ہند کی شاعری کی خصوصیات

قدیم اردو بالخصوص دبستان دکن کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض نمایاں خصوصیات کم وبیش ہر شاعر کے یہاں موجود ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شاعر اپنی انفرادی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی بعض خصوصیات دکن کے تمام شعراء میں مشترک پائی جاتی ہیں۔

قدیم دکن کی اردو شاعری کی اولین خصوصیت اظہار بیان کی سادگی ہے۔سادگی وروانی اور برجستگی دکنی شاعری کی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جو ۱۷۰۰ء کے بعد شمالی ہند میں نشو ونما پانے والی شاعری میں تدریجی طور پر کم ہوتی گئیں اور اس کی جگہ پر پیچ اسلوب بیان مرصع نگاری اور مشکل پسندی نے لے لی۔دکنی شعراء کے یہاں شاید ہی کوئی مقام ایسا ملے گا جہاں صنائع بدائع کا اہتمام یا مرصع نگاری کی کوشش نہ کی گئی ہو۔قدیم اردو شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت حقیقت پسندی یا واقعہ نگاری کا رجحان ہے۔دکنی شعراء نے اپنے محسوسات' مشاہدات اور زندگی کے تجربات کو بیجا تکلّف اور تصنع کے بغیر حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

• ۱۷۰۰ء کے بعد شمالی ہند میں جس شاعری کو فروغ حاصل ہوا اس پر فارسی شاعری کی

روایات اور رجحانات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جب کے قدیم دکنی شاعری پر ہندوستانی شاعری کی روایات کا اثر غالب ہے۔ اس لئے دکنی شعراء کے کلام میں ہندوستانی ماحول‘ ہندوستانی معاشرت‘ یہاں کے سبزہ وگل‘ مناظر فطرت‘ مقامی پرندے‘ دریا‘ پہاڑ تاریخی اور افسانوی مواد کے حوالے سے جابجا نظر آتے ہیں۔ دکنی شاعری میں حسن و عشق کے وہی مضامین اور تصورات پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستانی ذوق کے مطابق ہوں۔ غرض دکن کی قدیم اردو شاعری پر ہندوستانی اقدار‘ ہندوستانی ماحول اور روایات کی گہری چھاپ شمالی ہند کی اردو شاعری کے مقابلے زیادہ موجود ہے جس کی وجہ سے یہ شاعری ایک ادبی نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

❁ ❁ ❁

دکن کے شعراء

قلی قطب شاہ (۱۶۱۱ء۔۱۵۶۵ء): قطب شاہی دور میں سلطان محمد قُلی قطب شاہ کو ابتدائی دور کے دکنی شعراء کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ (قطب شاہی دور کا آغاز ۱۵۱۸ء میں ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد ۱۶۸۷ء میں ختم ہوگیا۔) قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی تھا جس نے ۱۵۱۸ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اس کے بعد اس کے خاندان کے سات اشخاص یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ سلطان قلی کے بعد جمشید قلی، ابراہیم قلی، محمد قلی، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ نے گولکنڈہ پر حکمرانی کی لیکن جہاں تک فنون لطیفہ اور شعرو ادب کے نشو ونما کا تعلق ہے محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دور حکومت کو تاریخ اردو ادب میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

> ''یہ دونوں قطب شاہی سلاطین نہ صرف رعایا پرور حکمراں، دکنی تہذیب و تمدّن کے معمار، فن تعمیر اور رقص و موسیقی کے دلدادہ تھے بلکہ قدیم اردو یا دکنی اردو کے خوش گو شاعر بھی تھے۔''[۵]

'قلی قطب شاہ' دکن میں گولکنڈہ کے قطب شاہی عہد کا پانچواں سلطان تھا۔ وہ ابراہیم قلی قطب شاہ ولی کا تیسرا فرزند تھا۔ اس نے حیدرآباد میں واقع مشہور دروازہ چار مینار کی سنگ بنیاد ڈالی نیز حیدرآباد شہر کا نام اپنی نومسلمہ بیوی حیدر محل (جو اسلام قبول کرنے سے پہلے بھاگمتی تھی) کے نام پر (۱۶۰۵ء) رکھا۔ قلی قطب شاہ عربی اور فارسی کا اسکالر مانا جاتا ہے۔ اس نے تیلگو زبان میں بھی شاعری کی۔ اردو زبان کو ادب کا درجہ دینے میں اس نے

جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ قلی قطب شاہ کو اردو شاعری کا سب سے پہلا 'صاحب دیوان' شاعر کہا جاتا ہے۔

قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں سلطنت قطب شاہی کا انتہائی عروج تھا۔ امن و امان اور صلح آشتی کا بول بالا تھا۔ ۱۰۰۰ھ میں شہر حیدر آباد کو اپنا پایہ تخت قرار دیا اور اس شہر کو خوبصورت و عالی شان عمارتوں، وسیع بازاروں، سرسبز باغوں اور پانی کی نہروں سے آراستہ کیا۔ اس کے علاوہ اس کے دور حکومت میں مدرسے، خانقاہیں اور مسجدیں بھی کثرت سے قائم ہوئیں۔

سلطان قلی قطب شاہ کے دور حکومت میں ایک طرف جہاں دکنی تمدن اور رسومات کو داخل کرنے کے لئے ایک مخصوص کلچر کی بنیاد رکھی گئی وہیں دکھنی اور تلنگی زبانوں کی ترویج و ترقی کے لئے خود ان زبانوں میں شعر کہے۔ ۳۴ سال کی طویل اور کامیاب حکمرانی کے بعد ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۶۱۱ء کو قلی قطب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر محض ۴۸ سال تھی۔

اگر قطب شاہی دور کے کلام پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زیادہ تر مثنویوں کا رواج تھا اور ان میں فرضی قصے منظوم ہوا کرتے تھے جس میں زیادہ تر فارسی کلام کے ترجمے ہوا کرتے تھے۔ ان مثنویوں میں کردار نگاری، وصف نگاری اور واقعہ نگاری کے بہترین نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مثنویوں میں تسلسل بیان بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

یوں تو قلی قطب شاہ نے مثنویاں، قصیدے، مرثیے، غزل، ترجیع بند اور رباعیات سبھی اصناف سخن پر نہایت کامیاب طبع آزمائی کی ہے لیکن خاص طور پر اس نے مثنویاں متعدد عنوان سے لکھی ہیں۔ کسی میں پھولوں کا ذکر ہے تو کسی میں سبز ترکاریوں کا بیان ہے، کسی میں شکاری پرندوں کا ذکر ہے تو کسی میں رسم و رواج، تیوہاروں اور شاہی محلوں کا بیان ہے۔ عید، نوروز، بسنت، مرگ، موسم برسات وغیرہ پر بیسیوں نظمیں کہی ہیں۔ ان کے یہاں فارسی کے ساتھ ہندی کی آمیزش بھی کافی دیکھنے کو ملتی ہے۔

قلی قطب شاہ کو اردو شعر و ادب میں فطرت پرستی اور منظر نگاری کے بانی کے طور پر ہمیشہ یاد کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں اس سے قبل کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جس نے باقاعدہ منظر نگاری کی طرف توجہ کی ہو۔ قلی قطب شاہ ایک فطرت پرست شاعر تھا۔ اس نے اپنی تشبیب میں فطرت کے جو مناظر پیش کئے ہیں وہ اس کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔

یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ ہر ادب کی ابتدائی شاعری میں صداقت اور اصلیت ملتی ہے۔ لیکن جوں جوں وہ ادب آگے بڑھتا جاتا ہے شعراء اس میں ندرت جدّت اور نازک آفرینی سے کام لینے لگتے ہیں، اسی لئے بعد کے ادب میں تصنّع اور آورد کی جھلک آجاتی ہے۔ قلی قطب شاہ کا تعلق چونکہ اردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہے اس لئے ان کے کلام میں آورد اور تصنع نہیں ہے بلکہ اصلیت اور صداقت موجود ہے۔ اسکی منظر نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک مصوّر کی طرح مناظر قدرت کے نقشے تو اتارتا ہی ہے ساتھ ہی اس میں اپنے جذبات کا رنگ بھی بھر دیتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی فطرت پرستی کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے حیدر آباد میں مختلف باغات لگوائے اور ''باغ محمد شاہی'' پر ایک نظم بھی کہی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

چمن کے پھول کھلتے دیکھ سکیاں کا مکھ یاد آیا
سہاتا تھا محمد پھل نمن ان کا نین سارا
دسے ناسک کلی چنپا بھواں دو پات ہیں تس کے
بھنور تل دیکھ اس جا گا ہو اچیران من سارا
سو خوشے داکھ لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جول
سہے اس داکھ منڈوا سو جیا انبر کہن سارا
اناراں میں سہے دانے سو جیوں یاقوت پتلیاں میں
ہر اک پھل اس اناراں پر سہے سکنے نمن سارا [۶]

اس نظم میں قلی قطب شاہ نے بڑے ہی مصورانہ انداز میں 'باغ محمد شاہی' کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے واضح لفظوں میں چنپا کی کلی، انگور کے خوشے، انار، کھجور، سپاریوں کے خوشے

ناریل کے پھل، جامن کے پھل وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان اشیاء کی منظر کشی ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے ان اشعار میں تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً اس نے چنپا کی کلی کو ناک سے تشبیہ دی ہے بھنورے کو تل کہا ہے، انگور کے خوشے کو ثریا اور سنبلہ سے تشبیہ دیا ہے لیکن ان تشبیہات میں جن چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے وہ سب ان کے مشاہدے کے اندر آتی ہیں اور انہوں نے ان اشیاء کو بذات خود دیکھا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کو ہندوستان کے موسموں سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ وہ برسات کا شیدائی تھا۔ اس نے برسات پر تیرہ نظمیں کہی ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم میں برسات کا حسین منظر پیش کیا ہے ؎

رُت آیا کلیاں کا ہوا راج — ہری ڈال سر پھولاں کے تاج

تن ٹھنڈت لرزت جوبن گرجت — پیا مکھ دیکھت کنچکی کس بکسے آج

ناری مکھ جھمکے جیسے بجلی — انجلی بادک میں سہے اس لاج

کیسی پھول ویسے ستارے آسمان — اس زمانے کی پری پدمنی آئے آج ے

محمد قلی قطب شاہ نے بسنت کے موسم پر بھی نظمیں لکھی ہیں جو اس امر کی شاہد ہیں کہ بسنت کا موسم اسے بے انتہا پسند تھا۔ ڈاکٹر زور اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ”محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ میں اس تقریب کو خاص اہتمام اور شان و شوکت سے جاری کیا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ وہ ہندوستانیت کو پسند کرتا تھا بلکہ اس کی طبیعت عیش و عشرت کی طرف زیادہ مائل تھی اور اس میں اس کے فطری رجحانات اور دل کی امنگیں جس خوبی سے ظاہر ہو سکتی تھیں، شاید ہی کسی اور تقریب میں ہو سکتی ہیں۔“[۸]

اس کے بسنتی قصیدے اس بات کے شاہد ہیں کہ اسے بسنت کا موسم کتنا عزیز تھا۔ اسکے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

بسنت کا پھول کھلیا ہے سو جیوں یاقوت رمّانی
کرو ملکر سہیلیاں سب بسنت کے تائیں مہمانی
بسنت کا رُت بجھایا ہے برہ اگ کوں خوشیاں سیتی
نویلیاں مل کرو مجلس نویلا آج شاہانی 9

محمد قلی قطب شاہ کی منظری شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخیلاتی اور قیاسی نہیں ہے۔اس نے جن مناظر کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے وہ سب اسکے مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔اس لئے اس کی منظر نگاری صداقت اور حقیقت کا مرقع نظر آتی ہے۔

قلی قطب شاہ کے کلام کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی آمیزش بھی کافی پائی جاتی ہے۔مناظر قدرت کی جو عکاسی کی ہے وہ لاجواب ہے۔رسم ورواج،عید،نوروز اور بسنت پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں منظر کشی اور تخیل کی بلندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں زیادہ تر فارسی کے بجائے ہندی کے اسلوبِ بیان کو اختیار کیا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ (۱۶۷۲ء۔۱۶۲۴ء): منظر نگار شاعروں میں عبداللہ قطب شاہ کا نام بھی آتا ہے۔عبداللہ قطب شاہ کے والد سلطان محمد قطب شاہ تھے۔اپنے والد کی وفات (۲۱ جنوری ۱۶۲۶ء) کے بعد عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء) ۱۲ برس کی عمر میں تخت نشیں ہوا۔چونکہ پایہ تخت سنبھالنے کے وقت عبداللہ کی عمر صرف بارہ سال تھی اس لئے ان کی ماں اور محمد قلی کی بیٹی حیات بخشی بیگم نے عبداللہ کے بالغ ہونے تک عملی طور پر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی۔عبداللہ قطب شاہ قطب شاہی عہد کا ساتواں حکمراں تھا۔وہ اپنے نانا قلی قطب شاہ کی طرح شاعری وموسیقی کا قدرداں تھا۔اس نے بھی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔

عبداللہ قطب شاہ نے مناظر قدرت کی تصویر کشی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے لیکن انکی منظر نگاری میں جذبات عشق کا عنصر بھی نمایاں ہے۔اس لحاظ سے اس کی منظر

نگاری قلی قطب شاہ کی منظر نگاری سے ملتی جلتی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے یہاں جذبۂ عشق کی شدّت کے ساتھ ساتھ یہ مصوّرانہ رنگ بھی ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے نیز زبان کی سلاست بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کے یہ اشعار اس بات کی وضاحت کرتے ہیں ؎

بسنت آیا پھلایا پھول لالا　　سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا
چمن میانے پھلا ہے پھول رنگ رنگ　　نپٹ نازک ایکس تھے ایک آلا ۱۰؎

ان اشعار میں عبداللہ قطب شاہ کہتا ہے کہ بسنت کا حسین موسم آگیا ہے اور لالا کے پھول کھل اٹھے ہیں اور یہ موسم اتنا حسین ہے کہ وہ مئے نوشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلع شاعر کی منظر نگاری اور جذبۂ عشق کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ عبداللہ قطب شاہ نے اپنے کلام کے ذریعے اچھے خاصے مصوری کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ وہ بسنت کے موسم کے رنگ برنگے پھولوں کا ذکر ایک مصور کی طرح کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس موسم میں گلابی، زرد، اجلے، ہرے، لال، پیلے اور کالے پھول کھلے ہیں۔ اس کے اس بیان سے ایک گلشن کا تصور ہماری آنکھوں کے سامنے ابھر کر آتا ہے۔

دکنی شاعری کے ابتدائی دور میں نظم گو شعراء کے مقابلے مثنوی گو شعراء کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ ان شعراء کی مثنویوں میں منظر نگاری کے نمونے موجود ہیں۔ اس دور کی بعض مثنویوں میں تو منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے دکھائی دیتے ہیں لیکن کلیم الدین احمد کے مطابق زیادہ تر مثنویاں تخیل پر بھروسہ اور ذاتی مشاہدات کے فقدان کی وجہ سے خام اور ناقص معلوم پڑتی ہیں۔ اس خامی کا ذکر کلیم الدین احمد نے اس طرح کیا ہے:

> ''یہی حال مناظر فطرت کا بھی ہے۔ یہ نہیں کہ فطرت کے مرقعے نہیں ملتے۔ ملتے ضرور ہیں لیکن دیکھی ہوئی چیزوں کا ذکر نہیں ملتا۔ برسات کی رنگینی، دریا کا سکون اور اس کی روانی، ہندوستان کے سربہ فلک کوہ اور آبشار، تاریک خوفناک گھاٹیاں، اس قسم کی چیزوں کی تصویر بالکل نہیں ملتی۔ اگر کہیں ہے بھی تو محض رسمی۔ عموماً باغ کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ لیکن باغ

بھی ایسا جسے فطرت نے نہیں لگایا ہے۔ ہر جگہ تصنّع، تمام بناوٹی، غیر فطری چیزیں دیکھائی پڑتی ہیں۔''[11]

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت کم مثنوی نگاروں نے مناظر قدرت کے جلوے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں لہٰذا ان کی مثنویوں کی منظر نگاری بالکل فرضی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً انھوں نے چین مصر اور عرب کے مناظر کے نقشے کھینچ دیئے جو انھوں نے کبھی دیکھے ہی نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض مناظر قدرت ہر ملک میں تقریباً یکساں ہوتے ہیں مثلاً صبح، شام، رات، آندھی، سمندر، طوفان وغیرہ زیادہ تر ہر ملک میں ایک ہی قسم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس لئے اردو شعراء نے اپنے ملک کے مناظر کی روشنی میں دیگر ممالک کے مناظر کی عکاسی کی بھی کوشش کی ہے۔ ان شعراء کی منظر کشی پر عمومیت کا رنگ غالب آگیا ہے۔ لیکن کچھ شعراء ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے کلام کی بنیاد ذاتی مشاہدے پر رکھی ہے ان کی نظموں میں خالص ہندوستانی مناظر ہی کی عکاسی ہے۔ اور وہ اپنے فن کو فطری انداز میں پیش کرنے میں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

ملا وجہی (۱۵۵۱ء اور ۱۵۵۶ کے مابین۔ ۱۶۵۶ء اور ۱۶۷۱ء کے مابین): قطب شاہی دور میں وجہی کا نام ان قد آور شاعروں میں لیا جاتا ہے جنہیں قدرتی طور پر حسن جمال اور قادرالکلامی کے جوہر عطا ہوئے تھے۔ ملا وجہی گولکنڈہ کا پہلا شاعر ہے جسے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا گیا۔ وجہی کا نام اسد اللہ تھا۔ اس کی پیدائش دکن میں ہوئی۔ وجہی نظم اور نثر دونوں اصناف میں اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل تھا۔ اس کی تقریباً ساری شعری تخلیقات شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں ''سب رس'' اور ''قطب مشتری (۱۰۱۸ھ)'' کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ قطب مشتری میں کل دو ہزار چار سو ایک (۲۴۰۱) اشعار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس قدر طویل مثنوی صرف بارہ دن میں لکھی گئی تھی۔ یہ وجہی کا اعلیٰ اور زندۂ جاوید شعری کارنامہ ہے۔ منظر نگاری کے باب میں بھی وجہی نے اپنی اس اکلوتی مثنوی میں تصنع اور تکلف سے کام نہیں لیا ہے بلکہ موافق الفطرت واقعات کو منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی میں تشبیہوں اور استعاروں کے

ذریعے منظر کشی کی گئی ہے۔ وجہی کو شاہی تقرب بھی حاصل تھا۔ اس نے لمبی عمر پائی اور اسے قطب شاہی دور کے چار بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' کا مرکزی کردار محمد قلی قطب شاہ ہے۔

ملا وجہی کی ادبی زندگی کو جاوید وشسشٹ نے اپنی کتاب ''ملا وجہی'' میں تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ا۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۲ء) کے زمانے میں وجہی نے ایک شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی۔
>
> ۲۔ محمد قطب شاہ (۱۶۱۲ء تا ۱۶۲۶ء) کے عہد میں وہ گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔
>
> ۳۔ عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء) کے عہد میں وہ پھر چمکا اور 'سب رس' لکھ کر وہ زندۂ جاوید بن گیا۔'' [۱۲]

ملا وجہی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک طویل عمر پائی۔ عمر کے آخری دور میں بھی اس نے شعر گوئی اور نثر نویسی سے دست کشی نہیں کی کیونکہ قدرت کی طرف سے اسے ایک حساس ذہن، بیدار دل اور خلاقانہ صلاحیتیں حاصل تھیں۔

ملا وجہی کی مثنویوں میں منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اپنی مثنوی ''قطب مشتری'' میں جگہ جگہ منظر کشی کی ہے۔ مثلاً مجلس طرب، شہزادے کا خواب، بلند گڑھ، بکٹ کوٹ، اژدہا، راکشس وغیرہ کی تصویر کشی بڑے ہی دلفریب انداز میں کی ہے۔ عام ڈگر سے ہٹ کر وجہی نے اپنی اس مثنوی میں مافوق الفطرت عناصر کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ موافق الفطرت واقعات کو بھی منظوم کیا ہے۔ انکی مثنویوں میں مناظر فطرت کی تصویر کشی نہایت کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ ملّا وجہی نے باغ کا نقشہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں کھینچا ہے

یکا یک دسیا ایک نزدیک باغ　　ہوا اس کے باساں تے تر سب دماغ
کہ پاتاں کے پرویاں کون سب پھاڑ　　کر پھلاں جھانکتے تھے سراں کاڑ کر

بنفشہ مشک پائی تھی بال میں سرو رقص کرتے تھے آحال میں
سو رنگ سانولے خوب باتاں بھرے ندیم ہو کے بلبل جو چالے کرے
سو طاؤس پنکھی طوطی کبک و ہنس پکڑ پیٹ لڑنے لگے ہنس ہنس
بھنور چھونڈ ہو بن میں گھُمتے اتھے سو پھولاں کرے موکھ چُمتے اتھے [۱۳]

ملاوجہی نے باغ کا نقشہ نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح باغ میں پھول پتّوں کے پردے پھاڑ کر جھانکتے ہیں۔ بنفشہ مشک کی طرح مہک رہا ہے اور باغ میں بلبل، طاؤس، طوطی، کبک اور ہنس موجود ہیں۔ بھونروں کا جھنڈ منڈ لا کر پھولوں کا منہ چوم رہا ہے۔

باغ کی اس تصویر کشی کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''ملاوجہی'' نے باغ کا نقشہ نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے۔'' [۱۴]

اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ منظر نگاری میں دکنی شاعر کس قدر حقیقت پسند تھے۔ ''قطب مشتری'' میں ایک جگہ ایک طوفان زدہ بزرگ کی زبان سے دریائی طوفان کی مختصر سی داستان یوں بیان کی گئی ہے ؎

یکا یک فضا آسمانی ہوا بلا یک کشتی طوفانی ہوا
کہ پھٹ جہاز سب لوگ واں ڈپ کے گئے یکیلے ہی ییک تختے پہ رہے [۱۵]

''قطب مشتری'' میں شاہی دور کی رسومات، طرز زندگی، اخلاقی نظریات کے ساتھ ساتھ مناظر قدرت وفطرت کے بھی شاندار نقوش ملتے ہیں۔ ملاوجہی نے اس میں جانوروں، بت خانوں اور مظاہر کائنات کو اشعار کے سانچے میں بڑی خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔ وجہی نے اس میں سماجی حالات، تاریخی واقعات اور کہیں کہیں مافوق الفطرت حرکات کو بھی رنگین لفظوں اور ذاتی قوت مشاہدہ کے ذریعے محاکاتی اور منظریہ روپ دے دیا ہے۔ ان مافوق الفطرت عناصر کی عکاسی انہوں نے اپنے زمانے کے عام تصور کے مطابق کی ہے۔ مثلاً اژدہا آگ اگلتا ہے، سانس لیتا ہے تو چنگاریاں اور دھواں نکلتا ہے ایک سنسان علاقے میں ایک

اونچے غار میں رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں مشعل کی طرح جلتی رہتی ہیں اور کوئی ذی حیات اس کے قریب نہیں جا سکتا لیکن ان اوصاف کے باوجود تلوار کے ایک وار میں دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ راکشس کا ذکر ہے۔ اس کے تین سر، چار ہاتھ، بڑے بڑے دانت اور بالوں کی جگہ سانپ ہیں۔ ہر صبح نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ بدافعال، بدکردار اور کمینہ خصلت ہے لیکن آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کر دینے سے قریب نہیں آتا اور تلوار کے ایک وار میں بیس کوس پر جا کر اس کا سر گرتا ہے۔ اس طرح کی بے شمار مافوق الفطرت بیانات کے باوجود منظر نگاری کے معاملے میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

غواصی (پیدائش اور وفات کا پتہ نہیں): غواصؔی کا شمار قطب شاہی عہد کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے زمانے میں اسے شاہی تقرب حاصل ہوا اور شاہی سفیر کی حیثیت سے اسے بیجاپور روانہ کیا گیا نیز اس کی شاعری کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی دو مثنویاں بہت مشہور ہوئیں۔ پہلی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' جس کی تصنیف (۱۶۲۴ء) ۱۰۳۵ھ میں ہوئی۔ دوسری مثنوی ''طوطی نامہ'' جو ضیاء الدین بخشی کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے' (۱۶۴۸ء) ۱۰۴۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ غواصؔی کی تیسری مثنوی ''چندا اور لورک'' جس کا دوسرا نام ''مینا اور ستونتی'' ہے' بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کچھ غزلیں اور رباعیات بھی کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ غواصی کے سنہ پیدائش اور انتقال کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا ہے۔ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۰۶۰ھ کے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قادر محی الدین زورؔ ''اردو شہ پارے'' میں رقمطراز ہیں کہ غواصؔی قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور عمر میں وجہؔی سے چھوٹا تھا۔

غواصؔی کے کلام کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اک کہنہ مشق اور بڑا ہی پر گو شاعر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری میں اپنے آپ کو بلند مرتبہ خیال کرتا تھا اور کسی کو اپنا مد مقابل نہیں گردانتا تھا۔ اس کی قادر الکلامی اور پر گوئی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی

ہے کہ اس نے اپنی مثنوی ''سیف الملوک بدیع الجمال'' کے دو ہزار اشعار صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں لکھ ڈالے۔

دکنی ادب کے تمام نقادوں نے غواصیؔ کی شاعرانہ عظمت اور اس کی جمالیاتی حس کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کی تینوں مثنویوں کے تمام ابواب کے ابتدائی یا آخری حصوں میں قدرتی مناظر کا ذکر ملتا ہے۔

غواصیؔ کی اس مثنوی کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے فطرت کی ساری مسرتوں اور اس کے حسن کو اپنے ذہن اور دل کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ ان مشاہدات کو اپنی نظموں میں لفظی لباس پہنا کر ان کے اصلی خد و خال کو پیش کرتا ہے۔ اس لئے غواصیؔ نے ''سیف الملوک بدیع الجمال'' میں مناظر فطرت کے صحیح صحیح نقشے پیش کئے ہیں۔ محمد علی آثر اپنے تحقیقی مقالے ''غواصی شخصیت اور فن'' میں لکھتے ہیں:

> ''غواصی دبستان گولکنڈہ کا شاید پہلا شاعر ہے جس نے منظر نگاری کی جانب با قاعدہ توجہ کی ہے۔''[١٦]

غواصیؔ نے اپنی مثنوی میں سراپا نگاری میں جو کمال دکھایا ہے وہ اس کی قادر الکلامی کی زندہ مثال ہے۔ اپنے کلام میں جنوں' بھوتوں' پریوں اور ڈائنوں کے جو سراپے بیان کئے ہیں وہ ایک ڈراؤنا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کلام تصنع سے پاک ہے نیز اس وقت کے رواج کے مطابق جا بجا ہندی کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔

غواصیؔ نے اپنی مثنوی میں اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ دل کی مسرتوں کو فطرت کے توسط سے بیان کیا جائے۔ سیف الملوک اور شہزادی بدیع الجمال کی شادی ہوتی ہے تو دربار اور شہر کے گلی کوچوں میں شادیانے بجتے ہیں۔ مسرت کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں۔ اس مسرت کے ماحول سے ایسا منظر بن جاتا ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ فطرت بھی اس جشن شادی میں شریک ہے۔ انسانوں کی خوشی میں فطرت کی اس شرکت کو غواصیؔ نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

کھڑی مشتری ناز کا ساز کر　　سورج جگمگاتا سو اسمان پر

مشاطہ ہوا زہرا تر آئی بیگ　　چمک نور کالے کو جھجکائی بیگ ۱۸

غواصی نے اپنی مثنویوں میں فطرت نگاری کے حوالے سے حسین مناظر کو جابجا پیش کیا ہے۔ ''سیف الملوک بدیع الجمال'' (۱۰۲۵ھ) میں کئی مقامات پر سمندر کا منظر پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ اس میں ''ایک یادگار رات'' کے عنوان کے تحت رات کا خوبصورت منظر پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے ۔

عجب رات نرمل تھی اس دن کی رات　　جھمکتے تھے نوراں میں مکھ وہات وہات
نکل آئیکر چاند تاراں سیتے　　جھمکتا اتھا جگمگاریاں سیتے
نچھل چندیا سب میں پڑتا اتھا　　سو جیوں دودھ کیر اور دریا اتھا
خوشی ایسی نچھل چندنی دیکھ رات　　لے ساعدکوں سیف الملوک اپ سنگات ۱۸

غواصی کے ''طوطی نامہ'' (۱۰۴۹ء) میں بھی مناظر فطرت کی عکاسی ہے۔ڈاکٹر سلام سندیلوی اس مثنوی کے تعلق سے لکھتے ہیں ''غواصی نے ''طوطی نامہ'' (۱۰۴۹ء) میں بھی مناظر فطرت کی عکاسی کی ہے اس نے اپنی بعض حکایتوں کو غروب آفتاب کی منظر کشی سے شروع کیا ہے۔'' مندرجہ ذیل اشعار سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے

جگا جوت سورج اتم ذات کا　　جو کر سیر سب دن سمٰوات کا
ڈبیا جا کے مغرب کے ظلمات میں　　لگے دپنے جوں دیوے رات میں ۱۹

غواصی نے ایک جگہ باغ کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے ۔

کہیں رائی چنپا ، کہیں سیونتی　　کہیں موگرہ ہور کہیں رینوتی
کہیں یاسمن ہور مدن بان کہیں　　کہیں تاج سنج ہور ریحان کہیں
کہیں لا ہور کہیں رنگیلے گلال　　کہیں پھول صد برگ کے بے مثال
کہیں تختے انگور کے بے بدل　　کہیں انجیر و انار شیریں نچھل
کہیں سیب ہور کہیں اناس خوب　　کیتک جنس کے میوے خوش باس خوب ۲۰

مندرجہ بالا اشعار میں باغ کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ کسی بھی طرح قیاسی و فرضی نہیں معلوم پڑتی ہے۔اس میں انہیں پھلوں کا ذکر کیا گیا ہے جو عام طور پر ہندوستان کے باغوں

میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غواصی نے اپنی مثنویوں میں اگر مافوق الفطرت عناصر کو جا بجا پیش کیا ہے وہیں فطرت کی من وعن منظر کشی کی بھی مختلف مثالیں دیکھنے کوملتی ہیں۔

غواصی کے کلام کو دیکھ کراس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کا بڑا شاعر تھا بلکہ اردو زبان کے صف اوّل کے شعراء میں اس کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

ابن نشاطی: محمد اظہر الدین ابن نشاطی قطب شاہی عہد کا ایک بلند پایہ مثنوی نگار شاعر ہے۔اس نے ۱۶۵۵ء میں ''پھول بن'' کے نام سے ایک دلچسپ مثنوی لکھی۔ادبی نقطۂ نظر سے یہ مثنوی دبستان دکن کی اہم مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔وجہی اور غواصی اور مثنویوں کے بعد ابن نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' دبستان بیجاپور کی سب سے اہم مثنوی مانی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں منظر نگاری کے نمونے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

دکن کی دوسری قابل قدر مثنویوں کی طرح ابن نشاطی کی ''پھول بن'' بھی منظر نگاری کے حسین وجمیل نقوش سے آراستہ ہے۔ابن نشاطی نے اس داستان کو لفظی و معنوی اور صنائع و بدائع کے ذریعہ پھولبن کو نہایت ہی فنکارانہ چابکدستی سے سجایا ہے۔نصیر الدین ہاشمی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''مناظر قدرت اور مختلف واقعات کے جو منظر پیش کیے ہیں اور رزم بزم کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ ابن نشاطی کی قادرالکلامی کے شاہد ہیں۔''[۲۱]

ابن نشاطی نے باغوں کی منظر کشی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ایک جگہ باغ کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ سارا موسم بہارِ مجسّم ہو جاتا ہے

دیا سو فیض پھر جگ کوں دو چنداں ۔۔۔ ہوئے پھولاں شگفتے ہو ر خنداں
جو تھے غنچے کے طفلاں نین کھولے ۔۔۔ بندے پھل ڈال کے مرغاں ہنڈولے
اٹھیا تھا پھول کا سب ٹھار مہکار ۔۔۔ کھلے تھے پھول جھاڑوں پر ہر اک ٹھار
کلی ہور پھول مل دستے تھے اس دھات ۔۔۔ کہ جوں چھپ کو کوئی کرتے اہے بات[۲۲]

ابن نشاطی نے ایک جگہ ایسی کالی رات کا نقشہ کھینچا ہے کہ نجومی تک اس رات کی ماہیت نہ جان سکے۔ ابن نشاطی نے ''پھول بن'' (۱۰۶۶ھ) میں فطرت کے مختلف مناظر پیش کیے ہیں۔ اس کی مثنویوں میں بعض جگہ موسم بہار کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر موسم بہار کے ایک منظر کو اس طرح پیش کیا ہے:

نکل کر مہر ماہی کے شکم تے ‫ ‫ ہوا یکدن نمن مغروق غم تے
دیا سو فیض جگ کو دو چنداں ‫ ‫ ہوئے پھولاں شگفتے ہور خنداں
اٹھیا تھا پھول کا سب ٹھار مہکار ‫ ‫ کھلے تھے پھول جھاڑوں پر ہر اک ٹھار
دئے یوں پھول میں لالے کے کالے ‫ ‫ چراجیوں لعل کے پیالے میں گھالے
پڑے دکھ بلبلاں آنے کے ہولاں ‫ ‫ بنے شبنم کے موتی گل کے پھولاں
کرے سو بلبلاں سن نغمہ سنجی ل ‫ ‫ گیاں سب کو بلاں گانے کرنجی ۲۳

درج بالا اشعار میں شاعر نے بہار کے موسم کی منظر کشی کی ہے۔ یہ بہار کنچن پٹن کی بہار معلوم ہوتی ہے جو کہ مشرق کا کوئی شہر ہے کیونکہ اس میں پھولوں میں لالہ اور پرندوں میں بلبل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس پھول اور پرندے کا تعلق مشرق سے ہے۔

(فٹ نوٹ۔ اس میں بہار کا جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ بالکل فرضی اور قیاسی معلوم پڑتا ہے کیونکہ مشرق کے اس شہر کو ابن نشاطی نے کبھی دیکھا نہیں ہوگا اور محض قیاس کی بنیاد پر اور اپنے تخیل کی بناء پر ایک باغ کی تصویر کھینچی ہے۔ اس میں خصوصی پھولوں اور پرندوں کا کوئی ذکر بھی نہیں ملتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس منظر کشی کا تعلق ذاتی مشاہدے سے نہیں ہے۔) ۲۴

ابن نشاطی نے اپنی مثنوی میں شاہ مصر اور شاہ ہند کی لڑائی کا بھی ذکر کیا ہے۔ شاہ ہند مغلوب ہونے کے بعد کہتا ہے کہ اس کے پاس ایک ایسی مچھلی ہے کہ اسے پانی میں ڈال دیا جائے تو خود بخود تیرتی ہے۔ ابن نشاطی نے اس طلسمی واقعہ کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

خزینے میں مرے ہے ٹیک مچھلی ‫ ‫ نہ مچھلی کوئی اس کے سم کوئی آوے سچلی
طلسم اس پر لکھے ہیں خوب اولتی ‫ ‫ سٹے پانی میں تو آ پیچ چلتی
حقیقت قصر کا جتاں کہتے سو ‫ ‫ لکھا لاتی اہے پانی منے سوں ۲۵

یہ ابن نشاطی کی منظر کشی کا کمال ہے کہ ان اشعار کو پڑھنے کے بعد واقعی ایک تیرتی ہوئی مچھلی کا منظر نظر کے سامنے آنے لگتا ہے۔

محمد نصرت نصرتی (۱۶۰۰ء۔۱۶۸۳ء): نصرتی قلی قطب شاہ کے بعد عادل شاہی عہد کا سب سے بڑا شاعر گزرا ہے۔ وہ علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اس کے آباو اجداد بیجا پور کے فوج سے وابستہ تھے۔ خود نصرتی سلطان علی عادل شاہ شاہی کے بچپن کا ساتھی تھا اسی لئے ملک الشعراء ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کے کام کاج میں بھی اس کو غیر معمولی دخل حاصل تھا۔ وہ شاہی کے رزم و بزم دونوں کا ساتھی تھا۔

نصرتی کی تخلیقات کا سرمایہ تین مثنویوں ''گلشن عشق''، ''علی نامہ'' اور'' تاریخ سکندری'' نیز غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے۔ اس کی مثنوی ''گلشن عشق'' میں منظر نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ اس مثنوی کی منظر نگاری کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے کیونکہ اس میں نصرتی نے ہندوستانی کردار کنور منوہر اور مدمالتی کے عشق کا قصہ نظم کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ صبح کی منظر کشی نہایت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔

صبا مشرق کے پال کے پل تے تھوک	نکالیا جو کنچن کی جب تم نے کوک
ابلتا نکل نور کا نیر تب	ہوا ریز عالم میں چوندھیر سب
تہی تھا سو یو جگ کا حوض غدیر	بھریا شش جہت سر تے کنچن کا نیر
سیاہی کو چھاتی نے دھویا فلک	زر افشاں کسوت تے پکڑیا جھلک
کواراں کھلے خلق کی نین کے	دھرے سد جو مخمور تھے رین کے [۲۶]

مندرجہ بالا اشعار کو دیکھ کر اس بات کا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ نصرتی کی منظر نگاری واضح اور روشن ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے بھی دیگر شعراء کی طرح تشبیہات کا استعمال کیا ہے جیسے اس نے اس میں دنیا کو حوض غدیر کا نام دیا ہے اور سورج کی روشنی کو سونے کے پانی سے تشبیہ دی ہے۔ یہ شاعر کی نازک خیالی کا بہترین نمونہ ہے اور اس سے نصرتی نے اپنی

منظر نگاری میں جو حسن پیدا کیا ہے وہ بے مثال ہے۔

انہوں نے اپنی مثنوی ''گلشن عشق'' میں ایک جگہ سردی کے موسم اور اس سے پڑنے والے اثرات کو نہایت واضح لفظوں میں بیان کیا ہے۔ کنور منوہر اپنی محبوبہ مد مالتی کو تلاش کرتے کرتے ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں سردی بہت زیادہ ہے۔ نصرتی اس موقعے پر سردی کی کیفیت کو کچھ اس انداز میں بیان کرتا ہے۔

سٹے یوں زمیں پر ہوا برف رچ — کیے ہیں مگر فرش بلّور گچ

ادک دے کی سردی کا آزار ہو — نہالاں اتھے ٹھنڈ سوں بیمار ہو

اتھا نزع میں جیو ہر اک پات کا — کلیاں میں نہ تھا خندہ خوش دھات کا

نہ سکتی تے ہو کونپلی سر فراز — نہ ٹک ہو سکے بیل کا ہت دراز

چھپیاں سو کلیاں اوڑھ ٹوپن لحاف — ہوا تھا سو اس پر لی سنج کا غلاف

اڑے تو پنکھی تس کدھن پر جھٹک — پڑے برف سوں پر ہو گولا اٹک [27]

ان اشعار میں نصرتی نے سردی کے موسم اور اس سے مرتب ہونے والے اثرات کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس میں انہوں نے تشبیہات اور استعارات کا استعمال تو کیا ہے لیکن ابہام کی دھند سے پاک ہے جس سے سردی کی اصل تصویر صاف اور روشن دکھائی دیتی ہے۔ اس میں نصرتی کا کہنا ہے کہ ہوا نے زمین پر برف کے ڈھیر اس طرح برسائے ہیں گویا وہ بلّور اور گچ کا فرش بن گئی ہو۔ یہ برف کی سفیدی کو واضح کرنے کی بہترین تشبیہ کا نمونہ ہے۔ آگے وہ کہتا ہے کہ سردی کی شدت کی وجہ سے سارے درخت بیمار پڑ گئے اور کونپلوں میں اتنا دم نہ تھا کہ سر اٹھا سکیں۔ کلیوں کے پتوں میں چھپنے کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ کلیوں نے ٹوپ اور لحاف اوڑھ لئے۔ اس میں نصرتی نے محاکات اور تخیل سے تو کام لیا ہے لیکن اس میں مبالغہ کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہے۔

اسی طرح نصرتی نے بعض جگہ گرمی کے موسم اور آفتاب کی تمازت کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

جوانی سوں تھی دھوپ بر روت میں — سورج تھا مگر آخر جوت میں

نہ کہ سور بل اگ کا بادل ا تھا — نہ وہ دھوپ یک آتشیں جل اتھا
مگر کھینچ دوزخ کے دریا تے نیر — برستا اتھا جگ پہ چلتا چ تھیر
کرن ہیں سو جل کیاں دھاریاں سیں — ہر اک ذرّہ قطرات باراں دسیں
زمیں تے فلک لگ سب اک دھات سوں — بھرے سرد آتش کی برسات سوں ۲۸

مندرجہ بالا اشعار میں نصرتی نے گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے۔ اس کی مصوری کی کامیابی کی یہی دلیل ہے کہ ہر شعر سے گرمی کی شدت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس میں اس نے سورج کو آگ کا بادل اور دھوپ کو آگ کا پانی کہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شاید دوزخ کے دریا سے کھولتا ہوا پانی کھینچ آیا تھا جو جو متواتر اس دنیا پر برس رہا تھا۔ گرمی کی شدت کو بیان کرنے کی اس سے بہتر مثال شاید نہیں مل سکتی۔ دکنی شعراء میں موسم کی شدت کو بیان کرنے کے معاملے میں نصرتی کے یہ اشعار اردو شاعری میں نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''گلشن عشق'' میں نصرتی نے اس باغ کی منظر کشی کی ہے جس کی مالکن چنپاوتی نام کی عورت ہے۔ اس باغ میں اس مثنوی کا ہیرو کنور منوہر جاتا ہے اور باغ کے حسن و رعنائی سے بے انتہا متاثر ہوتا ہے۔ اس باغ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا گیا ہے۔

فرح بخش یک سبز تر باغ تھا — فلک کوں ہر اک پھول جس داغ تھا
سٹیں عکس سو تس منور چمن — ستارے بھر یا ہو ہر یا یو گگن
بنفشہ دھری لالہ لعل بتاں — سرنگ گال جیسے گل ارغواں
چندر گل تے چندر کی چھاتی پہ داغ — سو گل سور تے سور کا زور باغ
گل اور نگ کا تختہ یوں روت کا — کہ جیوں پاچ میں کام یاقوت کا
نگہ رکھ نہالاں اتھے کاچ کے — نہ چمناں کے تختے اکھنڈ پاچ کے ۲۹

ان اشعار میں شاعر نے بنفشہ‘ لالہ‘ گل ارغوان‘ گل چاندنی‘ سورج مکھی اور گل اورنگ کا ذکر کیا ہے۔ مگر ان پھولوں کو تشبیہ و استعارہ کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ لالہ کو لب معشوق سے تعبیر کیا ہے اور گل ارغواں کو محبوب کا رخسار کہا ہے۔ اس طرح وہ اپنی مصوری کو تشبیہات کے ذریعے حسین بناتا ہے۔

نصرتی نے باغ کی منظر کشی میں پھولوں کے علاوہ مختلف پرندوں اور اس کے رنگ روپ کا بھی ذکر بخوبی کیا ہے۔

پیتمبر بندھی زرد پیلک نے گھول پٹیاں گھونٹ گھونٹ اوڑھے دھنور شال کھول
سلونی خوش الحان کو یل سیاہ کرے سیام کسوت اوک خوش نگاہ
ٹٹورے انگے پانومہندی سوں سب کرے پان طوطی نے کھا لال لب
کوّا چور گشتی کمل تازہ اوڑ کرے گشت انکاراں کو نہ جائے چھوڑ ۳۰

ان اشعار میں پرندوں کے رنگ روپ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نصرتی کا کہنا ہے کہ پیلک نے زرد ریشم کے کپڑے پہنے اور کنگھی کر کے شال اوڑھی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ پیلک زرد رنگ کا پرندہ ہے۔ اسی طرح کوئل کے بارے میں کہتا ہے کہ کالی، سلونی اور خوشحال کوئل نے سیاہ دلفریب لباس پہن رکھا ہے۔ یعنی اس میں کوئل کے کالے رنگ کا ذکر ہے۔ ٹیٹری نے پاؤں میں مہندی لگا رکھی ہے اور طوطی نے پان کھا کر لب رنگین کئے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ٹیٹری کے پاؤں سرخ اور طوطی کی چونچ لال ہوتی ہے۔ اسی طرح کوا کے کالے رنگ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ چور کوّا کالا کمبل اوڑھ کر دیواروں کے ارد گرد گشت لگا رہا ہے۔ یوں تو نصرتی سے قبل بھی مختلف دکنی شعرا نے باغ کی منظر کشی کی ہے لیکن نصرتی کی طرح کسی نے مختلف پرندوں کے رنگ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

نصرتی کے جدّت کی ایک اور مثال یہ ہے کہ اس نے پرندوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ اس کے یہ رنگ کہاں سے آئے۔ اس سلسلے میں وہ کہتا ہے۔

پنکھیرو پہ سٹنے کون رنگ صبح گاہ کیتے گل کے کانسے بھریا رنگ ماہ
لے لالہ کے کانے کسنبھا بھرے سرنگ اپنی سرخاب چولی کرے
لی شب گوش نے سندل اور ارگجا لیاں کبک و قمریاں نے کسوت بجا ۳۱

یہاں شاعر کہتا ہے کہ صبح ہوتے ہی پرندوں پر رنگ پھینکنے کے لئے چاند نے شب کے وقت بیشمار پھولوں کے کانسے بھر دیے۔ چنانچہ لالے کے کانسے لے کر اس میں کسنبھا بھرا

اوراس سے سرخاب نے اپنی چولی سرخ رنگی۔ شب گوش نے صندل اور ارگجا لیا۔ اس سے کبک اور قمری نے اپنا لباس بھگویا۔

پرندوں کا اتنا تفصیلی بیان نیز یہ ندرت، جدت اور خوبصورت انداز بیان نصرتی کے علاوہ کسی دکنی شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا کہنا ہے:

''اس بیان میں نصرتیؔ نے بیسیوں ایسے پرندوں کے نام لکھے ہیں جن کی شناخت میں بڑی مشکل پڑتی ہے۔۔۔۔ بہر حال مصوّرانہ شاعری میں نصرتیؔ بے مثل ہیں'' ۳۲؎

نصرتی کی مثنویاں تو منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں ہی ساتھ ہی اس نے اپنے قصیدوں میں بھی منظر نگاری کی شان کو اچھی طرح برتا ہے۔ اس کا ایک مختصر قصیدہ 'فصل زمستاں کی تعریف میں' ملتا ہے۔ سعدی کے قصیدوں کی طرح نصرتیؔ نے بھی اپنے زور قلم سے بہار کے موسم کو اپنے قصیدے میں سمیٹ لیا ہے۔ فصل موسم کی تصویر کشی میں الفاظ کا حسب حال انتخاب، تراکیب کی شان وشوکت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ منظر نگاری میں مقامی رنگ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

شبنم جو اجلا چھاچھ سا آشیر سے جل میں پڑیا
ہر بائیں ہوئی ہیں دھیں ٹھنڈی جم نیر سب یکبار آج

دوسری جگہ جاڑے کے موسم کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ہر رکھ کوں بار امارتے پیلے ہوئے ہیں پات
سب ہر یک نگر کے باغ جہاں ہے ٹھنڈ سوں بیمار آج
نا سر فرازی پا سکے دولت تے ٹھنڈ کی کونپلی
نا بیل اپنی گود تے لنبا کرے ہت بہار آج ۳۳؎

مندرجہ بالا اشعار میں کہا گیا ہے کہ ٹھنڈ کی شدت کی وجہ سے سارا باغ بیمار ہو گیا ہے اور سبھی بیل بوٹے جاڑے کی شدت کی وجہ سے سکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ جاڑے کی شدت کو اس

سے زیادہ خوبی کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ولی گجراتی (۱۶۶۷ء۔۱۷۴۱ء): مثنوی نگار شعراء میں ولی گجراتی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔انہوں نے بھی منظر نگاری کی طرف کافی توجہ دی۔اس کا نمونہ منظر نگاری سے بھرپور ان کی مثنوی ''در تعریف شہر سورت'' میں ملتا ہے۔اس مثنوی میں سمندر اور دریائے تاپتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے ؎

سرج سن آپ اسکی جگ میں کانپا	سمندر موجزن رگ رگ میں کانپا
کنارے اس کے اک دریائے تپتی	کہ دنیا دیکھنے کو اس کے پٹتی
کیا سب تن خجالت سو بہ جیوں غرق	ہوا دریا اپس کے عرق میں غرق
شہریوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ	دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر	ہوا دیتی ہے اس کی یاد کشمیر [۳۴]

ولی گجراتی نے پہلے شعر میں سمندر پر سورج کی کرنوں کا ارتعاش دکھایا ہے۔ چونکہ ولی خود اپنی آنکھوں سے سمندر کا منظر دیکھا ہے اس لئے ان کی منظر کشی میں فطری انداز برقرار ہے۔اگر موازنہ کیا جائے تو ولی کی منظر نگاری غواصی کی منظر نگاری سے بہتر ہے کیونکہ غواصی نے مصر کے جس سمندر کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے۔ محض قیاس کی بنیاد پر سمندر کا نقشہ کھینچا ہے جبکہ ولی نے سورت کے سمندر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لئے ولی کی یہ منظر کشی صداقت اور اصلیت سے لبریز ہے۔

ولی کی اس مثنوی کی تعریف ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

> ''کہنے کو تو یہ شعر (پہلا شعر) سورج کی تعریف میں ہے لیکن جس نے سمندر کی وسیع سطح پر سورج کی بیتاب کرنوں کے تڑپنے اور لہروں کو جگمگا دینے کا منظر دیکھا ہے۔اس کی نظریں یقیناً ایک بار اس لامحدود فضا سے ہم کنار ہوتی ہوں گی جس کی محاکات سے بڑے بڑے مصوّر عاجز ہیں۔

ولی نے اس کی محاکات ہی نہیں کی بلکہ سمندر کی ہر رگ میں اسکا ارتعاش
پیدا کر کے عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔"۳۵

سراج اورنگ آبادی (۱۱۲۷ھ تا ۱۱۷۷ھ): سراج اورنگ آبادی کی مثنوی ''بوستان خیال'' میں بھی مناظر فطرت کی تصویریں ملتی ہیں۔ اس میں ایک جگہ سراج نے ایک باغ کا نقشہ کھینچا ہے۔

رواں آب کی ہر طرف آبشار	جدھر دیکھئے ہو رہی تھی بہار
طرب بخش تھا ناچنا مور کا	تماشہ تھا ہر مور کے شور کا
ہر اک سرو پر عشق پیچے کی بیل	خوشی کے گلے تھی گویا جمیل
جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں	خم زلف لیلٰے کے افسوں تھیں ۳۶

حقیقت میں سراج نے باغ کی تصویر کشی اتنے واضح انداز میں کی ہے کہ باغ کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچ جاتا ہے۔ اس لئے سراج اورنگ آبادی کی اس منظر نگاری کو ہم کامیاب منظر نگاری کہہ سکتے ہیں۔

ابتدائی دور کے منظر نگار شعراء میں جہاں دکنی شعراء کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے وہیں شمالی ہند کے شعراء کو بھی نظر انداز کر کے ہم ابتدائی دور کی منظری شاعری پر مکمل طور پر روشنی نہیں ڈال سکتے۔

اردو شاعری کے دکنی دور کے حوالے سے اگر اس دور کی منظری شاعری کا عمومی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتدائی دور میں شعرا حضرات نے زیادہ تر مثنویوں پر طبع آزمائی کی ہے۔

❁ ❁ ❁

شمالی ہند کے شعرا

فائزؔ دہلوی: نواب صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی اورنگ زیب کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے اپنا کلیات ۱۱۲۷ھ میں مرتب کیا اور پھر ۱۱۴۲ھ میں اس پر نظر ثانی کی۔ دیوان فائز میں چودہ مختصر مثنویاں ہیں جن میں اردو مثنویوں کے اشعار ۵۰۳ بتائے گئے ہیں۔ کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند (ص۔۲۷۱) میں ان کی چھ اردو مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔

فائز کی مثنویوں میں جتنے بھی رقعات ہیں وہ سب محبوب کو لکھے گئے ہیں۔ مناجات اور منقبت کے علاوہ باقی سب مثنویاں عاشقانہ ہیں۔ یہ نظمیں اپنے تجربات اور مشاہدات کا بیان ہیں اس لئے ان میں مبالغہ یا تخیل پرستی نہیں ہے۔ زبان سادہ اور شیریں ہے جس سے فطرت پرستی کا رنگ عیاں ہے۔ ان کے کلام میں مقامی رنگ غالب ہے۔

شمالی ہند کے ابتدائی شعراء میں فائزؔ دہلوی کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ولیؔ کے ہم عصر تھے۔ پروفیسر محمد مسعود حسن رضوی ادیب کے مطابق یہ شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ فائز نے اپنی مثنویوں میں سیدھے سادے اور شیریں انداز میں اپنے تجربات و مشاہدات کا بیان کیا ہے۔ ان میں مبالغہ آرائی یا تخیل پرستی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ فائزؔ عاشق مزاج اور حسن پرست شاعر تھے اس لئے ان کی مثنویوں میں حسن اور مشاہدۂ حسن کا بیان جا بجا ملتا ہے لیکن یہ بیان بالکل مطابق فطرت ہے نیز مقامی رنگ کی بھی بہتات ہے۔

فائزؔ نے اپنی نظموں میں باقاعدہ مناظر فطرت کا بیان تو نہیں کیا ہے لیکن انکی ایک نظم ''تعریف ہولی'' ہے۔ اس نظم میں فائزؔ نے بسنت کے موسم میں رنگ رلیوں کا ذکر کیا ہے جو کہ کسی باغ میں منائی جا رہی ہے۔ اس تعلق سے اس میں بسنت چمن اور پھول وغیرہ کا ذکر ملتا ہے جس کو پڑھنے سے فطرت کی ایک جھلک تو سامنے آ ہی جاتی ہے۔

آج ہے روز بسنت ائے دوستاں سرو قد ہیں بوستاں کے درمیاں
سب کے تن میں ہے لباس کیسری کرتے ہیں صد برگ سوں سب ہمسری
خوبرو سب بن رہے ہیں لال، زرد باغ کا بازار ہے اس وقت سرد
چاند جیسا ہے شفق بھیتر عیاں چہرہ سب کا از گلال آتش فشاں
ہر چھبیلی از لباس کیسری تازہ کرتی ہے بہار جعفری ۳۷

ان اشعار کو پڑھنے سے ایک باغ کا منظر نظر کے سامنے کھنچ جاتا ہے جس میں بسنت، بوستاں، صد برگ و جعفری، چاند، شفق، آتش فشاں وغیرہ کیا ستعمال سے فائز نے مناظر فطرت سے اپنی دلچسپی ظاہر کی ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ء۔۱۷۸۱ء): شمالی ہند کے مشہور اور مستند شعراء میں سودا کا نام قابل توجہ ہے۔ شاعری کا خداداد ملکہ تھا۔ انہوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن زیادہ تر قصائد اور طنزیہ و ہجویہ مضامین میں ہی انہیں شہرت حاصل ہوئی۔

سوداؔ کی شاعری میں بھی مناظر فطرت کے نقشے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت میں سودا کا شمار شمالی ہند کے پہلے مثنوی گو شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے موسم گرما پر با قاعدہ مثنوی لکھی۔ اس میں خالص منظر نگاری کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن پوری مثنوی تخیلی معلوم پڑتی ہے اور اس میں حد درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ ان کی مثنوی 'موسم گرما' کے اشعار درج ذیل ہیں۔

گرم ہے یہ بہار کا موسم شاخ گل پھلجھڑی سے ہے نہیں کم
غنچے کھلتے ہیں یوں ہو آتش بار گویا پھٹتا ہے داغنے میں انار
نہیں گیندوں کے یہ چمن میں درخت دی ہے آتش ستاروں کی یک لخت
کرو صد برگ و جعفری پہ نظر چھٹ رہی ہیں ہوائیاں منھ پر
طائروں تک ہے یہ ہوا کا اثر پر قمری ہے مشت خاکستر

سرو کا حال کیا کروں میں بیاں پاؤں اسکا ہے اور آب رواں
ہے حرارت گلوں کو اب یاں تک نہیں شبنم ' یہ نکلی ہے چیچک
گیا تالاب میں ہر ایک کنول کنول کاغذی کی طرح سے جل ۳۸

ان اشعار میں سودا نے گرمی کی شدّت کا بیان کیا ہے کہ کس طرح سے گرمی میں طائر' جانور' پھول' پیڑ اور پودے پریشان حال رہتے ہیں۔ گرچہ اس میں سودا نے کافی حد تک مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا ہے جسکی وجہ سے مناظر فطرت کی تصویریں کچھ دھندلی ہو گئی ہیں۔ اس کے باوجود سودا کی موسم گرما کی یہ مثنوی اردو شاعری میں بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں ان کے ذاتی مشاہدے کی بھی کافی حد تک شمولیت ہے۔ اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صنائع اور بدائع کے استعمال کے باوجود اس منظر نگاری سے صداقت کی شعائیں پھوٹ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد یوں رقمطراز ہیں:

''سودا موسم سرما اور موسم گرما کا بیان پر زور طریقے سے کرتے ہیں۔ مبالغہ اور معنی آفرینی پر ان دونوں نظموں میں کافی توجہ کی گئی ہے لیکن ظاہری تصنّع ذاتی مشاہدہ کو چھپا نہیں سکتا۔'' ۳۹

سودا نے اپنی مثنویوں میں موسم گرما و موسم سرما کے علاوہ موسم بہار کی منظر نگاری بھی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ انکی ایک مثنوی ''در فصل موسم بہار'' ہے جس میں انھوں نے باغ کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کے بھی چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

تماشا ہے عجب گلشن میں موجود چراغاں صبح سے تا شام دود
یہ مستی کو گھٹا کی ٹک نظر کر یہ آتی ہے پڑی دوش ہوا پر
کھلے داؤدی کے غنچے چمن میں تو کف لائے ہیں مستی سے دہن میں
قبا گل پھاڑتی ہے ہو کے سرشار رہی ہے لپٹی یاں سوسن کی دستار
جھکا دیتا نہیں بار ثمر شاخ نشے سے جھوم جھوم آئے ہے ہر شاخ
پڑا ہے جس روش پہ عکس گلزار بچھی ہے اس جگہ قالین خوش کار ۴۰

ان اشعار میں بہار کے موسم میں باغ کی مستی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں پر تھوڑی

مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے لیکن صداقت کی جھلک بھی عیاں ہے۔

میر تقی میر (۱۷۲۴۔۱۸۱۰): شمالی ہند کے منظر نگار شعراء میں میر تقی میر کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر عبارت بریلوی کلّیات میر میں یوں رقمطراز ہیں:

> میر نے دو صید نامے کہے ہیں جو ۵۴۹ اشعار پر مشتمل ہیں۔ ان صید ناموں کے درمیان ۱۷ غزلیں بھی موجود ہیں جن میں ۱۴۶ اشعار ہیں۔ اس طرح سے میر نے ۶۹۵ صید یہ اشعار کہے ہیں۔[۴۱]

نیچر یا فطرت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جو نظر آنے والی دنیا پر مشتمل ہے، جو ہمارے چاروں سمت پھیلی ہوئی پہاڑوں، سمندروں اور آسمانوں کی دنیا کہلاتی ہے اور دوسری وہ جو ہم میں سے ہر ایک کے دل کی ایک مخصوص خانگی دنیا سے وابستہ ہوتی ہے۔ گرچہ میر تقی میر کی شاعرانہ قوتوں کی حقیقی جولانگاہ دوسری قسم کی فطرت تھی لیکن کائناتی فطرت کی بھی انھوں نے جو تصویریں پیش کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ انکے اس سلسلے کے کلام کو دیکھ کر اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ میر خارجی فطرت کے اظہار میں بھی قادر الکلام تھے۔ نیز ان کے کلام کو دیکھ کر اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جن اشیاء اور واقعات کی منظر کشی کی ہے اس کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ دو مرغوں کی لڑائی کا منظر پیش کرتے ہیں تو ایسی ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو نفسیات کی رو سے بھی پوری اترتی ہیں۔ ایک جگہ مرغ کی لڑائی کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے ؎

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے، یہ پھڑ کنے لگے — ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے — ان کی صد رنگ بد زبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے — تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے[۴۲]

مندرجہ بالا اشعار میں بڑے ہی خوبصورت اور فطری انداز میں مرغوں کا لڑنا اور ان کے مالکوں اور طرفداروں کا ان کی ہمدردی کے اظہار میں آپے سے باہر ہو کر عجیب عجیب حرکتیں کرنے کا نقشہ کھینچا ہے۔

مرغوں کی لڑائی کے علاوہ کتوں کے ہنگامے کا ذکر بھی میر صاحب نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ میؔر نے اپنی ایک مثنوی میں ذکر کیا ہے کہ وہ کسی گاؤں میں جاتے ہیں تو کتے انہیں بہت پریشان کرتے ہیں۔ میؔر نے اس کا عمدہ مرقعہ اس انداز میں پیش کیا ہے

کتوں کے چاروں اور رستے تھے   کتے ہی واں' کہے تو بستے تھے
دو کہیں ہیں کھڑے' کہیں بیٹھے   چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے
ایک نے پھورے باسن' ایکو نے   کھود مارے گھروں کے سب کونے
گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے   روٹی ٹکرے کی بو پہ گرنے لگے[۴۳]

اس میں میر تقی میر نے کتے کے حرکات وسکنات کو اور اس کے ذریعے بپا کی گئی ہنگامہ آرائی کو بڑی فنکارانہ چابکدستی وعین فطری انداز میں پیش کیا ہے جو ان کے فن کا خاصہ ہے۔

اگر ہم میؔر کے صید ناموں پر گہری نگاہ ڈالیں تو ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ میؔر نے پہاڑوں' جنگلوں' جھیلوں اور نالوں کے اصلی مناظر پیش کئے ہیں۔ انہوں نے ان مناظر کی تصویر کشی نہایت صداقت کے ساتھ کی ہے۔ صید نامہ اوّل میں جنگل کی سیر کے تعلق سے جو اشعار کہے ہیں ان میں چند درج ذیل ہیں ۔

تو آگے بیابان پر خار ہے   کہیں جھاڑ بوٹا کہیں غار ہے
بیابان وحشت اثر پرُخطر   یہی ڈر ہے' رکھیا ادھر کیا اُدھر
جہاں تک نظر جائے سوکھی ہے کانس   اگر سبزہ بھی تھا تو تھوہڑ کا بانس[۴۴]

ان اشعار میں ''سوکھی کانس'' اور ''تھوہڑ بانس'' کا ذکر شاعر کی صداقت کے غماز ہیں کیونکہ کوئی شاعر بنا دیکھے اپنی نظم میں ان کا ذکر نہیں کر سکتا۔

میؔر نے ایک مثنوی میں برسات میں اپنے گھر کی تباہ کن حالت کا نقشہ بڑے ہی مؤثر

انداز میں کھینچا ہے۔ یہ نظم میرؔ کے حقیقت شعارانہ انداز، مشاہدے کی گہرائی اور فنکارانہ قوتوں کی غماز ہے۔ اس مثنوی کا انداز بیاں جہاں مناسب اور موزوں ہے وہیں تشبیہوں کی مدد سے برسات کے موسم میں گھر کی تباہی اور عبرتناکی کا نقشہ اتنے پراثر انداز میں کھینچا گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ اسی بناء پر پروفیسر سرورؔ نے لکھا ہے:

> ''میرؔ نے برسات کی گھر کی تباہی پر جو مثنویاں لکھی ہیں، وہ جزیات نگاری اور منظر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔'' ؎۴۵

میرؔ نے برسات میں گھر کی تباہی کا حال کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے ؎

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق — سو شکستہ تر از دل عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک — کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے — کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا — شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں ؎۴۶

اسی مثنوی میں میرؔ نے کھٹمل کے غضب ڈھانے کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ اس میں ان کی فسردہ طبیعت کی کارفرمائی بھی ہے اور ذاتی تجربے کی غمازی بھی۔

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا — پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں — ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیے پر، گہ بچھونے پر — کبھو چادر کے کونے کونے پر
سلسلا یا جو پائنتی کے اور — وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور
تو شک ان رگڑوں میں سب پھاٹی — ایڑیاں یوں، رگڑتے ہی کاٹی ؎۴۷

میرؔ کی ایک نظم جو برسات سے متعلق ہے میرؔ کے نظم پاروں کے سلسلے میں کافی توجہ کی مستحق ہے۔ اسے میرؔ کی منظر نگاری کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ نظم پڑھ کر ان کے

مشاہدے کی تازگی اور باریکی کا احساس ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اس میں ایک داخلی ترنم بھی رچا ہوا محسوس ہوتا ہے۔چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

رت ہے برسات کی بہت پیاری　　موجزن جھیلیں ندیاں ساری
کھیت دھانوں کے لہلہے　　شاداب کر رہے ہیں نظر کی دلداری
کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے　　سبز مخمل سے ہے سوزا پیاری
ہر طرف کھل رہے ہیں گل بوٹے　　جن سے شرمندہ باغ کی کیاری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں　　روح پر ہوتی ہے خوشی طاری
سوندی سوندی ممین کی مٹّی　　بھینی بھینی چمن کی بو پیاری
کوکلہ ' بگلہ ' کوئلیں ' طاؤس　　اپنی تانیں سناتے ہیں پیاری
شفق سرخ رنگ لائی ہے　　لالہ گوں ہے سپہر زنگاری۴۸

میر کی مثنوی ''مذمت برشگال'' برسات کے صحیح مناظر کو پیش کرتی ہے۔کچھ بند ملاحظہ کیجیے۔

بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال　　چرخ گویا ہے آب در غربال
وہی یکساں اندھیرے برسے ہے　　آسماں چشم وا کو ترسے ہے
ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں　　تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں
ابر رحمت ہے یا کہ زحمت ہے　　ایک عالم غریق رحمت ہے۴۹

میر کی مثنویوں کے بارے میں اظہر علی فاروقی ''اردو مرثیہ'' میں اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''میر نے برسات اور اس کی وجہ سے ان کے مکان کی جو درگت ہوئی اس کی تصویریں جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کی ہیں۔اس واقعیت اور حقیقت کا ایک کرشمہ بھی مرثیوں کے قدرتی مناظر میں نہیں پایا جاتا۔''۵۰

سیّد انشا اللہ خاں انشا (۱۷۵۶ء۔۱۸۱۶ء): انشا اللہ خاں انشا کا نام اردو شعر و ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ انشا نے شاعری شروع کی تو غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مسدس، مخمس اور رباعی غرض مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی اور اسے اعلیٰ درجے تک پہنچایا۔ ان کے کلام میں ان کی ذہانت اور بذلہ سنجی کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ مذاق کا ایسا پہلو تلاش کر لیتے ہیں کہ ہنستے ہنستے قاری کے پیٹ میں بل پڑ جائے۔ اردو کے علاوہ فارسی، عربی، ترکی، پوربی، پشتو اور مارواڑی زبان بے تکان بولتے اور لکھتے تھے۔ ان زبانوں میں اشعار بھی کہے اور اپنی زبان دانی کا سکّہ جمایا۔

انشا اللہ خاں انشا نے بھی مناظر فطرت کی طرف توجہ دی ہے۔ لیکن انشاء کے یہاں باقاعدہ منظر نگاری کی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ انھوں نے جنگل، پہاڑ یا دریا کے مناظر کی تصویر کشی نہیں کی ہے بلکہ فطرت کے کچھ افراد کے عادات و خصائل پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً انہوں نے ''زنبور''، ''کھٹمل''، ''فیل'' وغیرہ کے عادات اور خصائل پر روشنی ڈالی ہے۔ انشاء نے ان جانداروں کا مطالعہ نہایت گہرائی کے ساتھ کیا ہے اور اسے اپنی مثنویوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً انشا نے کھٹمل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

کچھ یہ کھٹمل بڑھے ہیں اب اس سال | کہ ہوئی ہے سب زمین لالوں لال
چھا گئے ہیں جو سارے یہ بد بخت | شاخ مرجاں بنے تمام درخت [۵۱]

انشاء نے ان اشعار میں کھٹملوں کی سرخی کو نہایت واضح اور حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں انہوں نے تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے جس سے تصویر دھندلی نہیں ہوتی بلکہ اور اجاگر ہو جاتی ہے۔

اسی طرح انشاء نے مچھر اور مکھیوں پر بھی نظمیں کہی ہیں اور انکی فطرت کی تصویر کشی بہت ہی مصوّرانہ انداز میں کی ہے۔

انہوں نے ''ہاتھی کی شادی'' اور ''مرغ کی لڑائی'' نام کی دو مثنویاں بھی لکھی ہیں جو ان کی فطرت پرستی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

میر حسن (۱۷۲۷ء۔۱۷۸۶ء): میر حسن (۴۲۔۱۱۴۱ھ تا ۱۲۰۵ھ) غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے۔ میر اور سودا کے معاصرین مثنوی نگار شعراء میں میر حسن کا نام بھی اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے پرانی دلّی کے محلّہ سید واڑہ میں معاشی بدحالی اور سیاسی انتشار کے ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ پورے شہر میں قتل وغارت گری، خوف و ہراس اور مایوسی کا دور دورہ تھا۔ لوگ ملک کے مختلف حصوں میں عزت بچانے اور سر چھپانے پر مجبور تھے۔ لہٰذا میر حسنؔ بھی اس آشوب زمانہ کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دلّی سے ہجرت کر کے فیض آباد میں مقیم ہو گئے۔ تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں کے مطابق اس وقت ان کی عمر بارہ سال تھی۔

میر حسن نے یوں تو رموز العارفین، گلزار ارم، خوان نعمت وغیرہ کئی مثنویاں نیز قصیدے اور غزلیں بھی لکھیں لیکن مثنوی سحر البیاں کی وجہ سے انہیں شہرت جاودانی حاصل ہوئی۔ شعرائے اردو کا انہوں نے ایک عمدہ تذکرہ بھی لکھا تھا لیکن مثنوی سحر البیان کی شہرت اور مقبولیت کے آگے ان کے دوسرے سبھی کارنامے پیچھے رہ گئے۔

میر حسن کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جن کے کلام میں منظر نگاری کے نمونے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کل گیارہ مثنویاں ہیں جن میں تین ''رموز العارفین''، ''گلزار ارم'' اور ''سحر البیان'' طویل ہیں اور باقی سب مختصر مثنویاں ہیں۔ مثنوی سحر البیان ان کی آخری اور بہترین مثنوی ہے۔ اسے جتنی مرتبہ پڑھا جائے ہر بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا غیر معمولی فنکار ہے۔ میر حسنؔ نے اپنی اس مثنوی میں مناظر فطرت کی عکّاسی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر حسنؔ نے بلا کسی تصنع اور آورد کے مناظر فطرت کی تصویریں کھینچی ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی منظر نگاری تخیلی اور قیاسی ہے کیونکہ اس مثنوی کا پلاٹ بالکل فرضی ہے۔ داستان کے آغاز میں ہی کہا گیا ہے:

''کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ کوئی شہر متعین ہے اور نہ کوئی بادشاہ۔ یعنی دونوں فرضی اور قیاسی ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسی مثنوی جس کا پلاٹ ہی فرضی

ہو اس کے مناظر بھی فرضی ہونگے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ میر حسنؔ نے اپنی اس مثنوی میں شہر یا باغ کے جو مناظر پیش کیئے ہیں وہ دراصل ہندوستان ہی کے مناظر ہیں کیونکہ ہندوستان کے مناظر کو ہی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی اپنی کتاب ''اردو شاعری میں منظر نگاری'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ میرؔ حسن نے فرضی شہر کے جو مناظر پیش کیئے ہیں وہ دراصل ہندوستان ہی کے مناظر ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ہندوستان کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے ملک کے مناظر فرضی شہر پر چسپاں کردیئے ہیں۔''۵۲

ڈاکٹر سلام سندیلوی کی مندرجہ بالا رائے کے پیش نظر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ انہوں نے فرضی شہر پر ہندوستان کے مناظر چسپاں کردیئے ہیں۔ مثال کے طور پر میر حسنؔ نے اس مثنوی میں باغ کا ایک منظر کھینچا ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن — کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جدا اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
کھڑے سرو کی طرح چمپے کے جھاڑ — کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
پڑی آب جو ہر طرف کو بہے — کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منھ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر — نشہ کا سا عالم گلستان پر ۵۳

مندرجہ بالا اشعار میں میر حسن نے جن پھولوں اور پرندوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ہندوستان سے ہی ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ میر حسنؔ نے اپنی منظر نگاری میں ہندوستان کے مناظر کا ہی نقشہ کھینچا ہے۔

اپنی مثنوی میں میرؔ حسن نے ایک جگہ ایسے باغ کا ذکر کیا ہے جس میں پھول ایرانی طرز کے ہیں لیکن اس میں ایرانی پھولوں کے ساتھ ساتھ چمپا' موتیا' موگرا' گیندا وغیرہ کا ذکر بھی

ہے جو خالص ہندوستانی پھول ہیں۔

کلیم الدین احمد کا اس سلسلے میں اپنی مایہ ناز تخلیق ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ باغ مصنوعی ہے، لیکن اس میں کہیں کہیں یقیناً منظر نگاری کے لطیف نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔'' ۵۴ے

اس مثنوی میں ایک جگہ سہ پہر کے منظر کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے ؂

گھڑی چار دن باقی اس وقت تھا سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ پہ دھوپ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
وہ لالے کا عالم ہزارے کا رنگ وہ آنکھوں کے ڈورے نشے کی ترنگ
گلابی سے ہو جانا دیوار و در درختوں سے آنا شفق کا نظر
وہ چادر کا چھٹنا وہ پانی کا زور ہر اک جانور کا درختوں پہ شور ۵۵ے

اسی طرح ایک جگہ رات کی خنک چاندنی کا ذکر اس پیرائے میں کیا گیا ہے ؂

وہ چھٹکی ہوئی جابجا چاندنی وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور وہ مہ کا ظہور لگا شام سے صبح تک وقت نور
وہ سنسان جنگل وہ نور و قمر وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایے سے مہ کا ظہور گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور ۵۶ے

مندرجہ بالا اشعار منظر نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ انہیں پڑھ کر چمکتی ریت' دمکتے ہوئے پتے اور ہلکا ہلکا منور میدان نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''قابل توجہ یہ امر ہے کہ ان اشعار میں نہ تشبیہ و استعارہ کا زور ہے نہ مبالغہ ہے' نہ حسن تعلیل ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ بیان کامیاب ہے۔ ورنہ

بعد کی مثنویوں میں ایسی منظر نگاری کی کمی نہیں جہاں سارے فاضلانہ حربے استعمال کیے گئے ہیں لیکن الفاظ اپنے مقصد میں ''قابل ناکام رہتے ہیں۔'' ۵۷

میر حسنؔ کی مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

''میر حسنؔ نے منظر کی مصوری اور جزبات کی نقاشی میں کمال دیکھایا ہے لیکن داستان ان کی طبع زاد تھی۔ جس جگہ جیسی ضرورت ہوئی قصہ کو توڑ مروڑ لیا۔'' ۵۸

قائمؔ چاند پوری (و: ۱۷۹۳ء): قصبہ چاند پور بجنور میں پیدا ہوئے۔ درد اور سودا سے مشورہ کلام لیا۔ قصیدوں میں سودا کا رنگ اور غزلوں میں درد کا رنگ ہے۔ اردو کے بلند پایہ شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

قائم چاند پوری نے بھی فطرت سے کافی دلچسپی لی ہے۔ انکی منظر نگاری کی مثال ان کے کلّیات میں ملتی ہے۔ انہوں نے ایک مثنوی موسم سرما پر کہی ہے۔ یہ ان کے قلمی نسخے سے ماخوذ ہے۔ اس کے کچھ بند درج ذیل ہیں ؎

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید　　صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے　　سبزہَ و شال کی رضائی ہے
تیغ سے کاٹتا ہے اب وہ چند　　آب میں اس قدر ہوئی ہے گزند ۵۹

انہوں نے اس مثنوی میں موسم سرما کی کیفیات کو نہایت صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے گرچہ کہیں کہیں مبالغہ آرائی بھی موجود ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس میں تشبیہات، استعارات اور حُسن تعلیل سے اس میں بہت سی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔

میر ببر علی انیسؔ (۱۸۰۱ء۔۱۸۷۴ء): میر انیس میر خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے تھے۔ محلّہ گلاب باڑی فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار اپنے دور کے کامیاب شعرا میں

ہوتا ہے۔ یوں تو انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر انھیں مرثیہ گوئی کے لئے یاد کیا جاتا ہے۔ میر انیس کلام کا مجموعہ نول کشور پریس سے پانچ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے مجموعے کلام میں تقریباً ساڑھے پانچ سو رباعیاں ہیں۔

گرچہ بین مرثیہ کا لازمی جز مانا جاتا ہے۔ مگر انیس کے یہاں بین کا عنصر کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ واقعہ نگری' منظر نگاری اور جذبات نگاری زیادہ ہے۔ میر انیس نے اپنے مرثیے میں کہیں صبح کی رونق اور دل آویزی کو بیان فرماتے ہیں تو کہیں شام کا سناٹا، کہیں رات کی تاریکی تو کہیں بہار کا جوش اور سبزے کا نمو، تو پھر کہیں گرمی کی شدت اور لوؤں کے جھونکے دکھائی دیتے ہیں۔

یوں تو مرثیہ میں مناظر قدرت کی تصویریں شروع شروع میں میر ضمیؔر نے پیش کی ہیں لیکن میرؔ انیس نے ان تصویروں میں کچھ اس طرح سے رنگ بھر کے دل آویزی پیدا کر دی کے وہ خود گویا اس کے موجد قرار پا گئے۔ جس کا اردو زبان میں کہیں اور جواب ملنا مشکل ہے۔

میرؔ انیس کے یہاں صبح اور شام دوپہر اور رات کے مناظر کے لاتعداد مرقعے ہیں لیکن ان کی مرقع کشی مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اسے پیش منظر بنا کر ان سے واقعات کے اثر کو بڑھانے کا کام لیا گیا ہے۔ ان مناظر کو ہر جگہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر ایک مشہور مرثیہ کی ابتداء میں صبح کا بیان قابل غور ہے ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ لالہ زار صبح
گلزار شب خزاں ہوئی آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح
سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

آخری بند کچھ اس طرح ہے ؎

اوج زمیں سے پست تھا چرخ زبر جدی
کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمرّ دی
ہر خشک و تر پہ تھا کرم بحر سرمدی
بے آب تھے مگر دُر دریائے احمدی
روکے ہوئی تھی نہر کو امت رسول کی
سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتولؑ کی ۶۰ے

یہاں منظر نگاری کے پردے میں میر انیس نے مرثیت کا گوشہ نکال لیا ہے۔ ایسی خوبصورت صبح تھی لیکن اس صبح کی تازگی اور نمی میں رسولؐ کی کھیتی سوکھ رہی تھی۔ صبح کے منظر کو پیش کرنے میں انیس نے یہی مقصد پوشیدہ رکھا ہے کہ وہ فطری منظر نگاری کے ذریعے بیان غم کو دو بالا کر سکیں۔

انیس کے مرثیوں میں منظر نگاری کوئی رسمی چیز نہیں اور نہ وہ ظاہری آرائش کے لئے ہے۔ اس منظر نگاری کا کربلا کی عظیم الشان قربانی سے ایک گہرا رشتہ ہے۔ فطرت کو انیسؔ نے حسّاس بنا دیا ہے۔ چنانچہ ایک بند میں فطرت کا غم اور اضطراب واقعات کربلا پر اس طرح ظاہر ہوتا ہے

تھا بس کہ روز قتل شہ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب
روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی ۶۱ے

ایک اور مقام پر انیسؔ نے فطرت کے غم اور اضطراب کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ وہ پیاسوں کو پانی پلانا چاہتی ہے۔ یہاں بھی صبح کا بیان قابل دید ہے ؎

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

دراصل منظر کشی کے یہی معنی ہیں کہ جس چیز کا بیان ہمارے سامنے کیا جائے وہ اپنی اصلی صورت میں ہماری نظروں میں پھرنے لگے۔ خواہ وہ صبح کا سہانا منظر ہو، یا رات کی ہولناکی، جنگل کا لہلہاتا سبزہ یا پہاڑوں کی تپش کا عالم، اوس کے قطروں کی آب وتاب یا کربلا کی ریت کے ذرّوں کی لپک، غرض جو بھی چیزیں بیان ہوں وہ اپنے اصلی رنگ روپ میں آنکھوں کے سامنے آجائیں اور سچّی منظر نگاری کی یہ تصویر انیسؔ کے کلام میں ہو بہو ملتی ہے اوران کی اس خوبی کا اقرار سخت سے سخت نقاد بھی کرنے پر مجبور ہے۔

انیسؔ کی منظر نگاری کے سلسلے میں علی سردار جعفریؔ کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

"سب سے پہلے مجھے انیسؔ کی شاعری کے جن حصّوں نے متاثر کیا وہ صبح کی منظر کشی سے متعلق تھے اوراس کی وجہ میرا ذوق آوارگی تھا۔ میں ترائی کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بہت گھوما ہوں اور میں نے ترائی کے میدانوں سے ہی صبح کو طلوع ہوتے ہوئے اور آسمانوں پر تاروں کو بجھتے ہوئے دیکھا تو ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ انیسؔ کے یہاں یہ منظر نگاری تخیلی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔"[۶۲]

میرزا دبیر (۱۸۰۳ء۔۱۸۷۵ء): مرزا دبیر اپنے دور کے مشہور مرثیہ نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ دبیر نے شاعری کی ابتدا ۱۸۱۵ء میں کی۔ ان کی شاعری کا زمانہ ساٹھ سال پر محیط ہے۔ لیکن انہوں نے پہلا مرثیہ کب اور کون سا کہا یہ قطعیت سے کہنا مشکل ہے۔

منظر نگاری جدید مرثیے کا ایک خاص جز ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرثیہ نگاروں کا اصل مقصد منظر نگاری کبھی نہیں رہا ہے اور نہ وہ کسی منظر کی مرقع کشی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مرثیوں میں ان تمام مناظر کی عکاسی ہو سکتی تھی جو فطرت نے زمین و آسمان کے درمیان پھیلا دیے ہیں۔ جبکہ مرثیوں میں طلوع سحر، گرمی کی حدّت اور رات کی تاریکی جیسے گنے چنے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ اس تجدید کی وجہ یہ ہے کہ مرثیہ نگاروں نے اپنے موضوع کی مناسبت سے فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔

دبیر نے اپنے مرثیوں میں فطرت کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی منظر نگاری ضمنی مانی جاتی ہے کیونکہ اصل میں ان کو واقعات کربلا پیش کرنا ہوتا ہے۔ مرثیے میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لئے انہوں نے مناظر فطرت کا بیان کیا ہے۔ مثلاً وہ ایک مرثیے کے ابتدائی اشعار میں صبح کا ذکر کرتے ہیں اور واقعات کربلا کے تاثر کو بڑھانے کے لئے صبح کو بھی غمگین بنا دیتے ہیں۔ انھوں نے میر انیس کی طرح صبح کو حسین اور دلکش نہیں دکھایا ہے۔

شعوری طور پر منظر نگاری جدید مرثیے کا 'چہرہ' ہے۔ دبیر کے یہاں منظر نگاری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے منظر زیادہ تر تخیل کی پیداوار ہیں۔ دبیر نے بڑے عجیب و غریب استعاروں، تشبیہوں اور تمثیلوں سے کام لیا ہے اور اپنے طلسم خیال سے قاری کو مسحور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

نکلا افق سے عابد روشن ضمیر صبح
محراب آسماں ہوئی جلوہ پذیر صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلاّئے صبح
پھر سجدہ گاہ میں گیا مہر منیر صبح

کرتے تھے سب غروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

یوسف غریق چاہ سیہ ناگہاں ہوا
یعنی غروب ماہ تجلی نشاں ہوا

یونس دہان ماہی شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوع نیّر مشرق ستاں ہوا
فرعون حق سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب
تھی صبح یا فلک کا وہ حبیب دریدہ تھا
یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ صبح کا اشک چکیدہ تھا
یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہیے نہ مہر صبح کے سینے پہ داغ تھا
امید اہل بیت کا گھر بے چراغ تھا ۶۳ے

مندرجہ بالا بند کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے منظر نگاری کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے اور یہ مقاصد ہیں تخیلات اور مضامین کا زور دکھانا۔ ان بندوں سے شاعر کی اپنی علمیت اور اس کے لفظی آہنگ کا تو پتہ چلتا ہے لیکن صبح کے منظر کی تصویر بہت دھندلی دکھائی دیتی ہے۔ شاعر نے طلوع سحر کے اس منظر پر اپنے خیالات کا عکس ڈال کر منظر کی فطرت اور اس کی آفاقیت کو اتنا محدود اور مصنوعی بنا دیا ہے کہ وہ ایک مخصوص سحر ہو کر رہ گئی ہے جو صرف خیمۂ اہل بیت میں طلوع ہو رہی ہے۔

مرزا دبیر اپنے مرثیوں کی منظر کشی میں مشکل اور ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی منظر کشی کی صحیح تصویر نہیں اترتی۔ انہوں نے مشاہدے سے زیادہ تخیل سے کام لیا ہے۔ فطری مناظر کی عکاسی کے لئے وہ کبھی کبھی قرآن کی آیات سے بھی مدد لیتے ہیں۔ ان کا مندرجہ ذیل بند ملاحظہ ہو جس میں صبح کی مصوّری کی گئی ہے ؎

جب ختم کیا سورۂ والیل قمر نے
اور سبحۂ انجم کو لگا ہاتھ سے دھرنے

آغاز کیا آئیہ والشمّس سحر نے
اور رو کے کہا فاطمہ خستہ جگر نے
پوشیدہ ہوا روئے قمر چرخ بریں میں
چھپ جائے گا اب چاند ہمارا بھی زمیں میں
مہتاب تو پھر چرخ پہ آئے گا دوبارا
چھپ کر نہ کبھی نکلے گا پھر چاند ہمارا
بھر جائے گا تاروں سے فلک رات کو سارا
پھر ڈوب کے چمکے گا نہ زہرہؑ کا ستارہ
سورج بھی یہاں چرخ پہ تا شام رہے گا
خورشید مرا چار گھڑی دن سے چھپے گا۶۴؎

مرزا دبیر نے بطور پس منظر مناظر کی عکاسی کی ہے۔ چاند کے غروب ہونے کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اب امامت کا چاند بھی غروب ہونے والا ہے۔ اس طرح اس میں فطرت کو انسان سے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن دبیر فطرت کی صحیح تصویر اتارنے میں ناکام رہے ہیں۔

دبیر کے مرثیے کے سے متعلق ایس اے صدیقی نے اپنی کتاب 'دبیر کی مرثیہ نگاری' میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''دبیر کو منظر نگاری کے موضوع سے کچھ خاص ربط نہ تھا یہ تو صرف اس ایک روایت کی پیروی تھی جس کے واسطے سے انہوں نے لکھنوی مذاق شعر کی داد دی ہے۔''۶۵؎

لیکن اتنی بات ضرور تسلیم کی جانی چاہیئے کہ دبیر نے اس مذاق شعری کو پھر بھی اچھی طرح نبھایا ہیا ور اپنے مراثی کے پس منظر کی تشکیل کے لئے مناظر فطرت کا استعمال اچھی طرح کیا ہے۔

مندرجہ بالا صفحات میں ابتدائی دور کے دکن اور شمالی ہند کے ان شعراء کے کلام کا تذکرہ

کیا گیا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں مناظر فطرت وقدرت پر بھی طبع آزمائی کی۔ دکن کے شعراء نے زیادہ تر مناظر فطرت کو واضح اور صاف لفظوں میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے منظر کو بیان کرنے میں بیجا مبالغہ آرائی تصنع اور تکلّف سے پرہیز کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ان ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر منظر نگاری کی ہے' جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ' ملاّ وجہی' نصرتی وغیرہ ایسے شعراء ہیں جن کی شاعری میں ہندوستانی مناظر فطرت کا عکس نمایاں ہے۔ کچھ شعراء ایسے بھی ہیں جنھوں نے تخیل سے کام لیکر دیگر مما لک کے منظر کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اس کے باوجود دکنی شعراء کے یہ کلام منظری شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شمالی ہند کے شعراء نے بھی منظر نگاری کو بڑے ہی مصوّرانہ انداز میں پیش کیا ہے لیکن انہوں نے منظر کی تصویر کشی فطری انداز میں کرنے میں دکنی شعرا کے مقابلے زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی۔ شمالی ہند کے شعراء نے اپنی منظر نگاری میں دیگر مما لک کا خیالی اور تصّوراتی نقشہ کھینچا ہے اور اپنی تخلیقی اور فنّی صلاحیتوں اور تجربوں کا استعمال کر کے صداقت کا رنگ دے دیا ہے۔ شمالی ہند کی مثنویوں کی ایک اور خاص بات زبان وبیان کی صفائی' سلاست اور روانی ہے جو اس دور کی دکنی مثنویوں میں بتدریج کم پائی جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت دکن میں اردو زبان اپنے ابتدائی مراحل طئے کر رہی تھی لیکن شمالی ہند میں زبان و بیان کو سنوارنے اور نکھارنے کی با قاعدہ تحریک پہلے سے جاری تھی۔ شمالی ہند کی ابتدائی دور کی مثنویوں کے خاص موضوعات سراپا نگاری' منظر نگاری اور جذبات نگاری تھے۔ اس طرح اس دور کے کلام میں ایک عالمگیر منظر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

❀ ❀ ❀

حواشی

۱۔ دکنی شاعری: تحقیق و تنقید، مصنف، محمد علی اثر، ص ۱۴
۲۔ ادبی تحقیق، جمیل جالبی (فٹ نوٹ)، ص ۱۲۰
۳۔ دکن کی مثنویوں میں منظر نگاری، ملنسار اطہر ایم اے، ص ۳۳
۴۔ ایضاً، ص ۵۰
۵۔ دکنی شاعری: تحقیق و تنقید، ڈاکٹر محمد علی اثر، ص ۲۵-۲۶
۶۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر زور، ص ۱۵-۱۶
۷۔ ایضاً (مقدمہ)، ص ۲۱۶
۸۔ ایضاً (مقدمہ)، ص ۲۰۷-۲۰۸
۹۔ ایضاً (مقدمہ)، ص ۲۰۷-۲۰۸
۱۰۔ دیوان عبداللہ قطب شاہ، مرتبہ سیّد محمد ایم اے، ص ۳۱
۱۱۔ اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ اوّل، کلیم الدین احمد، ص
۱۲۔ نام کتاب ملّا وجہی، مصنّف جاوید وششٹ، ص ۲۴
۱۳۔ قطب مشتری، ملّا وجہی، ص ۵۹-۶۰
۱۴۔ اردو شاعری میں منظر نگاری، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ۱۹۶۸ (اوّل)، ص ۲۷۷
۱۵۔ دکن کی مثنویوں میں منظر نگاری، ملنسار اطہر ایم اے، ص ۹۵
۱۶۔ ایضاً ص ۷۵
۱۷۔ ایضاً ص ۷۸
۱۸۔ سیف الملوک بدیع الجمال، غواصی، مرتبہ میر سعادت علی رضوی، ص ۳۴
۱۹۔ طوطی نامہ، غواصی، مرتبہ میر سعادت علی رضوی، ص ۱۱۱
۲۰۔ سیف الملوک بدیع الجمال، غواصی، مرتبہ میر سعادت علی رضوی، ۱۴۷
۲۱۔ دکن کی مثنویوں میں منظر نگاری، ملنسار اطہر ایم اے، ص ۸۲-۸۳
۲۲۔ ایضاً، ص ۸۶
۲۳۔ پھول بن، ابن نشاطی، مرتبہ عبدالقادر سروری، ص ۳۸-۳۹

۲۴۔ اردو شاعری میں منظر نگاری، سلام سندیلوی، ص ۲۸۱
۲۵۔ دکن کی مثنویوں میں منظر نگاری، ملنسار اطہر ایم اے، ص ۸۷
۲۶۔ گلشن عشق نصرتی، مرتبہ سیّد محمد ایم اے ۸۰-۸۱
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۴
۲۸۔ ایضاً، ص ۱۴۹
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۸۵-۸۶
۳۰۔ ایضاً، ص ۱۸۷-۸۸
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۸۸-۸۹
۳۲۔ نصرتی، مولفہ مولوی عبدالحق، ۵۸-۵۹
۳۳۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، محمود الٰہی، ص ۱۴۸-۴۹
۳۴۔ کلّیات ولی، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ص ۳۵۴
۳۵۔ اردو کی نیچر شاعری، ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، ص ۱۱۲
۳۶۔ کلیات سراج اورنگ آبادی، بوستان خیال، ترقی اردو بیورو، ص ۱۹۰
۳۷۔ دیوان فائز، مرتبہ پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۲۰۳
۳۸۔ کلّیات سودا، جلد دوئم، ص ۴۳-۴۴
۳۹۔ اردو شاعری پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، حصہ اوّل، ص ۲۱۶
۴۰۔ ایضاً، ص ۶۲-۶۳
۴۱۔ کلیات میر، ڈاکٹر عبارت بریلوی، ۱۰۷۷-۱۱۱۶
۴۲۔ کلیاتمیر، جلد دوم، تحقیق و ترتیب، احمد محفوظ، ص ۳۲۲
۴۳۔ ایضاً، ص ۴۷
۴۴۔ کلیات میر، مرتبہ عبارت بریلوی، ص ۱۰۸۵
۴۵۔ اردو کی ادبی تاریخ، پروفیسر سروری، ۱۵۲
۴۶۔ کلیات میر، حصہ دوم، احمد محفوظ، ص ۳۸۱
۴۷۔ ایضاً، ص ۳۸۴
۴۸۔ روح نظم، حصہ اوّل، مرتبہ تاجور نجیب آبادی، پنڈت سیلا رام وفا، ص ۷۵

۴۹۔ کلّیات میر، حصہ دوم، ص ۱۰۲

۵۰۔ اردو مرثیہ، جلد اوّل، اظہر علی فاروقی، ۱۳۶

۵۱۔ کلام انشاء، مرتبہ مرزا محمد عسکری، ص ۲۲۵

۵۲۔ اردو شاعری میں منظر نگاری، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص ۳۱۲

۵۳۔ مثنوی سحر البیان، میر حسن، مطبوعہ نول کشور پریس، ص ۲۸-۲۹

۵۴۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص ۱۱۱

۵۵۔ ایضاً، ص ۲

۵۶۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۷۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص ۳۲۰

۵۸۔ اردو شاعری میں منظر نگاری، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص ۳۱۷

۵۹۔ انیس اور فردوسی کا تقابلی مطالعہ، ڈاکٹر سیّد فدا حسین، ص ۱۳۴

۶۰۔ انیس شناسی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص ۳۱

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۰

۶۲۔ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری، اے ایس صدیقی، ص ۳۸۷

۶۳۔ مرثیہ مرزا دبیر، جلد اوّل، ص ۵۷

۶۴۔ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری، ایس اے صدیقی، ص ۳۸۹

❁ ❁ ❁

باب سوم

'انجمن پنجاب' کا دَور

انجمن پنجاب کا قیام

پس منظر:

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد دہلی کی سیاسی اور معاشرتی حیثیت کمزور پڑ گئی۔ لکھنو بھی اجڑ گیا تو فن وحکمت اور شعر وادب سے وابستہ لوگوں نے دلّی کو چھوڑ کر مختلف علاقوں کا رخ کیا۔ کچھ لوگ رام پور چلے گئے‘ کچھ حیدر آباد (دکن) پہنچے اور کچھ پنجاب کے گلزاروں کی رونق بنے۔ چونکہ علاقہ پنجاب نے تحریک آزادی کے دوران غیر جانبداری کا ثبوت دیا تھا اس لئے وہاں امن وامان کی فضا تھی۔ پنجاب پر انگریزوں کا مکمل تسلّط تھا اور سکھ باشندوں کا انھیں مکمل اعتماد حاصل تھا۔ نیز سکھوں نے سقوط دہلی میں بھی انگریزوں کی مقدور بھر حمایت کی تھی۔ اسی حمایت کی بناء پر جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے صوبہ پنجاب کو وسعت دی اور ضلع حصار کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ پنجاب کے پہلے لفٹیننٹ گورنر سر جان لارنس نے ضلع پنجاب کے لئے ملکہ وکٹوریہ سے خاص مراعات حاصل کیں اور مہاراجہ پٹیالہ‘ مہاراجہ کشمیر‘ مہاراجہ نابھہ اور مہاراجہ کپورتھلہ کو خصوصی انعامات سے نوزا۔

(تاریخ پنجاب‘ اقبال صلاح الدین‘ مطبوعہ عزیز پبلیشرز لاہور ۱۹۷۴ء‘ ص ۵۸۲) ۱

لہٰذا انگریزوں نے پنجاب کی ترقی میں بھرپور دلچسپی لی۔ پنجاب میں یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو چیف کمشنر کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ لیفٹیننٹ گورنر کی بحالی عمل میں آئی اور دہلی کو پنجاب کے ماتحت کر دیا گیا جس سے اس کی سیاسی اہمیت اور اجاگر ہو گئی۔ چنانچہ شعر وادب اور تعلیم وتعلّم سے تعلق رکھنے والے لوگ لاہور کی جانب راغب ہوئے اور اس کے روح رواں محمد حسین آزاد بنے۔ ان کے علاوہ دہلی کے متعدد مشاہیر علم وادب تھے جن کے نام درج

ذیل ہیں:

"ماسٹر پیارے لال آشوب، پنڈت من پھول، منشی درگا پرشاد نادر، مرزا اشرف بیگ خان اشرف، مولوی امو جان ولی، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی کریم الدین، مولوی سید محمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور مرزا ارشد گورگانی کے نام شامل ہیں۔ یہ حضرات یکے بادیگرے پنجاب تشریف لائے۔ محمد حسین آزاد تو دبستان پنجاب کے بانی مانے جاتے ہیں۔"[۲]

بحوالہ: قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات جلد اول، حصہ اول، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسیان ذوالفقار، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء، ص ۳۵)

مسلمانوں کے طویل دور اقتدار میں برصغیر کی سرکاری زبان فارسی رہی تھی۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۷ء میں اپنے مقبوضہ علاقوں میں فارسی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔

۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق ہوا تو یہاں بھی فارسی کی جگہ اردو کو دفتری اور عدالتی زبان کے طور پر نافذ کر دیا گیا۔ چونکہ شعری اور ادبی زبان کے طور پر اردو پہلے سے ہی مقبول عام تھی لہٰذا اس فیصلے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ پنجاب میں محکمہ تعلیم کا قیام جنوری ۱۸۵۶ء میں عمل میں آیا جس نے مختصر مدت میں پورے پنجاب میں اسکولوں کا جال بچھا دیا۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور اور دہلی میں گورنمنٹ کالج قائم ہو گئے۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کو گورنمنٹ کالج لاہور کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔[۳]

ڈاکٹر لائٹنر ایک دور اندیش، صاحب بصیرت اور اولوالعزم مفکر تھے۔ اس سے قبل وہ کنگز کالج لندن میں عربی اور فقہ اسلامی کے پروفیسر تھے اور ان کا شمار ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا تھا۔ ایک بلند پایہ مستشرق ہونے کے ناطے انہیں مشرقی علوم سے مکمل آگاہی حاصل تھی۔ چنانچہ انہوں نے خطہ پنجاب کی تعلیمی و معاشرتی ترویج و احیاء کے لئے، اپنی آمد کے چند ماہ بعد ہی کرنل ہالرائیڈ (اس وقت پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے منتظم اعلیٰ) کے مشورے اور مقامی ہندو، مسلم اور سکھ علماء و فضلاء کے تعاون سے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو "انجمن پنجاب

'' قائم کی تا کہ انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک پلیٹ فارم میسّر ہو سکے۔

'' انجمن کا پورا نام '' انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب '' رکھا گیا جو بعد میں صرف 'انجمن پنجاب' کے نام سے مشہور ہوا۔ انگریزی میں اس کا نام " Society for the diffursion of useful knowledge in the Punjab" طئے پایا۔ '' [۲۴]

یہ جلسہ پنڈت من پھول اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس جلسے میں پنڈت من پھول نے ڈاکٹر ڈبلیو. جی لائٹز کا تعارف کرایا۔ منشی ہر سکھ رائے مہتمم 'کوہ نور' اخبار شعبہ فارسی کے سیکریٹری اور بابو نو بین چند رائے انگریزی کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹز صدر چنے گئے۔

اپنی افتتاحی تقریر میں پنڈت من پھول نے انجمن کے زیر نگرانی ایک عمدہ قسم کا کتب خانہ کھولنے کی تجویز بھی رکھی جس میں سبھی زبانوں کی علمی کتابیں اور اخبارات و رسائل مہیا کئے جائیں۔ چونکہ اس وقت انجمن کے پاس پیسے نہیں تھے لہٰذا یہ طئے پایا کہ انجمن کے ممبروں سے عارتیاً کتابیں لے کر کتب خانے میں رکھی جائیں۔ اس طرح ایک ہفتے کے اندر اندر کتب خانے میں پنڈت من پھول، منشی ہر سکھ رائے، پنڈت رادھا کشن، ڈاکٹر لائٹز، فقیر شمس الدین خاں، فقیر ظہور الدین خان اور لاہور کرانیکل کی طرف سے ۱۰۸۸ (ایک ہزار اٹھاسی) کتابیں جمع ہو گئیں۔

ممبران انجمن پنجاب:

انجمن پنجاب کے بہت سے حضرات ممبر بنائے گئے۔ ان میں سے خاص خاص کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ ڈاکٹر دبلیو. جی لائٹز، پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور

۲۔ دیوان بیج ناتھ ای اے سی، لاہور

۳۔ فقیر سید شمس الدین صاحب، آنریری مجسٹریٹ، لاہور

۴۔ سردار بھگوان سنگھ جاگیر دار، امرت سر

۵۔ شیخ فیروز الدین رئیس، لاہور
۶۔ مولوی کریم الدین، ڈپٹی انسپکٹر مدارس، لاہور
۷۔ مولوی محمد حسین، نائب سررشتہ دار، ڈائریکٹری پنجاب
۸۔ مولوی نیاز حسین، مدرس مدرسہ تعلیم معلمین
۹۔ مولوی علمدار حسین، مدرس گورنمنٹ کالج، لاہور

اغراض و مقاصد:

اس انجمن کے جو اغراض و مقاصد بیان کئے گئے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء
۲۔ باشندگان ملک میں دیسی زبانوں کے ذریعے علوم مفیدے کی اشاعت
۳۔ صنعت و تجارت کا فروغ
۴۔ علمی، ادبی، معاشرتی و سیاسی مسائل پر بحث و نظر
۵۔ صوبے کے با اثر اور اہل علم طبقے اور سرکاری افسران کے درمیان رابطے کی صورت پیدا کرنا
۶۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کے ساتھ روابط اور تعلقات کی استواری

انجمن پنجاب کے قیام کے سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' میں فرماتے ہیں:

> ''انجمن پنجاب نے اپنے قیام کے ساتھ ہی پنجاب میں اشاعت تعلیم کے لئے بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ عوام کے استفادے کے لئے لائبریری قائم کی گئی۔ اخبار و رسائل جاری کئے گئے نیز سماجی، اخلاقی، تہذیبی، علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کے لئے جلسوں کا بندوبست کیا گیا۔ انجمن پنجاب کا دائرہ لاہور تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس کی شاخیں امرتسر، گورداس پور، قصور، راولپنڈی اور دوسرے شہروں میں بھی قائم

ہوئیں۔'' ۵

اردو شاعری پر بھی ''انجمن پنجاب'' کے قیام کے دوررس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اس ضمن میں محمد حسین آزاد کا اسم گرامی ہمیں اس حد تک تابناک نظر آتا ہے جیسے ''انجمن پنجاب'' اور آزاد ایک ہی ہستی کے دو نام ہوں۔

آزاد فطرت کی طرف سے ایک مجتہد کا دماغ لے کر آئے تھے۔چنانچہ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے سے قبل دہلی میں قیام کے دوران ہی وہ غزل کی شاعری سے دل برداشتہ تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہماری شاعری رات کو تارے گننا چھوڑ کر دن میں سورج سے آنکھ ملانا سیکھے۔ان خیالات کی تائید حالی کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

> ''لاہور ہی میں کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا۔یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔۔۔۔'' ۶ (مجموعہ نظم حالی' ابتدائیہ۔
> حالی کی کہانی حالی کی زبانی' مطبوعہ شیخ مبارک علی' لاہور ۱۹۳۲ء' ص ۷)

لاہور میں قیام کے دوران جب آزاد کو 'انجمن پنجاب'' کی صورت میں مناسب ماحول میسّر آیا تو اسے انہوں نے غنیمت سمجھا اور اردو شاعری کو ایک نئی سمت دینے کی اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لئے کمربستہ ہوگئے۔لہٰذا ۱۵/اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں انہوں نے ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات '' کے زیر عنوان ایک پر تاثیر مقالہ پیش کیا۔اس مقالے میں انہوں نے اردو شاعری' ادبی معیار میں انقلاب اور شعراء کے نصب العین میں تبدیلی کی ضرورت پر بہت زور دیا اور اپنے مقالے کا اختتام ان الفاظ میں کیا:

(۔۔۔۔امید ہے کہ جہاں گور محاسن وقبائح کی ترویج واصلاح پر نظر ہوگی۔

فن شعر کی بھی اس قباحت پر نظر رہے۔ گو آج نہیں مگر قوی امید ہے کہ انشاءاللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا) ے

۸ رمئی ۱۸۷۴ء کی شام ''انجمن پنجاب'' کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان تاریخی جلسے کا انعقاد ہوا۔ محمد حسین آزاد نے جلسے کی ابتدا میں وہ تاریخی تقریر کی جس سے کچھ ہی عرصہ بعد اردو شاعری میں انقلاب پیدا ہوا۔ آزاد کی اس تقریر کو بجا طور پر انجمن پنجاب کی ادبی تحریک کا منشور قرار دے سکتے ہیں کیونکہ اس میں وہ تمام بنیادی مقاصد واضح طور پر بیان کر دئے گئے تھے جو آزاد کے پیش نظر تھے اور جس کے لئے وہ ایک عرصے سے کوشاں تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں اردو شاعری میں رائج اندھے تقلیدی رویے پر سخت تنقید کی۔ اپنے ہم وطن شعراء سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''۔۔۔۔اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فر فر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم' کسی شئے پر رغبت یا اس سے نفرت' کسی شئے سے خوف یا خطر' یا کسی پر قہر یا غضب' غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو' اسکے بیان سے وہی اثر' وہی جذبہ' وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے' جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے۔۔۔ اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور' مضمون کا جوش و خروش اور لطائف وصنائع کے سامان' تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف' بہت سے حسرت وارمان' اس سے زیادہ ہجر کا رونا'

شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندی کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خالی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور دور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطالب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا کہ ہم اپنے زوروں کا بے اصل اور معدوم باتوں میں ضایع کرتے ہی۔۔۔۔۔ جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہ سبب بے قدری کے اور کہنہ والے پیدا نہ ہوں گے۔ کئی پرانی مورتیں ہیں، وہ چراغ سحری ہیں، انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہو جائے گی اور اردو میں نظم کا چراغ گُل ہو جائے گا'' ۸؎

مندرجہ بالا طویل اور اچھوتی تقریر کے بعد بارش کے پہلی بوند کی طرح خود آزاد نے اپنی پہلی نظم ''شب قدر'' کے نام سے پیش کی۔ جس سے سامعین کو یہ جتانا مقصود تھا کہ اردو نظم روایتی مضامین کے علاوہ اور مطالب کے بیان کرنے کی بھی پوری طرح اہل ہے۔ آزاد نے نظم شب قدر اس لئے پیش کی تا کہ موضوعاتی شاعری کے مجوزہ آئندہ مشاعرے کے لئے نظم کہنے میں ان کے سامنے کوئی نمونہ ہو۔

(فٹ نوٹ: گرچہ اردو شاعری میں نظم کی روایت اسی قدر قدیم ہے جتنی اردو شاعری۔ قدماء میں، دکنی دور میں موضوعاتی نظموں کے نمونے ملتے ہیں میر و سودا، میر حسن، انیس، دبیر، نسیم، مرزا شوق اور دیگر شعراء کے یہاں مثنویوں اور مرثیوں سے موضوعاتی نظموں کو اقتباس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ موجودہ دور کی فطری شاعری کی ابتدا آزاد اور حالی سے ہوتی ہے لیکن اس کے پیشرو نظیر اکبر آبادی کہے جا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظیر

اکبر آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں جدید اردو شاعری کے
تخم کوٹ کوٹ کر موجود ہیں۔)

یہ نظم ایک سو پندرہ (۱۱۵) اشعار پر مشتمل تھی۔ پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی فرماتے
ہیں:

''یہ نئی شاعری کی سب سے پہلی نظم ہے۔''۹

اسی موقع پر کرنل ہالرائڈ نے انگریزی زبان میں جو تقریر کی وہ بھی' تاریخ ادبیات اردو'
میں اپنی خاص اہمیت کی حامل ہے۔'' اس تقریر کا ترجمہ ضمیمہ ''کوہ نور'' مطبوعہ ۱۶ مئی
۱۸۷۴ء میں چھپا تھا۔''۱۰

انجمن پنجاب کے تحت مشاعرے

متذکرہ بالا تقاریر کے بعد اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ انجمن کے زیر اہتمام ہر مہینے
ایک مشاعرہ ہوا کریگا۔ اس سلسلے میں ۳۰ رمئی ۱۸۷۴ء کو ایک موضوعی مناظمہ منعقد ہوا جس کا
موضوع ''برسات'' تھا۔ (اسے ہم موضوعاتی شاعری کا پہلا مشاعرہ تسلیم کر سکتے ہیں۔)

(فٹ نوٹ: جناب عبداللہ قریشی نے جامعہ پنجاب کے مجلّہ 'تحقیق' شمارہ نمبر ۱۳ بابت
۱۹۸۱ء ص۔ ۹۷ پر اور ڈاکٹر صفیہ بانو نے 'انجمن پنجاب۔ تاریخ وخدمات' مطبوعہ کفایت
اکیڈمی ۱۹۷۸ء ص ۲۳۴ پر ۳۰ رمئی ۱۸۷۴ء کو ہونے والے مناظمہ کو پہلا باقاعدہ مشاعرہ
تسلیم کیا ہے۔ اور یہ بجا ہے کیونکہ اس سے قبل ۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو ہونے والا جلسہ محض ایک
جلسہ ہی تھا' مشاعرہ نہیں۔ اس میں زیادہ تر تقاریریں ہوئی تھیں۔ صرف مولانا آزاد نے
بطور نمونہ اپنی نظم ''شب قدر'' سنائی تھی۔)

اس مشاعرے میں محمد حسین آزاد و دیگر شعراء کے ساتھ خواجہ الطاف حسین حالی نے بھی
شرکت فرمائی اور مجوزہ موضوع پر اپنی طویل نظم ''برکھارت'' پڑھی جسے عوام وخواص نے بیحد
سراہا۔

انجمن پنجاب کے تحت دوسرا مشاعرہ ۳۰ رجون ۱۸۷۴ء کو بڑے تزک واحتشام کے

ساتھ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کا موضوع ''زمستان'' تھا۔ اس مشاعرے میں نو شعرائے کرام نے اپنی نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ اس مشاعرے میں حاؔلی شریک نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے مثنوی ''زمستان'' پڑھی۔ اسے سامعین نے تو بیحد سراہا لیکن اخبارات میں بڑی لے دے ہوئی۔ اس سلسلے میں ''پنجابی اخبار'' پیش پیش تھا۔ موافقت اور مخالفت کی اس کشمکش کے ساتھ ساتھ نئی نظم کا سفر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا اور مشاعروں کا سلسلہ بھی حسب معمول جاری رہا۔

تیسرا مشاعرہ ۳۰/اگست ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ اس مشاعرے کا عنوان ''امید'' تھا۔ اس میں بھی نو شعراء کرام نے شرکت کی۔ آزاد اور حاؔلی بھی موجود تھے۔ حاؔلی نے نظم ''نشاط امید'' پیش کی جو بیحد پسند کی گئی۔

چوتھے مشاعرے کا انعقاد ار ستمبر ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ اس مشاعرے میں آزاد اور حاؔلی کے علاوہ دس شعراء نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کا عنوان ''حب وطن'' تھا۔ عنوان کے عین مطابق حالی نے اپنی نظم ''حب وطن'' سنائی۔

اسی طرح مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا اور اس سلسلے کا پانچواں مشاعرہ ۹/اکتوبر ۱۸۷۴ء کی شام کو منعقد ہوا اور اسکا عنوان ''امن'' دیا گیا نیز شرکاء کی تعداد گیارہ تھی۔ حاؔلی اس میں موجود نہیں تھے۔

اس سلسلے کا چھٹا مشاعرہ ۱۴/نومبر ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب ہال میں منعقد ہوا۔ اس کا عنوان ''انصاف'' تھا۔ اس مشاعرے میں تیرہ شعرائے کرام شریک تھے اور حاؔلی بھی موجود تھے۔ لاہور میں حاؔلی کا یہ آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ (اس کے بعد حالی صحت کی خرابی اور دیگر وجوہات کی بناء پر دہلی منتقل ہو گئے۔) حاؔلی نے اس مشاعرے میں اپنی طویل مثنوی ''مناظرہ رحم و انصاف'' پڑھی جو ایک سو انیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کی سامعین نے دل کھول کر تعریف کی۔

ساتواں مشاعرہ ۱۱/دسمبر ۱۸۷۴ء کو انجمن ہال میں منعقد ہوا۔ اس کا موضوع ''مروّت'' تھا۔ اس میں بشمول مولانا آزاد پندرہ شعرا تھے۔

آٹھواں مشاعرہ ۳۰ / جنوری ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اس کا موضوع ''قناعت'' طئے پایا تھا۔ (اس کے شرکاء میں دیگر افراد کے علاوہ دو طلبا بھی تھے۔) اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ متذکرہ نئی شعری روایت نئی نسل میں بھی مقبول ہوتی جارہی تھی۔

صفیہ بانو اپنی کتاب ''انجمن پنجاب' تاریخ وخدمات'' میں فرماتی ہیں:

''ایک طالب علم کا نام لالہ دین دتل تھا جو عاجز تخلص کرتے تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ دوسرے کا نام جوالا سہائے تھا اور تخلص خرم تھا۔ یہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔''[11]

نواں مشاعرہ ''ہمدردی'' کے موضوع پر تھا۔ یہ ۲۲ / مئی ۱۸۷۵ء کو منعقد ہوا۔

(فٹ نوٹ: ڈاکٹر صفیہ بانو نے ''انجمن پنجاب۔۔تاریخ وخدمات'' کے ص ۳۵۲ پر نویں مشاعرے کے انعقاد کی تاریخ ۱۳ / مارچ ۱۸۷۵ء لکھی ہے۔ اور موضوع ''تہذیب'' بتایا ہے جبکہ ''لاہور کا دبستان شاعری'' میں ڈاکٹر علی محمد خاں نے اس کی تاریخ ۲ / مئی ۱۸۷۵ء قرار دی ہے اور موضوع ''تہذیب'' کے بجائے ''ہمدردی'' لکھا ہے' جو زیادہ مستند معلوم پڑتا ہے۔ کیونکہ اس میں جناب عبداللہ قریشی کے حوالے سے بات کہی گئی ہے انہوں نے رسالہ انجمن پنجاب کے ضمیمے ''گلدستۂ سخن'' جس میں ان شاعروں کی روداد چھپا کرتی تھی' کے حوالے سے' یہ تاریخ ۲۲ / مئی ۱۸۷۵ء قرار دی ہے اور موضوع ''تہذیب'' کے بجائے ''ہمدردی'' لکھا ہے' اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مجلس ترقی ادب لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے۔[12]

دسواں مشاعرہ ۳ / جولائی ۱۸۷۵ء کو منعقد ہوا۔ انجمن پنجاب کے تحت منعقد ہونے والے اس آخری مشاعرے کا عنوان ''شرافت انسانی'' تھا نیز یہ بھی انجمن پنجاب ہال میں منعقد ہوا۔ اس میں محمد حسین آزاد نے ''شرافت حقیقی'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ یہ آخری مشاعرہ بے رونق رہا کیونکہ اس میں آزاد کے علاوہ کسی بڑے شعراء کی شرکت نہیں ہوئی۔

(فٹ نوٹ: دسویں اور آخری مشاعرے کے سلسلے میں بھی صفیہ بانو نے اپنی تصنیف ''انجمن پنجاب: تاریخ وخدمات'' کے صفحہ ۳۶۰ پر لکھا ہے کہ ''دسویں مشاعرے کی تاریخ کا

تعین نہیں کیا جا سکتا'' اور موضوع 'اخلاق' لکھا ہے جبکہ جناب عبداللہ قریشی نے اسے بھی غلط قرار دیا ہے اور رسالہ انجمن پنجاب کے ضمیمے کے حوالے سے ہی اس مشاعرے کی تاریخِ انعقاد ۳ جولائی ۱۸۷۵ء اور موضوع ''شرافت انسانی'' لکھا ہے جس پر شک وشبہ کی گنجائش نہیں محسوس ہوتی ۱۳۔

''انجمن پنجاب'' کے زیر اہتمام یہی دس مشاعرے ہوئے اور اسی پر یہ موضوعاتی مناظمے اختتام پذیر ہو گئے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ مذکورہ عرصے میں ان مناظموں کے علاوہ روایتی طرحی مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان طرحی مشاعروں کی روداد بھی رسالہ 'انجمن پنجاب' کے ضمیمے کے طور پر چھپا کرتی تھی۔ یہ موضوعاتی مشاعرے اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو مشاعروں کی روایت سے بالکل مختلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صدائے بازگشت ملک بھر سنی گئی اور جدید اردو شاعری کی اس تحریک کی موافقت اور مخالفت میں مختلف اخبار و رسائل نے اپنی اپنی آراء پیش کیں جس میں ''سررشتہ تعلیم''، لکھنو اور ''لارنس گزٹ'' میرٹھ قابل ذکر ہیں۔ ''سررشتہ تعلیم''، لکھنو 'انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اٹھنے والی جدید شاعری کی اس روایت اور محمد حسین آزاد کا سخت مخالف تھا جبکہ ہفتہ وار ''لارنس گزٹ'' میرٹھ بے لوث حمایت کرنے والوں میں سے تھا۔

انجمن پنجاب کے بزم مشاعرہ کا بیان اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک ہم خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر نہ کریں اور اس بات پر بحث نہ کی جائے کہ انہوں نے انجمن سے کیا اثرات قبول کئے اور کیا کچھ انجمن کو ان سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ حالی نے انجمن کے مشاعرے میں چار بار شرکت کی اور پھر وہ آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے دہلی منتقل ہو گئے۔

لاہور میں چار سال تک قیام کے دوران انہیں مغربی تصانیف سے استفادہ کرنے کا بہت موقع ملا۔ صالحہ عابد حسین نے ''یادگارِ حالی'' میں لکھا ہے:

> ''ان کو اس میں ایک نئی دنیا نظر آئی اور ان کے مذاق شعر و ادب پر اسکا گہرا اثر ہوا۔ حالی نے دیکھا کہ شعر و ادب کا میدان کتنا وسیع ہے اور اس کا کام

محض واردات قلب کا بیان اور داستان عشق کا سنانا ہی نہیں بلکہ زندگی کی ترجمانی' کائنات کا مطالعہ' انسانوں کے اخلاق اور معاشرتی معیاروں کا بلند کرنا بھی ہے اور لوگوں کے دلوں میں قوم کی محبت اور خدمت کے جذبات کو ابھارنا بھی۔ حالی مغربی ادب کا یہ اثر قبول کرتے رہے اور مذاق شعر نئے سانچے میں ڈھلتا رہا۔''[۱۴]

حالؔی کی اسی زمانے میں قوم وملت کے ناخدا سر سید احمد خاں سے ملاقات ہوئی۔ سر سید نے حالی کی شاعرانہ خوبیوں کو پرکھ لیا تھا۔ چنانچہ قوم کو بیدار کرنے کی غرض سے نظمیں لکھنے کی طرف آمادہ کیا اور سر سید کی ایماء پر حالی نے اپنی وہ پہلی جدید طرز کی طویل تاریخ ساز نظم ''مدّ و جزر اسلام'' لکھی جو ۱۸۷۹ء میں مکمل ہوئی اور ''مسدّس حالی'' کے نام سے ملک کے طول وعرض میں جلد ہی مشہور ہوگئی۔ مسدّس میں حالی کا قومی شعور اور آزاد اور سر سید تحریک کا جذبہ اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

اس زمانے میں حالی نے ''مسدس'' کے علاوہ اور بھی کئی نظمیں لکھیں، جن میں ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چُپ کی داد'' شامل ہیں۔ ان نظموں میں بھی وہی تحریک اور وہی نیا شعور کارفرما نظر آتا ہے جس کے محرّک آزاد تھے۔

اس طرح محمد حسین آزؔاد نے نظم کی جس نئی تحریک کی بنیاد ڈالی' حالؔی نے نہ صرف مربوط و منظّم کیا بلکہ اس کی ترویج واشاعت میں بھی بھرپور رول ادا کیا۔ آزؔاد بنیادی طور پر ایک نثر نگار تھے اور شاعری ان کا میدان نہیں تھا جبکہ حالؔی نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے بھی مرد میدان تھے۔ چنانچہ نئی نظم کے آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد جو کچھ انہوں نے لکھا اور کہا اس کا بڑا مقصد اس نئی تحریک کو کامیاب کرنا تھا جس کی داغ بیل محمد حسین آزؔاد نے ڈالی تھی۔

حالؔی کا بہت بڑا کارنامہ ان کی تحریر ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔ جامعہ میسور کے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔قدیم اصناف خیالی کی شکست و ریخت اور نئے تصور شعری کی

تعمیر میں حالی کی تحریروں نے جو کام کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ وہ دُھن کے ایسے پکّے تھے کہ مخالفتیں سہتے رہے، لوگ ان کا مضحکہ اڑاتے رہے، لیکن وہ برابر اپنا کام کیے گئے۔ حالی کی ادبی زندگی کا بڑا کارنامہ اردو شاعری کی اصلاح ہے اور ان کی اصلاحی مساعی کا سب سے بڑا مجموعہ ان کا ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔ جس کی اشاعت درحقیقت جدید شعری تخیل کی نشو و نما دینے میں بہت مفید ثابت ہوئی''۔ [۱۵]

اصلاح کے اس دور میں آزاد اور حالی کے ساتھ ساتھ مولانا شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، شوق قدوائی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ اور دیگر ہم عصروں کا تذکرہ بھی ضروری ہے کیونکہ ان شعرائے کرام نے بھی اپنی اپنی جگہ لاہور سے اٹھنے والی اس نئی تحریک کو اپنایا اور حتی المقدور اس کی عملی طور پر پیروی کی۔

غرضیکہ ''انجمن پنجاب'' کی نظمیہ تحریک نے اردو شاعری کی روایات کو ایک نئی راہ سے روشناس کرایا۔ شاعری اب تخیل،

جذبے اور فن کے اظہار تک محدود نہ رہ کر ایک نئی جہت سے آشنا ہوئی۔

انجمن پنجاب کے تحت کہی گئی نظموں میں مناظر فطرت

اردو نظم نگاری کے فنی ارتقاء کا اگر دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ نظم نگاری کی روایت اگرچہ ہمارے یہاں بہت پرانی ہے لیکن ابتدائی دور میں مناظر فطرت کو نظموں میں محض ذاتی اور انفرادی طور پر پیش کیا گیا جس کی جھلک دیگر اصناف کے علاوہ زیادہ تر مثنویوں میں ملتی ہے۔ان مثنوی نگاروں نے منظر نگاری پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی قصہ اور پلاٹ انکی توجہ کا مرکز رہے۔

منظر نگاری کے باضابطہ آغاز کا سہرا مولوی محمد حسین آزاد (۱۸۲۲ء۔۱۹۱۰ء) کے سر ہے۔آزاد جب فکر معاش میں دلّی سے لاہور پہنچے تو انکو وہاں انگریزی ادب کو بھی سمجھنے کا موقع ملا۔اس زمانے میں ''کرنل ہالرائڈ'' ڈائرکٹر تعلیمات تھے اور اردو سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔مولانا آزاد ابتداہی سے اردو شاعری میں انقلاب لانا چاہتے تھے۔اس کا موقع ان کو لاہور میں ''کرنل ہالرائڈ'' کی سرپرستی میں ملا۔ چنانچہ انہوں نے طلباء اور تعلیم یافتہ لوگوں کو خطاب کیا اور انھیں نئے علوم وفنون کی تحصیل کے لئے آمادہ کیا جس کے نتیجے میں ۱۸۶۷ء میں لاہور میں ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی گئی۔

''انجمن پنجاب'' کے زیر اہتمام جو مشاعرے ہوتے تھے اس میں غزلوں کے بجائے نظموں کے موضوعات مقرّر رکئے جاتے تھے اور انھیں پر طبع آزمائی کی جاتی تھی۔آزاد نے اسی دوران ادیبوں کے مزاج میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے کچھ ادبی تقریریں بھی کیں۔ اگست ۱۸۷۶ء کو انہوں نے تقریر کی جسکا موضوع تھا ''خیالات نظم اور کلام موزوں'' اس کے علاوہ انھوں نے ''اردو زبان کی نظم انشا پردازی'' پر بھی اپنے خیالات کا اظہار اہل انجمن کے سامنے کیا۔مولوی محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں اپنی مشہور مثنوی ''شب قدر'' لکھی۔

بقول سیّد ممتاز علی (مولف مجموعہ نظم آزاد):

> ''یہ پہلا دن تھا جس روز ہمارے ملک کی نئی شاعری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔''[16]

''انجمن پنجاب'' کی یہ تحریک دیگر معنوں میں تو اہمیت کی حامل ہے ہی ساتھ ہی اس کے تحت منعقد کئے گئے مناظموں میں فطری منظر نگاری پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ''انجمن پنجاب'' کے پہلے مشاعرے کا موضوع ''برسات'' تھا جو کہ فطرت کی منظر نگاری کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اس مشاعرے میں حالؔی نے اپنی مشہور طویل نظم ''برکھا رُت'' پیش کی تھی۔ انجمن پنجاب کی اس تحریک کو فطری شاعری کی تحریک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے تحت قابل ذکر تعداد میں ایسی نظمیں کہی گئی ہیں جن میں منظر فطرت کی جھلک بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس لئے اسے ہم ان معنوں میں رومانوی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مضامین فطرت کو نظم میں پیش کرنے پر زور دیا۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء): محمد حسین آزاد ۱۰ رجون ۱۸۳۰ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد باقر تھا جو علم و فضل کی بنا پر اپنے ہم عصروں کے درمیان بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آزاد نے ایک ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب سرزمین دلّی پر ذوق، مومن اور غالب جیسے یکتائے روزگار شعرا کا دور دورہ تھا۔ چونکہ مولوی باقر استاد ذوق کے قریبی دوست تھے اس لئے جب آزاد نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے انھیں ذوقؔ کے حوالے کر دیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آزاد نے دہلی کالج میں داخلہ لیا جہاں مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب جیسے ساتھیوں کے ساتھ مروجہ علوم کے حصول کا موقع ملا۔ محمد حسین آزاد کو شعر و ادب سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ اس پر ذوق جیسے استاد کی تربیت میں وہ بہت جلد کلام کی پختگی، قدرت بیان اور رموز شاعری سے بہرہ مند ہو گئے۔ محمد حسین آزادؔ کو ان کی گراں قدر خدمات کی بدولت ۱۸۸۷ء میں شمس ا لعلماء کا خطاب دیا گیا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور امام باڑہ گامے شاہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی تصانیف میں سخندان فارس، آب حیات، دربار اکبری، اور منظومات کے مجموعے نظم آزاد اور خمکدہ موجود ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دور جدید کی شاعری میں منظر نگاری کے آغاز کا سہرا مولوی محمد حسین

آزاد کے سر ہے۔ آزاد کی طبیعت اپنے دور کی فرسودہ شاعری سے اکتا چکی تھی۔ آزاد جب فکر معاش میں دلّی سے لاہور پہنچے تو وہاں ان کو انگریزی ادب کو سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ جس دور میں آزاد لاہور تشریف لے گئے یہ وہی زمانہ تھا جب قدیم شاعری کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور اردو سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی سرپرستی میں' اردو شاعری میں ایک نیا انقلاب لانے کا محمد حسین آزاد خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور اسی کے نتیجے میں ''انجمن پنجاب'' کا قیام عمل میں آیا۔ آزاد نے اس انجمن کے پہلے اجلاس میں اپنی نظم ''شب قدر'' پڑھی تھی۔ اس سلسلے میں سید ممتاز علی مولف ''مجموعۂ نظم آزاد'' میں کہتے ہیں:

''شب قدر'' کے علاوہ آزاد نے ''ابر کرم''، ''موسم زمستان''، ''صبح امید'' وغیرہ مثنویاں بھی کہیں۔ ان مثنویوں میں جہاں نئے دور کی آواز تھی وہیں فطرت بھی اپنے صحیح خط وخال میں نظر آئی۔

انجمن پنجاب کے قیام اور اپنی تقریر کے بعد آزاد نے جو نظم سنائی اس کا عنوان ''شب قدر'' تھا۔ یہ نظم آئندہ مشاعرے کے لئے نمونہ بن گئی۔ اس میں انہوں نے رات کی غرض و غایت کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ آزاد کی نظم ''صبح امید'' کے تمہیدی اشعار منظر نگاری پر مشتمل ہیں' ملاحظہ کیجیے ؎

جب کیا صبح نے فلک روشن مینائی   بستر خواب سے میں لے کے اٹھا انگڑائی
آنکھ مل کر جو نظر کی سوئے میدان جہاں   ذرّہ ذرّہ میں نظر آیا رخ جان جہاں
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامن کوہ   جس پہ ہے فرش زمیں گلشن گردوں کی شکوہ [12]

آزاد کی مناظر فطرت کی یہ عکاسی لائق تحسین ہے کیونکہ اس میں مبالغہ آرائی کے بجائے اعتدال اور حقیقت پسندی کے عناصر صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حامدی کاشمیری فرماتے ہیں:

''جہاں جہاں منظر نگاری کا فطری حسن اور سادگی نکھر آئی ہے' انگریزی کلاسیکی شعرا کی پر تصنع منظر نگاری کے خلاف تھامسن کی ''دی سیزنز'' کی

منظر نگاری کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے۔''۱۸

محمد حسین آزاد کی نظم 'صبح امید' کی منظر نگاری کو ڈاکٹر محمد صادق مصنوعی مانتے ہیں چنانچہ اپنی کتاب 'محمد حسین آزاد احوال و آثار' میں فرماتے ہیں:

''مثنوی صبح امید کا آغاز تو منظر نگاری سے ہوتا ہے۔ یہ منظر کشی تمام تر مصنوعی ہے۔ شاعر کے سامنے کوئی خاص منظر نہیں اور وہ پہاڑ' دریا' سبزہ' درخت' پھل پھول جیسے پیش پا افتادہ اجزا سے ایک مرکب مرقع تیار کر دیتا ہے۔ یہ اجزا آپس میں پیوست ہو کر ایک وحدت میں تبدیل نہیں ہو پاتے۔ بلکہ جوں کے توں الگ تھلگ پڑے رہتے ہیں۔''۱۹

آزاد کی نظم ''ابر کرم'' بھی ایسی ہی ایک نظم ہے جس میں مناظر فطرت کی عکاسی بہت ہی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ اس میں کہیں گرمی کا سماں تو کہیں برسات کی گھٹاؤں کا ذکر ہے جس میں داخلی تاثر اور فطری رچاؤ دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں آزاد نے گرمی کی شدّت کو مندرجہ ذیل پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

اب یاں جو چند روز سے جاری نظام تھا — گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام تھا
دنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی — پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے — اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے
طفل نبات پیاس کے مارے بلک رہے — خلق خدا کے نعرے بہت دور تک گئے ۲۰

ان اشعار میں آزاد نے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں گرمی کی شدّت کو بیان کیا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے اس لئے وہ گرمی کی اصل کیفیت کو بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

گرمی کے علاوہ برسات کا ذکر بھی آزاد نے بڑے ہی خوبصورت پیرائے میں کیا ہے ؎

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں — اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا — اور روئے سبزہ زار کو دھو کر سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے — اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آب کے　　گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
کوئل کا دور دور درختوں میں بولنا　　اور دل میں اہل درد کے نشتر کھنگولنا
طاؤس کا وہ دم کو چنور کر کے ناچنا　　اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا
املی کے اک درخت پہ جھولا پڑا ہوا　　اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے　　اور بچّے آم کے ہیں پپیے بجا رہے
آنا وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی　　بول اٹھنا مرغ نغمہ سرا کا کبھی کبھی ۲۱

ان اشعار میں آزاد نے برسات کی صحیح منظر نگاری پیش کی ہے۔ برسات کے بارے میں انھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سب ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر درختوں کی ڈالیوں کا جھومنا' آب رواں کا لہرانا' کوئل کا کوکو کرنا' طاؤس کا ناچنا' بچّوں کا آم کے پپیے بجانا۔ یہ سب ایسے مناظر ہیں جس نے ان کی منظر نگاری میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے ان تصویروں کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ تصویریں خیالی اور مصنوعی نہیں ہیں۔'' ۲۲

آزاد نے اپنی ایک نظم ''وداع انصاف'' میں موسم سرما کا ذکر کیا ہے جو ان کی منظر نگاری کا خوبصورت نمونہ پیش کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہوا　　شملہ پہ مجھ کو موسم سرما بسر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے　　اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
دامان کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر　　دبکا لحاف ابر میں منہ کو لپیٹ کر
دیکھو جو گھر تو سب درو دیوار تھے سفید　　باہر چلو تو دامن کہسار تھے سفید
پتّے تھے آ کے جاڑے نے سب دور کر دیے　　اور تھے درخت برف نے بلّور کر دیے ۲۳

سردی کی شدّت کا جیسا بیان اس میں آزاد نے کیا ہے اس کی مثال کم دیکھنے کو ملتی۔ اس کے علاوہ اندھیری رات کی منظر کشی اور جنگل کی تاریکی کا ذکر بھی جا بجا دکھائی دیتا ہے۔

اسی نظم میں ایک جگہ صبح کی منظر کشی کچھ اس طرح کی گئی ہے ؎

ناگہ فلک پہ دامن شب چاک ہو گیا لبریز نور سے طبق خاک ہو گیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا گلگو نہ لے کے سامنے رنگ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گل تر کی لالیاں اوراوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا اور جھوم جھوم کر وہ رخ گل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی شبنم تھی آ کے رات کے موتی لٹا گئی ۲۴

اس میں آزاد نے صبح کا منظر بہت ہی واضح الفاظ میں پیش کیا ہے۔مبالغہ آرائی اور تصنع سے کافی حد تک گریز کیا ہے۔

آزاد نے مثنوی ''زمستان'' میں جاڑے کی آمد اور اس کی خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جاڑے میں گاؤں اور دیہات کی تہذیب میں انگیٹھی اور الاؤ کے گرد بیٹھنا' لحاف میں پڑے پڑے آگ تاپنا وغیرہ شامل ہے۔ کچھ لوگوں کا شال اوڑھ کر گھومنا اور غریبوں کا یوں ہی ٹھٹھرتے پھرنا دیہات کے فطری مناظر کی بہترین عکاسی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھرّاتے ہیں
بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں
ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغُل بیٹھا
پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے
کہیں سوں سوں ہے کہیں سی سی ہے کہیں سیٹھی ہے
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے ۲۵

مندرجہ بالا اشعار میں آزاد نے جاڑے کو خالص ہندوستانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ لحاف کا تصور اور انگیٹھی بھی ہندوستانی پس منظر کا حصّہ ہیں۔ یہی ہندوستانی عناصر وعوامل یہاں کے تہذیبی وثقافتی رنگ کی تعمیر میں حصّہ لیتے ہیں۔

آزاد نے دراصل دورِ جدید میں منظر نگاری کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جدید قسم کی شاعری کی ابتدا کی اور اس کو انتہا پر پہنچانے کا کام دوسروں کے لئے چھوڑ دیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی نئی تحریک یا رجحان کی بنا ڈالنا اسے آگے لے جانے سے کہیں زیادہ دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ ''انجمن پنجاب'' کی نئی شاعری کی اس تحریک کی بنیاد ڈال کر محمد حسین آزاؔد نے اردو ادب پر جو احسان عظیم کیا ہے اس کے لئے انہیں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

'انجمن پنجاب' کے نویں مشاعرے میں ''مصدرِ تہذیب'' کے عنوان سے ایک مثنوی جو کہ ۱۴۵ اشعار پر مبنی ہے' موجود ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا میں کافی طویل تمہید کے طور پر آغاز آفرینش کے پرسکون ماحول اور دنیا کی بہار کا نقشہ بڑے ہی دل فریب انداز میں کھینچا ہے۔ اس میں جہاں روز ازل کا دبدبہ دکھائی دیتا ہے وہیں دوسری طرف دنیا کی منظر کشی کو بھی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

زمیں پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی — اور آفرینشِ عالم کی تھی سحر پہلی
مزاج جملہ عناصر کا اعتدل پہ تھا — اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا
وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی — اور ابتدا تھی زمانے کے کارخانے کی
زمین سبز ہ قدرت سے لہلہاتی تھی — صبا جو اس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی

تمام دشت چمن در چمن بڑے ہوئے تھے
پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے ہوئے تھے ۲۶

اس طرح ''انجمن پنجاب'' کے تحت یا اس کی تحریک پر جن لوگوں نے نظمیں کہیں ان میں مناظر قدرت کی تصویر کشی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ مناظر فطرت کی عکاسی میں ان کے سامنے انیس اور دبیر کی شاعری ممد و معاون ثابت ہوئی۔ حامدی کاشمیری نے لکھا ہے کہ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے انیس و دبیر کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ دوسری طرف انگریزی کی منظری شاعری سے بھی استفادہ کیا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء): خواجہ الطاف حسین حآلی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ نو سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ دو بڑی بہنیں تھیں' انہوں نے ہی مولانا کی پرورش کی ذمہ داری نبھائی۔ قرآن مجید حفظ کی اور مولانا سید جعفر علی و حاجی ابراہیم حسین انصاری سے صرف ونحو کی تعلیم لی۔ ابھی تعلیم ادھوری ہی تھی کہ سترہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ تلاش معاش کے لئے دلی گئے اور بعد میں لاہور آ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات کرنل ہالرائیڈ سے ہوئی ان کے کہنے پر ''انجمن پنجاب'' کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ لیکن زیادہ دن لاہور میں نہیں رہے پھر دلّی چلے گئے اور اینگلو عربک اسکول کے پہلے فارسی مدرّس ہو گئے۔ یہاں کی ملازمت ترک کرنے کے بعد زیادہ وقت پانی پت میں ہی گذرا۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کی بناء پر انھیں حکومت نے ۱۹۰۴ء میں ''شمس العلماء'' کا خطاب عطا کیا۔ آخری ایاّم میں وہ کافی بیمار رہنے لگے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں ان کا انتقال ہوا۔ تصانیف میں مقدمہ شعرو شاعری' دیوان حالی' حیات سعدی' نظم حالی' یادگار غالب' حیات جاوید اور مسدّس حالی مشہور ہیں۔

محمد حسین آزاد کے بعد جدید نظم کے علم برداروں میں حالی کا نام سرفہرست ہے۔ حالی نے نظم گوئی کے میدان میں یوں تو قصیدہ' نظم' غزل اور مثنوی وغیرہ تمام ہی اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن مسدّس ''مدّ و جزر اسلام'' کو چھوڑ کر نمایاں کارنامے زیادہ تر مثنوی میں ہی انجام دیئے۔

حالی فطرت کی طرف سے موزوں طبیعت اور شعری ملکہ لے کر آئے تھے' اس پر مرزا غالب اور نواب شیفتہ کی صحبتوں نے ان کے فن کو مزید نکھار دیا۔ ان کی طبیعت اپنے دور کی فرسودہ شاعری سے اکتا چکی تھی اس لئے وہ قدیم روش سے ہٹ کر جدید شاعری کی طرف راغب ہوئے اور اردو شعراء کی صف میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ انہوں نے لاہور میں رہ کر ''انجمن پنجاب'' کے تحت برکھارت' نشاط امید' حُبّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف جیسی خوبصورت نظمیں کہیں۔

''انجمن پنجاب'' کے مناظموں کی ان نشستوں میں حالی کی نظموں کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اس داد و تحسین نے ان کے اندر شاعری کی اس نئی ڈگر پر خود اعتمادی کے ساتھ چلنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ ۱۸۷۵ء کے بعد حالؔی لاہور کو خیر باد کہ کر پھر دلی واپس آ گئے۔ مدّ و جزر اسلام' مناجات بیوہ اور چپ کی داد' جیسی نظمیں لکھیں جو ان کے انجمن پنجاب سے آگے کے شعری سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد چھوٹی بڑی نظمیں کہیں۔ ان کی عظیم الشان نظم ''مدّ و جزر اسلام'' جسے بعد میں ''مسدّس حالی'' کے نام سے دنیا نے جانا' نے تو اردو شاعری میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا۔

اردو شاعری پر ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس کے دامن میں عالم فطرت (اس میں فطرت کے داخلی اور خارجی دونوں پہلو شمار ہوتے ہیں) بالکل نایاب نہ سہی' بہت کمیاب ہیں۔ جب کے مغربی شاعری میں عالم فطرت ایک مستقل موضوع ہے۔ چنانچہ حالؔی اور ان کے گروہ نے اس کمی کو شعوری طور پر پورا کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ ابتدائی دور میں مناظر فطرت کے نقوش قلی قطب شاہ کی مثنیوں' میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان''، نظیر اکبرآبادی کی منظومات' انیس کے مرثیوں و دیگر شاعروں کے یہاں جابجا دکھائی دیتے ہیں جس کا تفصیلی تذکرہ گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔

حالی نے آزاد سے متاثر ہو کر منظر نگاری کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے بھی آزؔاد کی طرح فطرت کو برائے فطرت استعمال کیا اور اپنی بیشتر نظموں میں مناظر فطرت کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''برکھا رُت'' میں گرمی کی شدّت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے ؎

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار — اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
تھیں لومڑیاں زباں نکالے — اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
تھے شیر پڑے کچھار میں ست — گھڑیال تھے رود بار میں ست
بچّوں کا ہوا تھا حال بے حال — کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم — تھے پانی کو دیکھ کر تے مم مم [۲۷]

مندرجہ بالا اشعار میں کہساروں کا تپنا' جانداروں کا پیاس سے تڑپنا' آب دریا کا کھولنا 'باغ کا ویران ہونا' چھوٹے بچّوں اور عام انسانوں کی بے چینی اور لو کی گرمی جیسے عوامل کو بڑے ہی دلکش انداز میں برسات کے پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ جزیات نگاری سے واقعہ نگاری اور منظر نگاری کا وصف پیدا ہو گیا ہے۔

گرمی کی شدّت کے بعد برسات کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا ۔۔۔ اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آ گے آگے ۔۔۔ اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں ۔۔۔ جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت ۔۔۔ کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار ۔۔۔ دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو ۔۔۔ اور موڑ چنگھارتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک دل کو بھاتی ۔۔۔ گویا کہ ہر دل میں ہے بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے ۔۔۔ سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے ۲۸؎

مندرجہ بالا اشعار میں حالی نے برسات کا منظر نہایت سادہ اور صاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس میں کوئی چیز اجنبی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ یہ برسات ہندوستان کی ہے۔ کوئل کی کوک' پپیہے کی پیہو' مور کی جھنکار اور مینڈک کی آواز خالص ہندوستانی برسات کے منظر کو پیش کرتے ہیں۔ حالی کی برسات کی اس منظر کشی میں میر ''برسات کی شکایت'' اور ''برسات کا سفر'' کی سی سادگی بیان ہے' لیکن میر نے 'دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان' کہہ کر برسات کا بھیانک منظر پیش کیا ہے جب کہ حالی نے برسات کا بھرپور لطف اٹھایا ہے۔

جب موسم سرسبز و شاداب ہوتا ہے اور فصل لہلہاتی ہے تو جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ دلوں میں خوشی اور مسرت کے نغمے پھوٹتے ہیں۔ عجب کیف کا سا عالم ہر سو نظر آتا ہے۔ کچھ لڑکیاں باغوں میں جھولا ڈالتی ہیں۔ اس میں حالی کی منظر کشی کا نمونہ ملاحظہ کریں ؎

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن ۔۔۔ جن کے یہ ہیں کھیل کود کے دن

ہیں پھول رہی خوشی سے ساری   اور جھول رہی ہیں باری باری
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے   اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
اک جھولے سے گری ہے جا کر   سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر ۲۹

ایسی منظر کشی کی مثال حالی سے پہلے نظیر اکبرآبادی کے یہاں ملتی ہے۔ حالی نے اس نظم کے لئے بہت رواں بحر کا انتخاب نہیں کیا ہے لیکن اثر آفرینی قائم رہتی ہے۔

''حب وطن'' تیسری نظم ہے جو انجمن پنجاب کے مشاعرے کے لئے کہی گئی۔ حالی نے حب الوطنی کے سیاق وسباق میں اپنی دھرتی، اپنی مٹی، اور یہاں کے رواجوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس سے ان کی تہذیبی اور سماجی فکر کی بالیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ حالی باغ اور چمن، اجرام فلکی، ٹھنڈی ہواؤں، بلبلوں اور پہاڑوں کی دلکش فضا کو مخاطب کرتے ہوئے نظم ''حب وطن'' کا آغاز کرتے ہیں ۔

اے سپہر بریں کے سیارو
اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دل فریب فضا
اے لب جو کی ٹھنڈی ہوا ۳۰

مجموعی طور پر انجمن پنجاب کی تحریک نظم کے زیر اثر لکھی گئی یہ نظمیں جہاں حالی کے نئے رجحان کی نشاندہی کرتی ہیں وہیں منظر نگاری کے باب میں بھی قابل ذکر اضافہ ہیں۔ اس کے متعلق آل احمد سرور نے کچھ اس طرح لکھا ہے:

> ''برکھا رُت اور حبّ وطن سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راگ بالکل نیا تو نہ تھا، کیونکہ اس سے پہلے نظیر اکبرآبادی بھی یہ راگ الاپ چکے تھے، مگر ان کی آواز کسی نے بھی نہ سنی۔ حالؔی نے جب یہ نغمہ چھیڑا تو اس کا اثر ہوا، اور ان کی اور آزاد کی کوششوں سے مقامی رنگ، منظر نگاری و وطن کی محبت اردو شاعری میں اپنی بہار دکھانے لگی۔'' ۳۱

اسلوب احمد انصاری نے اپنے مضمون ''حالی، ادبی مجدّد کی حیثیت سے'' میں ان کی

نظموں کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ نظمیں جدید اردو شاعری کے خدوخال کو متعین کرتی ہیں، یہ نظمیں نیچرل شاعری کے ضمن میں آتی ہیں کیونکہ ان میں منظر نگاری بھی ہے اور عام انسانی جذبات اور معاملات کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ان میں ہندوستانی زندگی اور معاشرت کی بو باس بھی ہے۔'' ۳۲

پروفیسر نذیر احمد اپنی کتاب ''الطاف حسین حالی: تحقیقی و تنقیدی جائزے'' میں حالی کو ایک ٹرینڈ سیٹر کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جس طرح دلّی کے اجڑتے ہوئے لال قلعے میں بیٹھ کر ظفر، ذوق اور داغ نے اردو کو فارسیت کی چھتر چھایا سے نکال کر اس میں اردو پن کی روح پھونکی تھی اور اسے شاعرانہ اظہار کا ایک موثر ذریعہ بنایا تھا اسی طرح حالی نے مثنوی کو عشقیہ داستانوں اور ہجویات کے جنجال سے نکال کر نظریاتی وابستگی کے اس تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا جس کی روشن مثالیں ہمیں آگے چل کر اقبال اور اس کے بعد بعض ترقی پسند شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔'' ۳۳

''انجمن پنجاب'' کے دیگر منظر نگار شعرا

''انجمن پنجاب'' کی اس تحریک کے روح رواں محمد حسین حالی اور آزاد تھے۔ انہوں نے اس کے تحت فطری منظر نگاری سے لبریز بہت سی خوبصورت نظمیں کہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی شعراء حضرات تھے جنہوں نے اپنے کلام میں مناظر فطرت کی عکاسی بڑی فنکارانہ چابکدستی سے کی ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو شعر و ادب کے قیمتی سرمائے میں قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔

انجمن پنجاب کے پہلے مشاعرے میں مولوی الطاف علی جو گورنمنٹ گزٹ کے اردو مترجم تھے، نے اپنی نظم 'آب کرم'' پڑھی۔ اس نظم کی بھی بہت تعریف ہوئی۔

رسالہ انجمن پنجاب کا ضمیمہ بابت نومبر، دسمبر ٦ (چھ) میں ایک شاعر مولوی عمر جان ولی مدرس مدرسہ فیروز پور جھر کہ کی ہے جو برسات سے متعلق ہے۔ برسات کے متعلق یہ نظم بڑی خوبصورت ہے اور اس میں منظر نگاری اپنے عروج پر ہے۔ پہلے گرمی کا عالم اور اس کی کیفیات' برسات کی آمد کے آثار' گھٹاؤں کا جھوم کر چھا جانا' ٹھنڈی ہوا کا چلنا' بارش کی بہار' برسات کے رات کی حسین منظر کشی' اندھیرے میں جگنوؤں کی چمک' دریا کا جوش پر آنا' دوستوں کا سیر و تفریح کے لئے نکلنا' برساتی پکوان اور دوستوں کا چھین جھپٹ کر کھانا' آموں کی خوشبو کے ساتھ خس کے عطر کی خوشبو' باغوں کے جھولے' غرض برسات کی مختلف کیفیات کی بڑی حسین عکاسی کی ہے۔ اس میں تشبیہ و استعارات میں توازن' تصور اور تخیل میں حسن' طرز بیان کی صفائی' جوش اور سادگی سے عجب لطف کا احساس ہوتا ہے۔

نظم برسات کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

جگنوؤں سے وہ چراغاں جابجا نور انجم ماند جس نے کر دیا

ابر نے جب ہند میں دی یہ خبر سیر کرنے کو اٹھا یاں ہر بشر

پہنچا سبزہ زار میں کوئی گروہ کوئی ٹولی چڑھ گئی بالائے کوہ

کوئی دلدادہ زمیں کی شان پر کوئی شیدا ابر کے ہر آن پر

کشتیوں میں بیٹھ دو دو چار چار دیکھتے پھرتے ہیں دریا کی بہار

برق کی آنکھوں میں جو پڑتی چمک کوئی چلتے چلتے جاتا تھا جھجھک

زور سے جب رعد کی ہوئی کڑک بیٹھ جاتا ہنس کے کوئی یک بیک

باغ تک یوں کھلتے ہنستے گئے چہچہے کرتے لگاتے قہقہے

پک رہے تھے پہلے ہی یاں اندر سے اور آموں کے دھرے تھے ٹوکرے

چھین کر ایک ایک منہ میں رکھ گیا گرم تھا ہونٹوں پر چھالا پڑ گیا [۳۴]

انجمن پنجاب کے دوسرے مشاعرے میں غلام نبی اصغر نے ایک مثنوی بعنوان 'زمستان' پڑھی جو کہ اٹھائیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں موسم سرما کی تعریف کی گئی ہے جسے فطری منظر نگاری کے باب میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اس کلام میں نظیر اکبر

آبادی کے کلام کی جھلک نمایاں ہے۔نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

دکھاتی ہے بس چاندنی بھی بہار　　ستارے بھی ہوتے ہیں گوہر نثار
جدھر دیکھو عالم ہے اک سیر کا　　کہاں لطف یہ موسم غیر کا
کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہے چلتی ہوا　　کہیں برف پڑتی ہے بس خوشنما
گلے سے لپٹ کر جو سوتے ہیں دو　　تو از بسکہ محفوظ ہوتے ہیں وہ
دوشالہ کوئی اوڑھے کوئی لحا ف　　کوئی پہنے زر بفت صاحب کفاف
کوئی پہنے سنجاف کوئی سمور　　کہیں کوئی نادار تاپے تنور
ہے سرما کا اصغر یہ فیض عام　　کہ خوش اس میں رہتے ہیں ہر خاص و عام۳۵

اس مشاعرے کا حال دتاسی نے ''پنجابی'' کے حوالے سے یوں لکھا ہے:

''اس مشاعرے میں دس یا بارہ شعرا ایسے بھی تھے جن کو پہلی بار کلام سنانے کا موقع ملا تھا۔ان کے اشعار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلی اور پنجاب کے شعراء ایسے بھی تھے جن کو پہلی بار کلام سنانے کا موقع ملا تھا۔ان کے اشعار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلّی اور پنجاب کے شعراء ناظم صاحب تعلیمات کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ گئے اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی دو تین مجلسوں کے بعد وہ شراب اور ساقی کا ذکر ترک کر دیں گے اور منظر قدرت کی تصویر کھینچیں گے۔''۳۶

انجمن کے پانچویں مشاعرے میں شیخ الٰہی بخش رفیق نے ایک سو ستائیس اشعار کی مثنوی پڑھی۔ یہ مثنوی اس مشاعرے کے عنوان کے مطابق 'امن' کی ترجمان ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ نظم سادگی اور پرکاری کی عمدہ مثال ہے۔اس میں نئے خیالات، نئی تشبیہیں و استعارے استعمال کئے گئے ہیں اور خاص طور پر منظر کشی قابل مطالعہ ہے ؎

کسی پہلے ہی زمانے میں طبع شیر سحر　　صفحۂ چرخ پہ وہ کھنچ گئی تصویر سحر
رنگ سرخ حور سحر دیکھ وہ چمکاتی ہے　　آئینہ مہر درخشاں کا لئے آتی ہے
دونوں ہاتھوں سے وہ کافور اڑاتی آئی　　امن کا رنگ ہی عالم میں جماتی آئی

گل و گلزار پہ عالم وہ دل افروزی کا رنگ بگڑا ہوا وہ گنبد فیروزی کا
چارسو پھرسے گلستاں میں صبا جاتی تھی کان تک پاؤں کی آہٹ مگر جاتی تھی
جھومتی ناز سے باد سحر آتی تھی ایسا کان میں ہر گل کے سنا جاتی تھی ۳۷

انجمن پنجاب کے چھٹے مشاعرے میں مولوی فصیح الدین صاحب رنج نے ۴۵ اشعار پر مبنی قصیدہ پڑھا جس میں ذوقؔ کے قصیدے کا ردیف قافیہ استعمال کرنے کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے ابتدائی ۱۹ اشعار میں موسم بہار پر ہیں جس میں منظر کشی پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ قصیدے کی مناسبت سے عربی اور فارسی کے الفاظ جابجا استعمال کئے گئے ہیں لیکن کلام میں روانی نہیں ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں جو فطری منظر نگاری کی عکاسی کرتے ہیں ؎

دیا ہے رحمت باری نے ابر کو یہ فیض کہ بن گیا ہے گل تازہ شعلہ گل خن
چلا ہے ابر ہر ایک سمت سے لئے باگیں جہاں میں سرد ہواؤں کے گرم ہیں تو سن
گھرا ہوا ہے جو ابر بہار صورت شام ہر ایک شاخ ہے گل کی فتیلۂ روشن
گھٹا جو اودی سی با آب و تاب چھائی ہے نگاہ کہتی ہے پھولی ہے چرخ پر سوسن ۳۸

انجمن کے ساتویں مشاعرے میں الٰہی بخش رفیق نے ایک سو سات اشعار کی مثنوی پیش کی۔ اس میں انہوں نے منظر نگاری کو استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ایک ایسے باغ کا نقشہ پیش کیا ہے جو نہایت حسین ہے۔ اس مثنوی میں قدیم و جدید خیالات کا تصادم نظر آتا ہے۔ مشکل الفاظ کم ہیں اور انداز بیان سہل ہے۔ اس میں باغ کا منظر کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے ؎

تھیں ہر ایک سمت کو نہریں کئی جاری اس جا جن سے قدرت کی اک سبز تھی کیاری اس جا
سبزۂ خلد بریں یا اتر آیا تھا وہاں مخمل سبز کا اک فرش بچھایا تھا وہاں
سرد جھونکا جو ہوا کا کبھی آجاتا تھا خود بخود دیکھ کے دل سبزے کو لہراتا تھا ۳۹

انجمن کے آٹھویں مشاعرے میں شیخ الٰہی بخش رفیق نے ایک سو ستائیس (۱۲۷) اشعار کی مثنوی سنائی جس کی ابتدا منظر نگاری سے کی۔ اس میں رات کے سماں اور صبح کی صباحت کو بڑے ہی دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے کلام میں سطحیت تو نہیں ہے لیکن فکر کا

عنصر کم پایا جاتا ہے۔ زبان و بیان میں روانی اور برجستگی ہے۔ اس مشاعرے میں پہلی بار متروک لفظ 'آئیاں' کا استعمال ہوا ہے

شبنم نے جو دھویا رخ پر نور سحر نے　　دامن کو بھرا موتیوں سے سبزۂ تر نے
جھولے میں صبا گل کو جھلاتی ہوئی آئی　　اطفال کے غنچوں کو کھلاتی ہوئی آئی
مستی میں وہ یکبارگی سب 'آئیاں' شاخیں　　اور باغ میں لینے لگی انگڑائیاں شاخیں ۹۸

انجمن پنجاب کا نواں مشاعرہ ''تہذیب'' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اس میں حیدر اصغر علی حقیر لکھنوی کی ۱۰۴ اشعار پر مشتمل غیر مطبوعہ مثنوی قابل ذکر ہے۔ اس میں حقیر صاحب نے تمہید میں صبح کے منظر کو پیش کیا ہے لیکن اس کی تفصیلات فراہم نہیں ہو سکی۔

دسواں مشاعرہ 'اخلاق' کے عنوان سے تھا جس کے کوائف دستیاب نہ ہو سکے۔ شعرا میں صرف دو نام ہیں فیض اور آزاد ''انجمن پنجاب'' کی اس تحریک نے جہاں جدید اردو شاعری کی بنیاد رکھی اور اس کے لئے ایک موافق ماحول تیار کیا وہیں منظر نگاری کے باب میں بھی ایک قابل ذکر اضافہ کیا۔ انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی متعدد نظموں میں فطرت کی حسین منظر نگاری دیکھنے کو ملتی ہے۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ تحریک ''انجمن پنجاب'' نے جہاں اردو شاعری کو ایک نئی سمت عطا کی وہیں فطرت نگاری کو بھی اپنے اصلی خط وخال میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سے قبل کی منظر نگاری میں شعرا حضرات تصوراتی مناظر کی عکاسی کیا کرتے تھے یا پھر وہ ایسے منظر کو پیش کرتے تھے جسے کبھی ان کی آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ موضوعاتی مناظموں کے اس دور کو منظری شاعری کا ''سنہرا دور'' کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس دور میں مختلف شعراء نے مناظر قدرت وفطرت کو موضوع بنا کر بہت سی خوبصورت نظمیں کہی ہیں جن میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔

انجمن پنجاب کی اس تحریک نے ایک طرف جہاں اردو ادب وشاعری کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے وہیں دوسری طرف یہ انجمن قومی یکجہتی کی بھی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اس کے تحت جتنی بھی محفلوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا اس میں سبھی مذہب وملت کے

لوگ برابری سے شریک ہوا کرتے تھے۔ اس دور میں اردو زبان سب کی زبان تھی۔ آج کی طرح اسے کسی خاص فرقے تک مخصوص نہیں کیا جاتا تھا۔

آزاد کی نظموں کو نیچرل شاعری کا نام دیا گیا ہے اور انجمن پنجاب کی شعری تحریک کو نیچرل شاعری کی تحریک سے یاد کیا جاتا ہے۔ نظم جدید کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ آزاد اور حالی نے انجمن پنجاب کے موضوعی مشاعروں میں مناظر فطرت پر نظمیں پڑھیں۔ آزاد نے اپنی بیشتر نظموں میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کی ہے اور ایسا کرتے ہوئے انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر انیس اور نظیر کی روایات کو آگے بڑھایا ہے اور ساتھ ہی انگریزی شاعروں کی منظری نظموں کی کسی نہ کسی حد تک پیروی بھی کی ہے۔ آزاد کی منظر نگاری میں فطری حسن اور سادگی دکھائی دیتی ہے۔

آزاد نے خارجی مناظر کی تصویر کشی خارجی انداز سے کرتے ہیں۔ انگریزی کے فطرت پرست شعرا مثلاً ورڈسورتھ منظر کشی کرتے ہوئے اس ازلی رشتے کو نظر انداز نہیں کرتا جو شاعر کی داخلی شخصیت اور فطرت کے درمیان قائم ہے۔ آزاد مناظر فطرت کی مصوری کرتے وقت کسی جذباتی رد عمل کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ خارجی نوعیت کی یہ منظر نگاری شاعر کے احساس جمال اور شعور فن کی بہترین غماز ہیں۔ کچھ نظموں میں چھوٹی چھوٹی تصویریں پیش کر کے وہ مرکزی خیال کے مختلف، خدوخال واضح کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً شب قدر کا مرکزی خیال رات کی مرقع نگاری ہے۔ آزاد نے اس میں مزدور' امیر زادے' ملا' طالب علم' نجومی' شاعر' جہاز ران' بچہ وغیرہ کی رات کے لمحوں کا بیان ایک خارجی ناظر کے انداز میں کیا ہے۔

انجمن پنجاب سے نیچرل شاعری کی جو تحریک اٹھی اسے ہم اس معنی میں رومانوی بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مضامین فطرت کو نظم میں پیش کرنے پر زور دیا۔ ان مشاعروں کی رودادوں سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر آزاد اور حالی ان کی رونق تھے۔ لیکن آزاد اور حالی کے ساتھ اگر ہم مولانا شبلی نعمانی' اکبر الہ آبادی' اسمٰعیل میرٹھی' شوق قدوائی' نظم طباطبائی بے نظیر شاہ اور ان کے بعض دوسرے ہم عصروں کا تذکرہ نہ کریں تو ستم ظریفی ہوگی۔ کیونکہ ان

شعرائے کرام نے بھی لاہور سے اٹھنے والی اس تحریک کو اپنایا اور حتی المقدور اس کی اپنے اپنے انداز میں عملی طور پر پیروی کرنے کی بھی کوشش کی۔

انجمن پنجاب کے مشاعروں کے تحت دیگر شعرا کے علاوہ حالی اور آزاد نے جو نظمیں پڑھیں وہ اردو شاعری کے ایک نئے موڑ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ان کے موضوعات نئے ہیں اوران میں ایک نیا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ ایک نئے شعور کی ترجمان ہیں۔ یہ ایک نئے انداز واسلوب کی حامل ہیں۔ان کی ہیئت بھی نئی ہے اور سب سے بڑی بات کہ منظر نگاری کے معاملے میں انہیں سنگ میل کا مرتبہ حاصل ہے۔

محمد حسین آزاد کو ایک کامیاب نثر نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے کیونکہ طبعا وہ شاعر نہیں تھے اس لئے ان کی شاعری میں اکثر ناہمواری پائی جاتی ہے۔آزاد کو اس امر کا خود بھی احساس تھا۔لکھتے ہیں:

''میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ،
مگر سادہ لوحی دیکھو، ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں''[۱۴]

فطری منظر نگاری کے معاملے میں حالی کا مقام زیادہ نمایاں ہے کیونکہ حالی بیک وقت نثر و نظم دونوں کے مرد میدان تھے جن کا بین ثبوت انکی مشہور زمانہ تصنیف ''مسدس حالی''، ''یادگار غالب'' اور دیگر تصانیف ہیں۔

'انجمن پنجاب' کی اس تحریک کی داغ بیل تو آزاد نے ڈالی لیکن اس روایت کو آگے بڑھانے کا اہم کام حالی نے کیا۔حالی نے شعر کی تین خصوصیات سادگی، اصلیت اور جوش پر کافی زور دیا اور منظر نگاری سے بھرپور اپنی کئی نظمیں مثلاً برکھارت، نشاط امید، رحم وانصاف، حب وطن ان مشاعروں میں پڑھیں۔ حالی نے سادگی، اصلیت اور جوش کو اہمیت اس لئے دی ہے کیونکہ وہ اردو نظم کو مبالغے، جھوٹ اور بے کیفی سے دور رکھنا چاہتے تھے۔حالی نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ شاعر کا تخیل بلند ہو، وہ مطالعہ کائنات کو اپنی عادت بنائے اور لفظوں کا نبض شناس بھی ہو۔ان کی نظموں میں ربط وتسلسل، خیال کی وحدت، اور خارجیت وداخلیت کا امتزاج بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی اپنی کتاب ''لاہور میں اردو شاعری کی روایت'' کے پیش لفظ میں ''انجمن پنجاب'' کے تحت رونما ہونے والے مناظموں کی اس غیر معمولی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اردو شاعری کے مزاج کو بدلنے میں انجمن اشاعت مطالب مفید (انجمن پنجاب) کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ڈاکٹر ولیم لائیٹنر کی صدارت میں یہ انجمن ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی۔ بابو نوبین رائے اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔انجمن کی پابندی سے ادبی نشستیں ہوتی تھیں جن میں علمی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر گفتگو کی جاتی۔انجمن کے مشاعرے ہوتے لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار مصرع طرح دینے کے بجائے نظم کا موضوع دیا جاتا۔مولانا آزاد اور حالی کی وہ نظمیں انہیں مشاعروں میں پڑھی گئیں جن کے اردو شاعری پر دوررس نتائج مرتب ہوئے۔انجمن کے مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں میں حقیقت نگاری سے کام لیا جاتا، حب الوطنی کو موضوع سخن بنایا جاتا فطرت کے حسن اور زندگی کے عام مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا جاتا۔''[۴۲]

آزاد ایک جانباز سپاہی کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور خلوص اور دیانت داری کے ساتھ جدید شاعری کا بیج عوام کے دلوں میں بوتے رہے۔آزاد کے لئے سب سے بڑی معاونت حالی کی تھی لیکن وہ بھی مشاعرے کے آغاز کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۷۵ء کے شروع میں واپس دہلی چلے گئے۔

آزاد اور جدید شاعری لازم و ملزوم ہے۔آزاد نے جدید اردو شاعری کے سلسلے میں جو پہلا خطبہ دیا اور کرنل ہالرائیڈ نے جدید شاعری کی حمایت اور تقریر کی تائید میں جو کچھ کہا اس سے تبسم کاشمیری نے جدید شاعری کے جو بنیادی رجحانات اخذ کئے ان میں ایک اہم رجحان منظری شاعری کا ہے۔رقمطراز ہیں:

''شاعر مظاہر فطرت کو اس طور بیان کرے کہ انسان کو خدا کی عظمت کا احساس ہو جائے۔ ہالرائیڈ ان شعری تصورات کی تشکیل میں ورڈسورتھ

سے خاص متاثر معلوم ہوتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ ہالرائیڈ نے انجمن پنجاب کے ان مشاعروں کو آگے بڑھانے میں کافی حصہ لیا اور انجمن کے لئے شعری تصورات کی اشاعت میں دلچسپی لی۔''[۴۳]

معروف تخلیق کار اور ''جدید اردو شاعری میں علامت نگاری'' کے مصنف تبسم کاشمیری کا کہنا ہے کہ سرسید بھی شاعری میں شدّت کے ساتھ حقیقت و واقعیت کے قائل تھے اور شاعری کو نیچر سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔اس لئے انجمن پنجاب کے مشاعروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے مقالات سرسید میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

''یہ بات سچ ہے کہ ہمارے باعث افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہونچنے کے لئے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہمسر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔مگر ان مثنویوں کو دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے''[۴۴]

❁ ❁ ❁

حواشی

۱۔ تاریخ پنجاب، اقبال صلاح الدین، مطبوعہ عزیز پبلی شرز لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۵۸۲

۲۔ قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد اوّل، حصہ اوّل، مرتبہ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء، ص ۳۵

۳۔ بحوالہ صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ص ۴

۴۔ انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات، ڈاکٹر صفیہ بانو، مطبوعہ کفایت اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۵

۵۔ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۸ء، ص ۳۶۹

۶۔ مجموعہ نظم حالی، ابتدائیہ، حالی کی کہانی حالی کی زبانی، مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۳۲ء، ص ۷

۷۔ نظم آزاد (دیباچہ) مولانا محمد حسین آزاد، ص ۲۰

۸۔ نظم آزاد، لکچر آزاد، محمد حسین آزاد، ص ۳۱

فٹ نوٹ: گرچہ اردو شاعری میں نظم کی روایت اسی قدر قدیم ہے جتنی اردو شاعری۔قدماء میں،

دکنی دور میں موضوعاتی نظموں کے نمونے ملتے ہیں۔ میر و سودا، میر حسن، انیس، دبیر، نسیم، مرزا شوق اور دیگر شعرا کے یہاں مثنویوں اور مرثیوں سے موضوعاتی ن' موں کو اقتباس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ موجودہ دور کی فطری شاعری کی ابتدا آزاد اور حالی سے ہوتی ہے لیکن اس کے پیشرو نظیر اکبر آبادی کہے جا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظیر اکبر آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں جدید اردو شاعری کے تخم کوٹ کوٹ کر موجود ہیں۔

۹۔ منشورات، برج موہن دتا ترای کیفی، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰، ص ۲۶

۱۰۔ ماخوذ: آب حیات کی حمایت اور دوسرے مضامین، ڈاکٹر محمد صادق، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۶۰

فٹ نوٹ: جناب عبداللہ قریشی نے۔

۱۱۔ انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات، ڈاکٹر صفیہ بانو، ص ۳۳۴۔۳۳۶

فٹ نوٹ، ڈاکٹر صفیہ بانو نے انجمن پنجاب۔

۱۲۔ لاہور کا دبستان شاعری، ڈاکٹر علی محمد خان، ص ۱۳۹

فٹ نوٹ: دسویں اور آخری مشاعرے کے سلسلے میں۔

۱۳۔ یادگار حالی، صالحہ عابد حسین، مطبوعہ آئینہ ادب، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۹

۱۴۔ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، مطبوعہ علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۶۹

۱۵۔ مجموعہ نظم آزاد، دیباچہ، سید ممتاز علی، ص ۷

۱۶۔ جدید نظم: حالی سے میرا جی تک، ڈاکٹر کوثر مظہری، ص ۸۴

۱۷۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ص ۱۵۵

۱۸۔ محمد حسین آزاد: احوال و آثار، ڈاکٹر محمد صادق، ص ۱۱۱

۱۹۔ مجموعہ نظم آزاد، محمد حسین آزاد، ص ۳۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۸۔۳۹

۲۱۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص ۲۳

۲۲۔ مجموعہ نظم آزاد، محمد حسین آزاد، ص ۹۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۲۴۔ جدید نظم: حالی سے میرا جی تک، کوثر مظہری، ص ۸۶

۲۵۔ انجمن پنجاب: صفیہ بانو، ص ۳۵۰
۲۶۔ دیوان حالی، برکھارت، ص ۴۵۔۴۶
۲۷۔ ایضاً، ۴۸۔۴۹
۲۸۔ جدید نظم: حالی سے میرا جی تک، کوثر مظہری، ص ۷۰
۲۹۔ ایضاً، ص ۷۲
۳۰۔ ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ، ماخوذ، تنقیدی اشارے، ص ۹۰
بحوالہ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، حامدی کاشمیری، ص ۱۳۰
۳۱۔ نقش کراچی، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۹۸
بحوالہ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، حامدی کاشمیری، ص ۱۰۹
۳۲۔ الطاف حسین حالی: تحقیقی وتنقیدی جائزے، پروفیسر نذیر احمد، ص ۲۶۱
۳۳۔ انجمن پنجاب: تاریخ و خدمات، ڈاکٹر صفیہ بانو، ص ۲۴۰
۳۴۔ ایضاً، ص ۲۴۵
۳۵۔ مقالات گارساں دتاسی، محولہ بالا حصہ دوم، ص ۳۱۔۳۲
۳۶۔ انجمن پنجاب: ڈاکٹر صفیہ بانو، ص ۲۹۱
۳۷۔ ایضاً، ص ۳۰۱
۳۸۔ ایضاً، ص ۳۲۱
۳۹۔ ایضاً، ص ۳۴۲
۴۰۔ محمد حسین آزاد: احوال و آثار، ڈاکٹر محمد صادق، ص ۱۲۲
۴۱۔ لاہور میں اردو شاعری کی روایت، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ص ۹
۴۲۔ ایضاً، ص ۶۹
۴۳۔ مقالات سرسیّد، ص ۵۱

❁ ❁ ❁

باب چہارم

آزادی سے قبل کا دَور

آزادی سے قبل اردو نظم

۱۸۵۷ کی انقلابی جدوجہد کی ناکامی نے ہندوستانیوں کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ ملک پر حکومت برطانیہ کا تسلّط مکمل طور پر قائم ہو گیا۔ بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ لہٰذا ادب میں بھی ان تبدیلیوں کا آنا ناگزیر ہوا۔ ادب کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور اردو شاعری میں نظم نگاری کی تحریک ایسی ہی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔

سرسید تحریک سے متاثر ہو کر آزاد اور حالی اس جانب متوجہ ہوئے اور اردو میں باقاعدہ شعوری طور پر ''جدید نظم نگاری'' کی ابتدا ہوئی۔ ان کے ذریعے شروع کی گئی نیچرل شاعری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ویسے جہاں تک اردو نظموں کی جدید روایت کا تعلق ہے' اس کی ابتدا نظیر اکبرآبادی سے ہوتی ہے۔ اپنی نظم نگاری کے ذریعے نظیر نے عوامی اور جمہوری شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے نظم کو ایک مستقل صنف کی حیثیت سے اردو شاعری میں پہلی بار روشناس کرایا۔

جدید اردو نظم عظیم شاعر و فلسفی علامہ اقبال کے ہاتھوں معراج کمال کو پہنچی۔ اقبال نے اپنے تفکرانہ پیغام' حکیمانہ بصیرت اور منفرد انداز بیان کے سہارے اردو نظم نگاری کے معیار کو انتہائی بلندیوں پر پہنچایا اور اسے نئی جہتوں اور بے پناہ وسعتوں سے آشنا کیا۔ اقبال نے اردو نظم نگاری کو معنوی وقار اور ظاہری حسن عطا کر کے اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی نظموں کے روبرو لا کھڑا کیا۔

آل احمد سرور نے اقبال کی شاعری کو حالی کی شاعری کی توسیع قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

''درحقیقت اقبال کی شاعری حالی کی شاعری کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔'' [۱]

اقبال کی شاعری کے زیر اثر شعراء کی پوری ایک نسل نظم نگاری کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ جس میں خاص طور پر جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، سیماب اکبرآبادی، تلوک چند محروم، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

جوش ملیح آبادی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ وہ حالی اور آزاد کی نظم نگاری کی تحریک اور ترقی پسند تحریک کے بیچ کی بہت ہی اہم کڑی ہیں جو دونوں تحریکوں کو جوڑنے کا کام انجام دیتی ہے۔ جوش کو جہاں شاعر فطرت کہا جاتا ہے وہیں بجا طور پر شاعر انقلاب، شاعر شباب اور شاعر رومان بھی کہا جاتا ہے۔ سردار جعفری نے جوش سے متعلق کہا ہے:

''جوش سو فیصدی رومانی شاعر ہیں اور ان کے انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے۔'' [۲]

اختر شیرانی کو شاعر رومان کہا جاتا ہے۔ انہوں نے یوں تو کئی سیاسی اور اصلاحی نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کا خاص موضوع ''حسن و عشق'' رہا ہے۔ اختر شیرانی کی ایک خصوصیت ''سانیٹ'' کا تجربہ بھی ہے لیکن اس ہیئت کو اردو نظم میں اتنی مقبولیت نہیں ملی۔

اسی دور کے شعرا میں ایک اہم نام حفیظ جالندھری کا ہے جنہوں نے اپنی نظموں میں گیت کا آہنگ پیدا کیا۔ چھوٹی اور مترنم بحروں کے استعمال کے علاوہ بندوں کی نئی ترتیب پیش کی جو جذبے کے اتار چڑھاؤ کی پابند ہے۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو نیچرل شاعری کی تحریک سے لے کر ۱۹۳۵ء تک کا عرصہ اردو نظم کی تشکیل کا دور ہے۔ اس دوران نظم اس قابل بنی کہ اس کی علاحدہ صنفی حیثیت قائم ہو سکے اور اس میں زندگی کے متنوع تجربات پیش کئے جا سکیں۔ اس عرصے میں نظم کی خارجی حیثیت میں بھی کافی تجربے کئے گئے۔ محمد حسین آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کی غیر مقفی نظموں نے بیسویں صدی کے اوائل میں نظم معریٰ کی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اسی پس منظر میں ۱۹۳۵ء کی نسل سامنے آتی ہے جو کہ ترقی پسند تحریک کا دور ہے اور جسے اردو ادب کی ایک بڑی تحریک کا نام دیا گیا۔ اس باب میں ترقی پسند، غیر ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق کے تحت پیش کی گئی نظموں میں مناظر فطرت کے نمونوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ترقی پسند تحریک سے قبل کی نظموں میں مناظر فطرت

نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰ء): اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا نام ولی محمد اور تخلص نظیر ہے۔ آگرہ میں پیدا ہوئے اور والدین کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ بچپن اور جوانی کا ابتدائی حصّہ بہت ہی خوشی اور مسرت میں گزرا۔ ناز ونعم اور فارغ البالی نے انہیں بالکل آزاد بنا رکھا تھا۔

نظیر اکبر آبادی اپنی ذاتی زندگی، اپنے شاعرانہ اسلوب اور اپنے منفرد فکر وفن کے لحاظ سے ایک سچے ہندوستانی اور محبّ وطن شاعر ہیں۔ وہ فطرتاً انتہائی وسیع المشرب اور سیکولر مزاج کے حامل ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان کی آب وہوا میں پیدا ہوئی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ وہ عوام کے احساسات کے حامل ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے یہاں عید و بقرعید کی طرح ہولی اور دیوالی کے بھی چرچے ملتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی موسم، یہاں کے پھل پھول اور قدرتی مناظر کی بھی عکاسی ان کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی اس زمانے میں پیدا ہوئے جب حقیقت نگاری اور فطرت پرستی کی داد دینے والوں کا قحط سا تھا۔ آسمان سے تارے اتارنے پر فخر کیا جاتا تھا۔ فارسیت غالب تھی۔ تشبیہ واستعارہ کی پیچیدگیوں سے مرتبہ کمال کا اندازہ لگایا جاتا تھا اور زبان کے چٹخارے پر جان دی جاتی تھی۔

نظیر کی شاعری کی نشوونما بھی ایک ایسے پرآشوب دور میں ہوئی جب مغلیہ حکومت کے

چراغ کی لو مدھم ہو رہی تھی اور ہر طرف طوائف الملو کی کا بول بالا تھا۔ ایسے دگر گوں حالات میں نظیر کی شاعری پروان چڑھی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ایسے پُر آشوب ماحول میں زندگی گزارنے کے باوجود انھوں نے رجائیت کے گیت گائے۔ انہوں نے خود بھی زندگی کے مزے لئے اور دوسروں کو بھی زندگی کی تمام تر خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دی۔ نیز انہوں نے فطرت کی طرف بھی اپنی نظموں میں کافی توجہ دی ہے اور اس سے خود بھی لطف اندوز ہوئے ہیں اور دوسروں کی لئے لطف اندوزی کا خوب خوب سامان فراہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں سید طلعت حسین نقوی لکھتے ہیں:

> ''ان کی نظر ہمیشہ زندگی کے روشن پہلوؤں پر پڑتی ہے اور وہ اپنے ماحول سے زیادہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر فطرت کی رنگینیوں اور موسمی کیفیتوں کی طرف نظیر متوجہ ہوتے ہیں تو ہر شئے ان کو عیش و عشرت کا سامان فراہم کرتی ہے۔''[۳]

نظیر اکبر آبادی جشن زندگی کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ ان کی جمالیات کے دائرے میں انسان' اس کی تہذیبی اور تمدنی زندگی' مناظرِ حسن و جمال' مظاہر کائنات' رقص حیات' قہقہے اور مختلف قسم کی آوازوں کا آہنگ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ اردو ادب میں جشن زندگی کے اس بڑے شاعر کے مزاج اور رجحان کا اندازہ مندرجہ ذیل نظموں کے عنوان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

بہار' چاندنی' برسات کا تماشا' برسات کی بہاریں' جاڑے کی بہاریں' شب برات' عید' عید الفطر' بسنت' ہولی' دیوالی' راکھی' بلدیو جی کا میلہ' کبوتر بازی وغیرہ۔

نظیر کی پوری شاعری ہندوستانی فضا میں سانس لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ فطرت برائے فطرت کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں مناظر و مظاہر کائنات کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ برسات کی بہاریں' جاڑوں کی سختیاں' اور بسنت کی دل آوازیاں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی نظموں میں بلبلیں لڑائی جاتی ہیں اور ریچھ بھی نچائے جاتے ہیں۔ غرض انہوں نے انسانی زندگی کے ہر رخ کو بہت قریب سے دیکھا اور اپنے

کلام میں برتا ہے۔

انھوں نے ہندوستان کے مخصوص موسموں اور موسمی کیفیات مثلاً برسات' جاڑا' بسنت اور گرمی وغیرہ پر نظمیں لکھ کر خاص ہندوستانی شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ روز وشب اور صبح وشام کی جلوہ گری کا پہلو بہ پہلو ذکر' جن میں آندھی اور اندھیرے' چاندنی وسحر اور قدرت کے نت نئے جلوے ان کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ نظیر موسموں کے جلوس کے نظارے کے بھی شیدائی ہیں۔ اس جلوس میں جاڑا' گلابی جاڑا یعنی بسنت رُت' گرمی' اومس' برسات' ایک کے بعد ایک گویا سارے ارضی وسماوی تغیرات وسارے تنوعات ان کو متاثر کرتے ہیں۔

نظیر کے یہاں موسم سے متعلق ساری نظموں میں رُت کی سچی علامتوں اور موسمی کیفیات کا گہرا شعور موجود ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''جاڑے کی بہاریں'' میں موسم کی حالت پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی ہے جس میں جاڑے کی ہو بہو تصویر اتار کر رکھ دی ہے۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا بھی' برف پگھلتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا خم ٹھوک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو' دل سے ہوتی ہو کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو' بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھبو ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
کلّے پہ کلّہ لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکّی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی[18]

دوسرے بند میں دو لفظوں 'ہنس ہنس' سے شاعر نے جاڑے کی انتہائی تکلیف کو ظاہر کیا ہے نیز تھر تھر کا زور' بتیسی بجنا' پھبو ہو ہو ہو' سی سی' کلّے پہ کلّہ لگنا اور دانتوں کے چنے سے دلنا ایسی کیفیات ہیں جن سے سردی کے موسم میں ہر فرد بشر دوچار ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں تمکین کاظمی کا یہ قول قابل ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

''مناظر قدرت نظیر کو اس قدر پسند آتے ہیں کے چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی ذکر دل کھول کر کرتے ہیں۔ جاڑے پر بہت کم شعرا نے گل فشانی کی ہے۔ اپنی مفلسی کا رونا روتے ہوئے کبھی جاڑے کا ذکر آ گیا تو دو آنسو جاڑے پر بھی بہائے گئے ہیں۔ مگر نظیر نے ایک مستقل نظم جاڑے پر کہی ہے اور اس سے بہتر جاڑے کی تصویر آپ کہیں نہیں دیکھیں گے۔'' [۵]

نظم ''اومس'' بھی نظیر کی ایک موسمی نظم ہے جسے صرف ہندوستان کا فطری شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ اس نظم میں ''اومس'' کی کیفیت اور اس سے پہنچنے والی مختلف قسم کی اذیتوں کا ذکر نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

بدلی کے جو گھر آنے سے ہوتی ہے ہوا بند
پھر بند سی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند
چھینکے کوئی پگڑی کوئی کھولے ہے کھڑا بند
دم رک کے گھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند
برسات کے موسم میں پنٹ زہر ہے اومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس [۶]

اس نظم میں نظیر نے اومس کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ نظم پڑھتے پڑھتے اومس کی کیفیت طبیعت پر طاری ہو جاتی ہے اور برسات کے زمانے کی سڑی ہوئی گرمی کا منظر نظر کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

انہوں نے گرمی اور اومس کے علاوہ برسات کی کیفیات کا بھی ذکر اپنی نظموں میں بخوبی کیا ہے۔ ان کے کلام میں برسات' اس کا سماں' اس کے مناظر خالص ہندوستانی ہیں۔ یہ مناظر آج بھی ہندوستان کے مختلف کونے میں دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں جن کا ذکر نظیر نے برسوں پہلے کیا تھا۔

''برسات کی بہاریں'' لکھ کر نظیر نے ارض ہند کی فرزندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں

حقیقت نگاری کا عنصر نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ نظیر کی ایک نظم ''برسات کا لطف'' بھی ہے جس میں انہوں نے برسات کے خوشگوار منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ سیہ ابر میں بگلوں کا اڑنا اور پرندوں کی مختلف آوازیں کتنا حسین اور دلفریب منظر پیش کرتی ہیں اس کا اندازہ اس نظم کے مندرجہ ذیل بندوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ؎

اس سیہ ابر میں یوں اڑتے ہیں بگلے جیسے
لب مالیدہ مسّی میں دُر دنداں کی ضیاء
جگنو اس طرح چمکتے ہیں جوں وقت سنگار
ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف ہے گویا چھڑکا
مور کا شور، فغاں غوک کی، جھینگر کی جھنکار
پی پی ہر آن پپیہے کی ہے کوئل کی صدا ؎

سیہ ابر میں بگلے کا اڑنا، جگنو کی چمک، غوک کی فغاں، جھینگر کی جھنکار، پپیہے کی پی پی سب ہندوستان کی مقامی دلفریبیاں ہیں۔ اس کے ساتھ کمال یہ ہے کہ جن چیزوں سے ان کو تشبیہ دی گئی ہے مثلاً لب مالیدہ مسّی، ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف وہ بھی خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔ نظیر نے جن موسمی کیفیات کا سماں باندھا ہے ان سب میں انہوں نے زندگی بسر کی ہے گویا کچھ بھی مستعار نہیں ہے۔

برسات کا تماشہ' بھی اس قبیل کی ایک نظم ہے۔ اسے پڑھ کر برسات کا منظر نظر کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ نظیر کی اس خوبی کا اعتراف آل احمد سرور نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر اور نظیر کے سوا برسات کے منظر میں سچی تصویریں کم تھیں'' [۸]

نظیر نے برسات، جاڑے اور چاندنی کے پر کیف مناظر اپنی کئی نظموں میں پیش کیے ہیں۔ نظم برسات کی بہاریں کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں

ہر بات کے تماشے ہر گھاٹ کی بہاریں
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں ۹

برسات کے موسم کا ذکر نظیر نے الگ الگ زاویہ نگاہ سے بھی کیا ہے۔ برسات میں بارش کی زیادتی سے جو کیفیت ہوتی ہے اس کا اثر امیر اور غریب دونوں پر یکساں نہیں ہوسکتا۔ امراء اور روٴسا سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے محلوں میں برسات کے موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں جب کہ غریبوں اور مفلسوں کے چہروں پر فکر و تردد کے آثار ہوتے ہیں کہ کہیں ان کا جھونپڑا یا کچا مکان بارش کی نذر نہ ہوجائے ؎

کتنوں کو محلوں کے اندر عیش کا نظارہ
یا سائباں ستھرا یا بانس کا اسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا
مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارہ
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں ۱۰

برسات کے علاوہ نظیر کو آندھی کا منظر بہت پسند ہے اور اگر اس آندھی میں محبوب سے مڈبھیر ہوگئی تو مزہ ہی مزہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے ؎

نہ ہو کیوں کر جہاں یارو زبر اور زیر آندھی میں
کہ ہو کر باؤلے پھرتے ہیں بن کر شیر آندھی میں
لگا لینے جو کل دامن ہوا کا گھیر آندھی میں
بگولے اٹھ چلے تھے اور نہ کچھ تھی دیر آندھی میں
کہ ہم سے یار سے آ ہوگئی مڈبھیر آندھی میں ۱۱

نظیر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ منظر فطرت و قدرت کی عکاسی کرتے وقت وہ اپنی ذات کو بھی اسی منظر میں ضم کردیتے ہیں۔ بقول نیاز فتح پوری:

''نظیر کی منظر پرستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ نقوش قدرت میں وہ اپنے آپ کو بالکل گم کر دیتا تھا۔ اور اس لئے اس کے بیان میں قیامت کی والہانہ تکمیل پائی جاتی ہے'' ۱۲ؔ

نظیرؔ اکبر آبادی کی ایک مثنوی ''سیر دریا'' ہے۔ یہ ۱۰۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں منظر نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں مخمورؔ اکبر آبادی نے اس مثنوی کو منظر نگاری کی اعلیٰ مثال بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میاں نظیرؔ کی منظر نگاری کے مرقعے طرح طرح سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثنوی 'سیر دریا' ارباب ذوق کی نظر سے ہنوز پوشیدہ ہے۔ یہ اس فرزند فطرت کی قدرت پرستی و منظر نگاری کی اعلیٰ مثال ہے۔''

(مخمورؔ اکبر آبادی: نظیر نامہ' ص ۱۳۱)

جانوروں کا ذکر بھی فطرت نگاری کے ذیل میں ہوتا ہے۔ نظیرؔ نے جانوروں اور پرندوں سے متعلق جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی فطری منظر نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ مثلاً ریچھ کا بچہ' اژدہے کا بچہ' گلہری کا بچہ' بلبلوں کی لڑائی اور کبوتر بازی کا ذکر اپنی نظموں میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ان کے اس بیان میں جزیات نگاری کے نمونے جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نظیرؔ کے کلام کی اس خصوصیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نظیرؔ اکبر آبادی کی نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً ریچھ کا بچہ' گلہری کا بچہ' جنگل کے جانوروں میں ہرن کا بچہ' بلبلوں کی لڑائی وغیرہ اس قدر دلچسپ اور اس قدر جذبات سے مملو ہیں کے پڑھنے والے کو ان کی تمام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے'' ۱۳ؔ

نظیرؔ کی ایک نظم ''ریچھ کا بچہ'' ہے۔ دوسری نظم ''گلہری کا بچہ'' ہے۔ یہ نظمیں بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہیں اور ہندوستان میں مداری کے ذریعہ ریچھ کا تماشا دکھاتے ہوئے ہندوستان کے دیہی مناظر کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔

مناظر فطرت پر نظیر نے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان سب میں انسان اور انسانی زندگی کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو نظیر نے مظاہر قدرت کے پردے میں انسان اور اس کی زندگی کی کامیاب مصوری کی ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک نظم ''چاندنی'' کا یہ بند قابل ذکر ہے ۔

واہ ! ہوئی تھی رات کیا چاندنی کی اجالیاں
جھوم رہی تھی باغ میں سنبل و گل کی ڈالیاں
شوخ بغل میں ناز کے کھولے تھا زلفیں کالیاں
خوش ہو گلے لپٹ لپٹ دیتا تھا میٹھی گالیاں
ہم بھی نشے میں مست تھے ساقی کی پی کے پیالیاں
جل کے فلک نے اس میں، ہائے! آفتیں لا یہ ڈالیاں

صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا، جی ہی کی جی میں رہ گئی[۱۴]

نظیر نے انسانی زندگی کی بھرپور عکاسی اپنے کلام کے ذریعے کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت پر اس کثرت سے طبع آزمائی کی ہے کہ اگر انھیں نیچرل شاعر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ اس خوبی کا حامل نظر آتا ہے۔

سلیم جعفر نے نظیر کی منظر نگاری کے بارے میں لکھا ہے:

''نظیر اپنے رنگ کے موجد اور مناظر عالم کے مصور تھے''[۱۵]

نظیر کی شاعری کا مرکز ہندوستان کی عوامی زندگی اور وہاں کے مناظر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فطرت نگاری ہو یا طنز نگاری، غم ہو یا خوشی ان کے کلام میں سبھی جگہ میں ہندوستان ہی دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے عام رجحان کے برخلاف ایک ایسی طرز شاعری کی بنیاد ڈالی جسے انہوں نے خود ہی ایجاد کیا اور خود ہی اسے پروان چڑھایا۔ اس فطری اور واقعی شاعری کو سماج کے ہر طبقے میں مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔

کلامِ نظیر میں ہندوستانی اجزا کے سلسلے میں سید رضی الدین نے کیا خوب کہا ہے:

> ''ہمارے ملک کے عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت یعنی سماج کا سب سے بڑا حصہ دیہاتی ہے۔ پھر ہمارے شعر و ادب میں اس گنوار تہذیب کا کھردراپن' ہمارے کسانوں کا ادھ ننگا جسم' ہمارے جھونپڑے اور کھیت' ہمارے کمہار کے کورے برتن' ہمارے لوہار کے دھوئیں سے اٹی ہوئی چھت' ہمارے دیس کے کال' ہمارے کھلیان' ہمارے تعلیمی نظام میں گرو اور چیلے کا ناتا' ہمارے تعلیمی سامان میں استاد کی قمچی اور ڈنڈا' ہمارے یہاں برسات کی بہاریں' ہمارے یہاں گرمی کی گھٹن' ہندوستانی میلے ٹھیلے' ہمارے یہاں کی گندگی اور غلاظت' مکھی اور مچھر' اردو شاعری میں یہ سب کچھ بس نظیر کے یہاں ہیں'' ۱۶؎

نظیر کی منظر نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں خیالی اور قیاسی تصویریں نہیں ملتی ہیں۔ ان کی تصویروں میں انکے مشاہدات شامل ہیں۔ کلیم الدین احمد کی درجِ ذیل رائے اس بات پر دلالت کرتی ہے:

> ''غرض مختلف قسم کی تصویریں اور کیسی کامیاب کہ ہر تصویر میں حقیقت کی جھلک ہے۔ ان میں سے کوئی بھی فرضی اور خیالی نہیں۔ نظیر حقیقت طراز شاعر ہیں۔ جو چیزیں وہ گرد و پیش میں دیکھتے ہیں ان کی جیتی جاگتی تصویریں اتارتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں خاص ہندوستان کی فضا میں سانس لیتی ہیں۔ ان میں ذرا بھی اجنبیت کی بو نہیں ہے۔ اس قسم کی نظمیں اردو میں نایاب ہیں۔'' ۱۷؎

اسمٰعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء۔۱۹۱۷ء): اسمٰعیل میرٹھی کا شمار میرٹھ کے مایہ ناز فرزند اور تاریخ ساز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ سرسید کے ذریعہ قوم کی حالت کو بہتر بنانے کی تحریک میں اسمٰعیل میرٹھی بھی پیش پیش تھے۔ انہوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے درس و تدریس کے پیشے کو اپنایا اور بچوں کے لئے نصابی کتابوں کی بھی تصنیف و تالیف کا اہم کام

انجام دیا۔انھوں نے بچوں کے لئے متعدد سبق آموز نظمیں لکھیں۔ جہاں ان کی ان تصنیفات سے قوم کے بچوں کو بے انتہا فائدہ پہنچا وہیں ان نظموں نے اپنے خالق کو ایک نقصان یہ پہنچایا کہ ان پر صرف ''بچوں کا شاعر'' کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔انھوں نے اردو ادب و شاعری میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں لیکن ان کی ادبی خدمات کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔

اسمٰعیل میرٹھی کی پیدائش میرٹھ کے ایک محلّہ اندرکوٹ پرانی تحصیل میں ہوئی۔اس دور کے دستور کے مطابق ان کا پہلا مکتب ان کا گھر ہی بنا۔انکے والد نے از خود انکو فارسی کی تعلیم دی۔دس سال کی عمر میں قرآن پڑھنا شروع کیا۔آپ کو ذہانت و ذکاوت قدرت نے اتنی عطا کی تھی کہ چھ ماہ میں قرآن کا ناظرہ مکمل کرلیا۔بعد ازاں مرزا رحیم بیگ کی سرپرستی میں گلستاں و بوستاں پڑھیں۔اسکول کی تعلیم کے بعد رڑکی کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی اپنے وطن میرٹھ لوٹ آئے اور سہارن پور میں محکمہ تعلیم میں فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔

شاعری کی ابتدا انھوں نے غزلوں سے کی لیکن سہارن پور میں قیام کے دوران قلق میرٹھی کے انگریزی کے منظوم ترجموں سے اتنے متاثر ہوئے کہ غزل کو خیر باد کہا اور نظموں میں طبع آزمائی کا آغاز کیا۔

انھوں نے دیگر اخلاقی و اصلاحی موضوعات کے علاوہ فطری منظر نگاری کو بھی اپنی شاعری کا اہم موضوع بنایا۔ڈاکٹر شاداب علیم اسمٰعیل کے کلام میں پیش کی گئی منظر نگاری کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ''اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری میں فطرت اپنے تمام تر تنوع، رنگینی اور حسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ان کی نظموں میں جگہ جگہ حسین مناظر نظر آتے ہیں لیکن کچھ نظموں کا تو موضوع ہی مختلف مظاہر فطرت ہے۔مثلاً ''شفق'' ''رات'' ''گرمی کا موسم'' ''برسات'' ''کوہ ہمالہ'' وغیرہ۔''[۱۸]

اسمٰعیل میرٹھی نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور کئی نئی ہیئتوں کے تجربے

بھی کیے ہیں، لیکن ان کا اصل میدان نظم نگاری رہا ہے۔ یوں تو انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ہونے والے ۱۸۷۴ء کے مشاعرے سے جدید نظم نگاری کی ابتدا سمجھی جاتی ہے لیکن اسمٰعیل میرٹھی اس تحریک سے پہلے ہی اس روش پر چل رہے تھے۔ ان کی چند موضوعاتی نظمیں اس طرح ہیں: مثنوی صنعت، ہوا چلی، گرمی کا موسم، رات، برسات، شفق، دال کی فریاد، دال چپاتی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں بیان کی سادگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ ملک کی مختلف اشیا اور مناظر قدرت کو خصوصی طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کی منظر نگاری آزاد اور حالی کی منظر نگاری سے زیادہ واضح، سلیس اور فطری ہے۔ اسمٰعیل کی منظر نگاری کی خوبیوں کو پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی سراہا ہے:

> ''اسمٰعیل کے موضوع اکثر و بیشتر دیہی یا دیہاتی ہیں۔ نظموں کی فضا بھی دیہی ہے اور اسلوب موضوع کے بالکل مطابق ہے۔ ان اجزاء کے اختلات سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے۔ اردو کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ قدیم شعرا کی بلند آہنگی اور موشگافیوں کے مقابلے میں ہم اسمٰعیل کی نظمیں اسلم کی بلی، ہماری گائے، پن چکی، صبح کی آمد وغیرہ پڑھتے ہیں تو عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے جذبات، محسوسات اور مشاہدات میں پیوست ہو جاتی ہے۔'' ۱۹

اسمٰعیل میرٹھی ایک دیہی شاعر ہیں اس لحاظ سے انہوں نے دیہی مناظر کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اپنے مشاہدے اور تجربے کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً ایک نظم میں ہوا کی رفتار اور اس کی خصوصیات کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے ؎

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے
ہجوم طائران خوش نوا ہے
کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سن سے
کبھی آہستہ رو موج صبا ہے
غبار و گرد سے جو اٹ گئی تھی

صبا نے غسل کا ساماں کیا ہے
ہوا نے کیا ہوا باندھی چمن میں
کہ خوبانِ چمن کا سر ہلا ہے
چمن کا پتہ پتہ ہے نوا سنج
صبا کی آمد آمد جا بجا ہے
گلوں کی ڈالیاں جھک گئی ہیں
زمیں پر سبزہ کیا کیا لوٹتا ہے [۲۰]

مندرجہ بالا نظم انہوں نے مبالغہ آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے ہوا کے اثرات کو واضح طور پر بیان کیا ہے نیز اشعار میں تسلسل بھی پایا جاتا ہے۔ انھوں نے شفق پر بھی ایک نظم کہی ہے۔ یہ نظم بھی مصورانہ شاعری کی ایک حسین مثال ہے ؎

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار
ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ
چمن دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ
نیا رنگ ہے اور نیا روپ ہے
ہر اک روپ میں یہ وہی دھوپ ہے
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ
سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلے کوئی
بنفشی و نارنجی و چمپئی
یہ کیا بھید ہے کیا کرامات ہے
ہر اک رنگ میں اک نئی بات ہے
یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے بار

بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیلگوں اس میں سرخی کی لاگ
ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ
اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردے چھٹے لال بانات کے[۲۱]

اس نظم سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسمٰعیل نے شفق کا باقاعدہ مشاہدہ کیا ہے۔ برسات کی شام میں شفق ایسے ہی مختلف رنگ پیش کرتی ہے۔

انہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ برسات پر بھی نظم کہی ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا
ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا
گھٹا آن کے مینہ جو برسا گئی
تو بے جان مٹی میں جان آ گئی
زمیں سبزے سے لہلہانے لگی
کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی
جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل
عجب بیل پتے، عجب پھول پھل
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا
وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا
ہزاروں پھدکنے لگے جانور
نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر[۲۲]

اسمٰعیل کی برسات پر یہ نظم بہت مشہور ہے۔ اس نظم کا انداز بیان بہت سادہ ہے۔ انہوں نے دیہی نظموں میں اپنے ذاتی مشاہدات کو سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ان کے خیالات میں صداقت ہے اور انداز بیان فطری ہے۔ ان کے مناظر کا تعلق ہندوستان ہی سے ہے۔ اس لئے ان کی منظر نگاری میں ہندوستان کی روح سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کلیم الدین احمد نے ان کی شاعری کی اس خصوصیت کو سراہا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''جو چیز انہیں ذکر کا مستحق بناتی ہے وہ ان کی دیہی شاعری ہے۔ آزاد کی طرح انہوں نے بھی نیرنگ قدرت کے نقش و نگار کھینچنے کی کوشش کی اور اس میں انفرادی رنگ بھی حاصل کیا ہے۔ اگر ان نظموں میں شان وشوکت نہیں تو بے رنگ و بے مزہ سادگی بھی نہیں۔ ان کی سادگی میں ایک قسم کی دلکشی ہے۔ ان کی تصویریں عام نہیں خاص ہیں اور ہندوستانی فضا میں سانس لیتی ہیں۔ اور ان تصویروں کو ان کی آنکھوں نے دیکھا ہے۔ یہ خیالی یا مصنوعی نہیں۔'' ۲۳

ڈاکٹر کوثر مظہری اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''اسمٰعیل میرٹھی نے فرسودہ شاعری سے بیزار ہو کر انگیا' چوٹی' زلف ولب ورخسار اور ہجر و وصال کی ظلمت سے نکل کر اعلیٰ تہذیبی' سماجی اور ثقافتی قدروں' حب الوطنی' محنت ومشقت اور نیچرل طرز شاعری کی طرف قدم بڑھایا۔ ۲۴

ان کی ایک نظم ہوا چلی کے کچھ بند درج ذیل ہیں ؎

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی
لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں
پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی
سویا ہوا تھا سبزہ اسے تو جگا چلی ۲۵

ان نظموں میں مضامین کے سادہ اور نیچرل ہونے کے جو اوصاف ہیں وہ صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان نظموں میں روانی ' اصلیت اور جاذبیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے فطرت کے مختلف عناصر اور ہندوستانی پرندوں اور جانوروں پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ اونٹ' کوا' عجیب چڑیا' گائے' کتا اور اس کا ہمسایہ' جگنو اور بچہ' چھوٹی چیونٹی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسمٰعیل نے مخمس کے فارم میں جو نظمیں کہی ہیں ان کے نام میرا خدا میرے ساتھ ہے' صبح کی آمد' کوشش کئے جاؤ' چھوٹی چیونٹی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں نیچر اور سعی پیہم کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ بوقت سحر باغوں کا' ندیوں کا' جھرنوں کا' پہاڑوں کا اور جنگلوں کا جو منظر ہوتا ہے اس کی پیش کش اسماعیل میرٹھی نے جزیات کے ساتھ کی ہے۔

مناظر قدرت کا تعلق جدید طرز شاعری سے ہے اس لئے اس کی اہمیت زائل نہیں ہو سکتی۔ ''صبح'' کو انفرادیت کا جامہ پہنا کر اسمٰعیل نے اس کے منہ میں زبان رکھ دی ہے جس کی پیروی مستقبل میں علامہ اقبال نے سب سے زیادہ کی۔ اسمٰعیل کی نظم 'صبح کی آمد' میں صبح سونے والوں سے کچھ اس طرح مخاطب ہوتی ہے ؎

میں سب کا رہوار کے ساتھ آئی
میں رفتار گفتار کے ساتھ آئی
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی
میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہر اک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے
نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے
مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں ۲۶

ہمارے اردو ادب کا یہ المیہ ہے کہ اسمٰعیل میرٹھی کو صرف بچوں کا شاعر مانا جاتا ہے اور انھیں اردو کی پہلی سے چوتھی کتاب تک ہی محدود کر دیا جاتا ہے۔ حقیقتاً ایک طرف جہاں انہیں بچوں کے شاعر کی حیثیت سے ٹرینڈ سیٹر کہا جا سکتا ہے وہیں دوسری طرف ان کی نظموں میں تجربات و مشاہدات کے گہرے نقوش اور منظر نگاری کے بہترین نمونے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کہیں کہیں تمثیلی رنگ بھی دکھائی پڑتا ہے اور متعدد مقامات پر ہیئت کے تجربے بھی ملتے ہیں۔

بیسویں صدی میں نظم معرّا کا دور شروع ہوا جس کی داغ بیل اسمٰعیل میرٹھی کے ہاتھوں انیسویں صدی میں پڑ چکی تھی۔ ان کی نظمیں 'تاروں بھری رات' اور 'چڑیا کے بچے' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان دونوں نظموں میں فطرت کے منظر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر
جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے
کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا ۲۷

اسمٰعیل میرٹھی کی مندرجہ ذیل نظم ''چڑیا کے بچے'' بے قافیہ نظم کی مثال ہے جس میں چڑیا کی نصیحت اس کے بچے کیلئے پیش کی گئی ہے جو ہر ماں کی اپنے بچوں کو نصیحت معلوم پڑتی ہے ۔

دو تین چھوٹے بچے چڑیا کے گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں سینے سے اپنی ماں کے

چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونوں بازو
اپنے پروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
اس طرح روزمرہ کرتی ہے ماں حفاظت
سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو
اے چھوٹے چھوٹے بچو تم اونچے گھونسلے سے
ہرگز نہیں گروگے پر اور پرزے اب تک
نکلے نہیں تمہارے اس واسطے ابھی تم
اونچے نہ اڑ سکوگے ہاں جب تمہارے بازو
اور پر درست ہوں گے تو دن کی روشنی میں
سیکھوگے تم بھی اڑنا کرتے پھروگے چیں چیں ۲۸

''خدا کی صنعت'' ۱۴۷ اشعات پر مشتمل اسمٰعیل میرٹھی کی وہ مثنوی ہے جس میں انہوں نے خداوند تعالی کی بنائی ہوئی مختلف اشیاء کا ذکر کیا ہے۔ شروع کے ۱۳۹ اشعار میں پیڑ پودوں' پھول پھل' دن رات اور خدا کی بنائی ہوئی مختلف اشیاء کا ذکر کیا ہے۔ شروع کے ۳۹ اشعار میں پیڑ پودوں' پھول پھل' دن رات اور موسموں کی تبدیلی میں اللہ کی صناعی کا کمال دکھایا ہے۔ کچھ بند ذیل ہیں۔

کیا دودھ کی سی چاندنی ہے چھٹکی
حیران ہوکر نگاہ ٹھٹکی
ننھی کلیاں چٹک رہی ہیں
چھوٹی چڑیاں پھدک رہی ہیں
جاڑے سے بدن ہے تھرتھراتا
ہر شخص ہے دن میں دھوپ کھاتا
سردی سے ہاتھ پاؤں ٹھرتے

سب لوگ الاؤ پر ہیں گرتے
سرسوں پھولی بسنت آئی
ہولی پھاگن میں رنگ لائی ۲۹

مندرجہ بالا اشعار میں جاڑے کی رات، اس کی ٹھٹرن، نیز سرسوں کے پھول، آگ کا الاؤ ہندوستان کے جاڑے کی صحیح منظر کشی دکھائی دیتی ہے۔ ساتھ ساتھ دیہات کے جاڑوں کی رات کا گمان ہوتا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کی ایک نادر نظم ''بارش کا قطرہ'' ہے۔ اس میں انہوں نے بارش کی آمد سے قبل کا اور بارش کے آغاز کا منظر انتہائی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے ؎

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا
میں اور کی گو نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گی پیاس
اپنا ہی کروں گی ستیاناس ۳۰

بارش کا پہلا قطرہ اسمٰعیل میرٹھی کی ایسی نظم ہے جس میں منظر نگاری کے حسین نمونوں کے ساتھ ساتھ United We Stand Devided we Fall کا عظیم سبق بھی پوشیدہ ہے۔

مولانا آگے بارش کے منظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

آخر قطروں کا بندھ گی تار
بارش ہونے لگی موسلا دھار

پانی پانی ہوا بیاباں
سیراب ہوئے چمن و خیاباں ۳۱؎

آگے اسمٰعیل میرٹھی نے سمندروں سے اٹھنے والی بارش برسانے والی مانسونی ہواؤں کا ذکر بھی بڑے ہی دلفریب انداز میں کیا ہے ؎

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے	ہجوم طائران خوش نوا ہے
ہوا نے کیا ہوا باندھی چمن میں	کہ خوبان چمن کا سر ہلا ہے
گلوں کی ڈالیاں جھک جھک گئی ہیں	زمین پر سبزہ کیسا لوٹتا ہے
بکھیری نسترن پر زلف بلبل	صبا شوخی میں فتنہ ہے بلا ہے۳۲؎

مندرجہ بالا اشعار میں 'نوا' 'صبا' جیسے قوافی ہیں اور 'ہے' ردیف کی پابندی کی گئی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی نے جدید نظم نگاری نیز مناظر فطرت کی عکاسی کے باب میں آزاد اور حالی سے بڑھ کر اضافہ کیا ہے جو کہ قابل قدر ہے۔ان کا شماران عظیم شعری شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کو نظم معرّیٰ اور مصرع مسلسل سے روشناس کرایا نیز ہیئت کے تجربوں کی بنیاد رکھی۔گوپی چند نارنگ اس سلسلے کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

''ان کا شمار جدید نظم کے ہیئتی تجربوں کے بنیاد گذاروں میں بھی ہونا چاہیئے'' ۳۳؎

اکبرؔ الہ آبادی (۱۹۲۱ء۔ ۱۸۴۶ء): اکبر الہ آبادی بارہ ضلع الہ آباد میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد حضرت مولانا تفضّل حسین نے عربی فارسی کی تعلیم خوب دلائی اور اکبرؔ نے ریاضی میں خصوصیت سے مہارت حاصل کی۔انگریزی کے علم پر بھی اعلی استعداد حاصل کر لی۔سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی فکر معاش نے انہیں ملازمت کرنے پر مجبور کیا۔۱۸۶۲ء میں الہ آباد میں جمنا کے پل کی تعمیر شروع ہوئی اور اس میں پندرہ روپے ماہوار پر منشی کی نوکری کی۔اس کے بعد وکالت کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ وکالت کی نوکری خوب راس آئی پہلے منصف پھر سیشن جج مقرر ہوئے اور ہائی کورٹ کے جج

کے لئے آپ کا انتخاب ہونے ہی والا تھا کہ نوکری سے فراغت حاصل کر لی۔ اکبر کو ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ اکبر دو مختلف المعاشرت بیویوں کے شوہر بھی تھے۔

اکبر الہ آبادی کی ذہانت' انفرادیت اور شخصیت نے بالکل جداگانہ انداز سخن اور طرز تنقید اختیار کیا اور اپنے معاصر شعرا اور اہل فکر و نظر میں امتیازی شان حاصل کی۔ اکبر کو بچپن سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ وہ رنگا رنگ طبیعت کے مالک تھے اور گلستان سخن میں گل صد رنگ و حسن ہزار شیوہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بقول مولوی قمر الدین احمد:

> ''وہ صوفیوں میں نمایاں صوفی تھا اور واعظوں میں خوش گفتار واعظ' رندوں میں کھلا ہوا رند اور زہدوں میں گوشہ نشیں زاہد' قرآن خوانوں میں خوش گلو قرآن خواں تھا اور شاعروں میں بلند پایہ شاعر' رئیسوں میں اونچے درجے کا رئیس اور مفلسوں میں شکستہ حال نادار''[۳۴]

اکبر شاعری میں اگر نظموں کا ذکر کیا جائے فطری منظر نگاری کی مثالیں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کی مصورانہ منظر نگاری کی ایک حسین مثال ان کی ایک نظم 'روانی آب' ہے جس کا خیال انہوں نے انگلستان کے مشہور شاعر روبرٹ ساؤرے کی نظم ''ہاؤ دی واٹر کمز ڈاؤن ایٹ دی لوڈور'' (How the water comes down at the loder) سے لیا ہے۔ واضح رہے کہ لوڈور انگلستان کا ایک مشہور آبشار ہے۔ ساؤرے نے اپنی اس نظم میں اس منظر کو پیش کیا ہے کہ پانی آبشار سے گرتا ہے تو کیسا لگتا ہے۔ اکبر نے اسی نظم کو دیکھ کر دریا کی روانی کا نقشہ بڑے ہی دل فریب انداز میں کھینچا ہے۔ اکبر نے اس میں ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور انگریزی نظم میں جو روانی اور زور ہے اسے پوری طرح سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ اکبر کے یہ اشعار پانی کے بہاؤ کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں ؎

اچھلتا ہوا اور ابلتا ہوا　　اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا　　رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا　　چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا　　یہ سبزے سے چادر بچھاتا ہوا

وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا ۔۔۔ یہ لہروں کا پیہم نچاتا ہوا
بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا ۔۔۔ بگڑ کر وہ کف منہ میں لاتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا ۔۔۔ اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا ۔۔۔ ہر اک سے برابر الجھتا ہوا ۳۵

مندرجہ بالا نظم میں روانی آب کا ایسا واقعی اور خوبصورت نقشہ دکھایا ہے کہ منظر نگاری کا حق ادا کر دیا۔ اس نظم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اکبرؔ کے پاس الفاظ کا کتنا بڑا ذخیرہ ہے جسے انہوں نے پانی کے بہنے کے منظر کو پیش کرنے میں استعمال کیا ہے۔ ابواللیث صدیقی نے اس نظم کی یوں تعریف کی ہے:

''حضرت اکبر نے الفاظ کے آہنگ سے دریا کی روانی' اس کے بڑھتے ہوئے جوش' غیظ و غضب کا سماں باندھ دیا ہے'' ۳۶

اکبرؔ نے ایک نظم میں تتریوں کے رقص کا منظر دکھایا ہے ؎

دو تتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں ۔۔۔ اک آن میں سو طرف کو پھرتی دیکھیں
بھولی' خوش رنگ' چست' نازک' پیاری ۔۔۔ پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا ابھار ۔۔۔ تیزی ہے کہ آنکھ کا تعاقب دشوار
جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم ۔۔۔ وہ بھی بلا زیادت و کم قائم
گو تابع جوش برق پروازی ہیں ۔۔۔ دونوں کے خطوط ایک متوازی ہیں
کیوں کر کہوں کہ نظر بندی ہے ۔۔۔ اللہ اللہ کیا ہنر مندی ہے
کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں ۔۔۔ پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں ۳۷

ان اشعار میں تتریوں کے رقص کی صحیح منظر نگاری کی گئی ہے۔ اکبرؔ تتریوں کے حسن' چستی و چالاکی سے بیحد متاثر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ پرواز کے وقت تیتریوں کا خطوط متوازی بناتے ہوئے اڑنے کی ادا اکبر کو بہت پسند آئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکبر نے اڑتی ہوئی تیتریوں کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔

کلیم الدین احمد اس نظم کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کس سادگی، صفائی اور پاکیزگی سے تیتریوں کے ناچ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ تصویر رسمی نہیں ہے۔ اکبر اسی منظر سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ تصویر ایسی حسین اور موثر ہے۔ کاش وہ اس قسم کی نظموں کی طرف توجہ کرتے۔"[۳۸]

ان کی ایک نظم کیڑے سے متعلق ہے۔ اس نظم کا ایک بند درج ذیل ہے:

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا قصد ضرر میں نے ہٹایا اس کو انگلی سے
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا[۳۹]

نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ ان کی نظم "دربار دلی" ہے جس میں انہوں نے دلی کے دربار کی تصویر کھینچی ہے:

دلی کو ہم نے بھی جا دیکھا سر میں شوق کا سودا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا[۴۰]

سیماب اکبر آبادی (۱۸۵۵ء۔۱۹۵۱ء): سیماب اکبر آبادی نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن انکی فکر کے لئے غزل کے بجائے نظم زیادہ موزوں ثابت ہوئی، نیز انہوں نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ دبستان دہلی سے خاص لگاؤ ہونے کی وجہ سے وہ داغ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔

سیماب نے دیگر موضوعات کے علاوہ مناظر فطرت کو بڑی پاکیزگی اور گہرائی کے ساتھ موضوع سخن بنایا ہے۔ انھوں نے گرد و پیش کے فطری مناظر یعنی دریاؤں، کہساروں، نالوں، ندیوں، جھرنوں، اور آبشاروں کی تصویر کشی کی ہے۔ سیماب انسان اور فطرت کو کوئی جداگانہ شئے تصور نہیں کرتے بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم گردانتے ہیں۔ مناظر فطرت

پر انکی نظمیں 'تاروں کا گیت'، 'صبح صادق' 'ہلال رمضان' 'بسنت' 'فطرت کی جوگن' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کی نظم 'فطرت کی جوگن' میں پہلے بند میں شب ماہ کے رنگ ونور کا حسین پس منظر کچھ اس طرح تیار کیا گیا ہے' ملاحظہ ہو ؎

عروج شب ہائے ماہ کا ہے' ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروس شب بے حجاب ہو کر تجلیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہا ہے دھلے ہوئے آسماں پر چاند چودھویں کا
برس کے بادل ابھی کھلے ہیں' فضا کی خنکی بتا رہی ہے[۴۱]

سیمابؔ کے یہاں مناظر فطرت کی تصوریں نسبتاً کم دکھائی دیتی ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنی نظموں میں فطرت کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ بھی اقبالؔ کی طرح فطرت کے ذریعہ عوام تک کوئی پیغام پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے خالص منظر نگاری کی طرف انہوں نے کم توجہ دی ہے۔ ان کی ایک نظم 'صبح صادق' ہے جس کو پڑھنے سے قاری پر کیف و سرور کی ایک کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے ؎

مجھے کیف بادۂ صبح میں' تجھے لطف خواب سحر میں ہے
وہ کہاں ہے تیرے خیال میں' جو بہار میری نظر میں ہے
کبھی میری بزم سحر میں آ' تجھے میں دکھاؤں وہ آئینہ
جو تجلیوں سے گھرا ہوا' مرے چشم جلوہ نگر میں ہے
یہی لمحہ صبح ظہور ہے' یہی لحظہ مشرق نور ہے
عجب انتظام سرور ہے' کبھی دل میں ہے کبھی سر میں ہے[۴۲]

سیمابؔ کی نظر میں صبح ایسی ہی نشہ انگیز ہے جیسی شراب۔ اسی لئے انہوں نے "بادہ صبح" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ سیماب نے اس نظم میں فطرت سے مسرت اندوزی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس میں صبح بہار کے جلوے بھی ہیں اور یہ مثل آئینہ تجلیوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ صبح کبھی دل میں سرور پیدا کر دیتی ہے اور کبھی سر میں۔

اپنی نظم 'فطرت کی جوگن' میں سیمابؔ نے پہاڑ کے حسن کو بڑے ہی دلفریب انداز میں پیش کیا ہے ؎

پہاڑ جنت بنے ہوئے ہیں محیط ہے نور چوٹیوں پر
کرن جو ہے آبروئے چشمہ وہ آئینے سے بنا رہی ہے
ہے دُور میں چاند کا پیالہ' افق پہ پھلی ہوئی ہے مستی
رواں ہیں یوں آبشار گویا' شرابِ فطرت بہا رہی ہے
فضا یہ رنگین اور سنہری' یہ وقت خاموش اور ٹھنڈا
یہ ہے طلسم نظر فریبی' کہ رات جادو جگا رہی ہے[۴۳]

سیمابؔ کی ایک نظم 'جمنا' ہے جس میں انہوں نے جمنا ندی کی روانی اور عظمت کے ساتھ اس کی بدحالی کا ذکر ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

آہ بنتِ ہمالہ مادرِ ہندوستان
دودھ پیتی ہے زمیں جس کی مقدّس دھار سے
آج بے کیفی سی ہے اس کی خرام ناز میں
یہ بھی کیفِ آشنا تھی جذبۂ سرشار سے
دورِ ماضی میں نہ تھی محدود اس کی وسعتیں
رات دن یہ کھیلتی تھی قلعہ کی دیوار سے
جلوۂ اقبال کا آئینہ تھا اس کا جمال
تھی نمود خلد ہر انداز کوثر بار سے[۴۴]

سیمابؔ اکبرآبادی نے اپنی بعض منظریہ نظموں کے ذریعے اخلاقی درس بھی دیا ہے۔ ان کی نظم ''رقص برگ'' کو اس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں سیماب نے درس اتحاد دیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح اتحاد کے ذریعے سارا نظام عالم قائم ہے۔ اگر فطرت کے مختلف اجزا ایک دوسرے سے وابستہ نہ رہتے تو یہ زوال پذیر ہو جاتے۔ سیماب نے ایک برگ کے ذریعے اس سبق کو پیش کیا ہے ؎

برگ گل کے جی میں آئی تیتری کو دیکھ کر
کاش میں بھی رقص کرتا سبزۂ شاداب پر
کاش آزادی مجھے بھی اس طرح ہوتی نصیب
منعقد کرتا میں اپنی انجمن دور و قریب
تیتری کو دیکھ کر جذبوں میں اک جوش آ گیا
شاخ کی پابندیوں سے جی مرا گھبرا گیا
ناگہاں دست ہوا نے کر دیا رسوا اسے
صورت خس کر دیا گلشن میں آوارہ اسے
یوں دیا فطرت نے اپنا عزم فہمی کا ثبوت
کردیا اس پر مسلّط ایک تار عنکبوت
تار میں وہ برگ گل کچھ اس طرح جھولا کیا
نیم آزادی میں دنیا کی ہوا کھایا کیا
باد صر صر نے گرایا اس کو آخر خاک پر
موت غالب آئی اس کی ہستئی بے باک پر
روح نکلی، رنگ بدلا، تازگی کمہلا گئی
دیکھتے ہی دیکھتے پتے کو مٹی کھا گئی ۴۵؎

سرؔور جہاں آبادی (۱۸۷۳ء۔۱۹۱۰ء): فطرت کی منظر نگاری کے معاملے میں سرور جہاں آبادی کا نام بھی اہم ہے۔ان کو ہم ایک فطرت پرست شاعر کہہ سکتے ہیں۔درحقیقت سرؔور جہاں آبادی نے فطرت کے مختلف پہلو ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ان کو بچپن ہی سے فطرت سے دلچسپی تھی۔خصوصاً وہ پھولوں کے تو پرستار تھے۔چنانچہ ''خم کدۂ سرور'' کے دیباچے میں وہ خود فرماتے ہیں:

> ''ناظرین! بچپن میں میں پھولوں کا بڑا شوقین تھا۔مگر بدقسمتی سے گھر کے صحن کے آگے پھولوں کا کوئی تختہ یا چھوٹا سا کنج نہ تھا جس سے میں اپنی ننھی سی تفریح کو تر و تازہ رکھتا۔یہ ایک ناخوشگوار کمی تھی جو مجھ کو ہر وقت مغموم اور افسردہ بنائے رہتی تھی۔ننھی سی جان اور پھولوں کا ارمان۔اتنی جرات کہاں کہ خود بازار جا کر گل فروشوں کی دوکان سے پھول مول لاؤں اور ان سے اپنا دل بہلاؤں۔''۴۶؎

سرؔور جہاں آبادی کو ہر پھول سے محبت تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرؔور بچپن ہی سے فطرت کے شیدائی تھے اور مرتے دم تک فطرت کے شیدائی رہے۔انہوں نے اپنی ایک نظم میں بیر بہوٹی کی تصویر اس طرح اتاری ہے ؎

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا
سرخ ڈورا ہے کسی چشم فسوں پرواز کا
قطرۂ مضطر ہے خون کشتگان ناز کا
قلب خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا
یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جام زرّیں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر
گل بداماں ہے شفق میں شعلہ تنویر حسن
خون عاشق یار میں پر ہے گریباں گیر حسن
یا عقیق سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیر حسن
نقش نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویر حسن
جلوۂ گل ہے فضائے وادئی پرخار میں
سرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں ؎۲۴

سرور جہاں آبادی نے ان بندوں میں بیر بہوٹی کی شکل و شباہت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اگر چہ اس تصویر کشی میں انہوں نے تشبیہات کا استعمال بہت زیادہ کیا ہے۔ اس کے باوجود بیر بہوٹی کی شکل مسخ نہیں ہوئی ہے۔ سرور جہاں آبادی کی منظر نگاری میں فطرت سے لطف اندوزی کا جذبہ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اپنے معاصرین میں وہ تنہا شاعر ہیں جن کے یہاں موضوعات کی بوقلمونی اور پھیلاؤ دیکھنے کو ملتا ہے اور ساتھ ساتھ انگریزی نظموں کے نمونوں پر نظمیں تخلیق کرنے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء): اقبالؔ سرزمین پنجاب کے مردم خیز خطے سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک گوت ''سپرو'' سے ہے جن کا مسکن کشمیر میں سری نگر کے نواح میں تھا۔ اقبالؔ نے ابتدائی تعلیم مولوی میر حسن کی معروف وقت درسگاہ میں حاصل کی۔ ان کو عربی اور فارسی سے طبعی مناسبت ویسے تو اجداد سے ورثے میں ملی تھی، اس پر میر حسن ایسے فاضل کی تربیت نے اسے اور نکھار دیا۔ انہوں نے اسکاچ مشن اسکول سے میٹرک نیز گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں امتیازی نمبروں سے حاصل کیں۔ اس کے علاوہ ٹرینیٹی کالج کیمبرج اور میونخ یونیورسٹی جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔

علامہ اقبالؔ برصغیر ہند و پاک کی ایک گراں قدر میراث ہیں اور اس میراث پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، مفکر، فلسفی و سیاست داں ہی نہیں بلکہ وہ مشرق، ملت اسلامیہ، ہندوستان اور عالم انسانیت کی حریت و اخوت اور اس کے مقصد کے لئے آفاقی نشاۃ ثانیہ کے علم بردار ہیں۔ انہیں کسی عہد یا نظام فکر سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے فن، اسلوب اور افکار سے پوری قوم و ملت متاثر ہوئی ہے۔ ان کے حکیمانہ خیالات نے اردو شاعری کی راہیں روشن کی ہیں۔

علامہ اقبالؔ اس عظیم ہستی کا نام ہے جو دنیائے سخن کا زندہ جاوید شاعر ہے۔ ان کی شاعری کو مجموعی طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدائی دور کو جذباتیت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کے کلام پر داغؔ دہلوی اور غالبؔ کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں عاشقانہ جذبات اور مناظر فطرت کا بیان کثرت سے ملتا ہے لیکن فطرت کی شاعری اقبالؔ نے اپنے کلام کے ہر دور میں کی ہے۔ ان کے ابتدائی دور کی نظموں میں فطرت کے حسین مناظر کا بیان بڑے ہیں دل فریب انداز میں کیا ہے جو اقبالؔ کے جمالیاتی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ منظری شاعری کے نشانات بانگ درا کے تینوں حصوں میں موجود ہیں۔ حصہ اوّل میں ہمالہ، گل رنگیں، ابر کوہسار، ایک آرزو، ماہ نو، انسان اور بزم قدرت، آفتاب صبح، موج دریا، چاند، جگنو، ابر، کنارے راوی کے جیسی نظمیں مناظر فطرت کی نوع بہ نوع رنگینیوں کا مرقع پیش کرنے کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کو فطرت کا کچھ پیام بھی دیتی ہیں۔ حصہ دوم میں حقیقت حسن، کلی، چاند اور تارے، انسان، ایک شام، جیسی نظمیں بھی فطرت کے جمال و پیام کے آئینے ہیں۔ حصہ سوم میں ستارہ، نمود صبح، بزم انجم، چاند، شبنم اور ستارے، شعاع آفتاب، پھول جیسی نظمیں بیک وقت مظاہر فطرت کی عکاسی بھی کرتی ہیں اور فلسفیانہ مزاج بھی رکھتی ہیں۔

اقبالؔ کی فطرت پرستی ابتدا میں ورڈسورتھ کی طرح فطرت کو فلسفیانہ انداز میں نہیں دیکھتی، بلکہ فطرت کی آغوش میں سکون کی تلاش کرتی ہے۔ وہ اس خارجی فطرت کے حسن سے اپنی داخلی بے چینی اور اضطراب کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ کئی جگہ اقبالؔ نے فطرت نگاری کو کسی

دوسرے موضوع کے پس منظر کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

''ان کی تصانیف میں خاصہ حصّہ ایسے اشعار کا ہے جن میں فطرت نگاری کی گئی ہے مگر اس کا مقصد فطرت نگاری نہیں۔وہ فطرت کی اس تصویر کو کسی دوسرے موضوع کی تمہید یا پس منظر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔''۴۸

اقبالؔ کی بزم قدرت سے وابستگی ابتدائی دور سے ہی نظر آتی ہے۔جیسے جیسے شاعر اپنے ذہن کے ارتقائی منازل کو طے کرتا گیا فطرت سے شاعر کا ربط بھی وسیع تر ہوتا گیا اور وہ اپنی فلسفیانہ نظموں میں بھی جمال قدرت کا منظر نامہ مرتب کرنے لگا۔دراصل اقبالؔ نے منظر نگاری کے ذریعہ اپنے نظریہ حیات کو پیش کیا ہے۔'گورستان شاہی' اور 'خضر راہ' سب سے نمایاں مثالیں ہیں جن کا پس منظر فطرت نگاری سے ہی تعمیر کیا گیا ہے۔'گورستان شاہی' کے آغاز کے بند ملاحظہ ہوں ۔

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظّارۂ خاموش میں
صبح صادق سو رہی ہے رات کے آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
باطن ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لب ہستی پہ آہ سرد ہے ۴۹

فطرت کے متعلق اس قسم کے واضح بیانات یا مناظر قدرت کی مستقل مرقع نگاری کے علاوہ اقبالؔ اپنی اکثر نظموں میں اپنے تخیلات کے ابلاغ کے لئے فطرت کے نقوش بڑی چستی سے استعمال کرتے ہیں جس کا ایک نمونہ نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کا یہ آخری بند ہے ۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے ۵۰

اقبالؔ کو وہ منظر خاص طور پر متاثر کرتے ہیں جن میں عظمت و رفعت اور تغیر پایا جاتا ہے۔ مثلاً ’ہمالہ‘ جو عظمت و رفعت کا مظہر ہے۔ اس کا پھیلاؤ اور آسمان سے باتیں کرتی چوٹیاں اقبالؔ کو متاثر کرتی ہیں‘ یہ نظم اقبالؔ کی مناظر فطرت سے بھرپور متفکرانہ شاعری کے نمونوں میں سے ایک ہے۔ ’ہمالہ‘ ’بانگ درا‘ کی پہلی نظم ہے جس کے دل کش مناظر ایسی رنگین تصویر پیش کرتے ہیں جسے دیکھ کر دلوں میں سرور پیدا ہوتا ہے اور نور بصیرت بھی۔ مندرجہ ذیل بند میں فطری مناظر کی عکاسی قابل دید ہے۔

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر ۵۱

ہمالہ کے دامن سے گزرتی ہوئی ندیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑ جا تو اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو ۵۲

ان اشعار میں دریا کی سی روانی ہے اور خصوصاً پہاڑی ندی کے اتار چڑھاؤ کو جس طرح اقبالؔ نے اپنے الفاظ میں مصوّر کیا ہے وہ ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ اقبالؔ کی شاعری میں پہاڑ اگر استقامت اور عزم محکم کے استعارے ہیں تو دریا حرکت و عمل، جہد مسلسل اور زندگی کے رواں دواں ہونے کا استعارہ ہے۔ اقبالؔ نے 'ترانہ ہندی' کے ایک ہی شعر میں ملک کے طول و عرض میں ناچتی، بل کھاتی اور کھیتوں کو سیراب کرتی ان گنت ندیوں کو والہانہ انداز سے خراج عقیدت پیش کیا ہے ؎

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا ۵۳

اقبالؔ کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ابتدا میں دریاؤں کے کنارے پر ہی انسانی آبادیاں قائم ہوئیں اس لئے اقبالؔ کی شاعری میں جا بجا گنگا جمنا کی وادی، وادئ سندھ، دجلہ و فرات کی وادی، وادئ نیل اور اس طرح کی متعدد وادیوں کا ذکر دکھائی دیتا ہے۔

بانگ درا کی دوسری نظم 'گل رنگیں' ہے۔ اس میں جہاں منظر نگاری کے نادر نمونے ہیں وہیں شاعر اپنی زندگی سے اس کا تقابل کرتا ہے۔ اس طرح گل رنگیں بے سوز ساز زندگی کا استعارہ بن جاتا ہے۔ گل رنگیں کو ان الفاظ میں خطاب کرتے ہیں ؎

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں
اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں
یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگی ہے بے گداز آرزو ۵۴

''ابر کوہسار'' نامی نظم میں پہاڑوں پر چھائے بادل کی منظر کشی کی ہے۔ ہمالہ، گل رنگیں اور ابر کہسار تو عنوان سے ہی فطرت کی نظمیں معلوم ہوتی ہیں۔ 'عہد طفلی' بھی فطرت کی سادگی،

معصومیت اور تازگی پر ایک شاعرانہ تخلیق ہے۔ لہٰذا اسے نظم فطرت ہی کہنا چاہئے۔

اقبالؔ فطرت کے سچے مدح خواں ہیں۔ وہ جب مناظر قدرت کی مصوری اپنے الفاظ میں کرتے ہیں تو ان کا شاعرانہ کمال عروج پر ہوتا ہے۔ اپنی نظم 'ماہ نو' میں غروب آفتاب کا منظر اس انداز سے کھینچا ہے کہ نیلگوں آسمان کی رعایت سے دریائے نیل میں خورشید کی کشتی شکستہ ہو کر ڈول رہی ہے۔ یہاں قدرتی مناظر کو اقبالؔ نے اپنے مخصوص استعاراتی نظام کے تحت پیش کیا ہے۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
اک ٹکڑا تیرتا پھرتا تھا روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کیا کھولا ہے فصد آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروس شام کی؟
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی؟ ۵۵

حسن فطرت کے مظاہر کی حیثیت سے پھولوں اور پودوں کو شاعر نے اپنے دور اوّل میں ہی موضوع بنایا۔ بانگ درا کی دوسری نظم کا عنوان ''گل رنگیں'' ہے۔ اسی دور کی بعض دوسری نظموں کے عنوانات ''پرندے کی فریاد' 'گل پژمردہ' ایک پرندہ اور جگنو ہیں۔ نظم 'پرندہ اور جگنو' کا اختتام مندرجہ ذیل بصیرت افروز شعر سے ہوتا ہے۔

ہم آہنگی سے ہے محفل اس جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی ۵۶

انسان جب تہذیب کے بناوٹی روپ سے آشنا نہیں تھا تب اس کی زندگی فطرت سے بے حد قریب تھی۔ خالق کائنات نے بزم فطرت کو سجا کر انسان کے حوالے کیا تھا اور وہ سادہ اور معصوم فطرت کی آغوش میں اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ ان سے راحتیں بھی پاتا تھا اور ان کے مظالم کا سامنا بھی کرتا تھا۔ لیکن تہذیب کی ترقی کے سبب رفتہ رفتہ انسان کی زندگی اور اس کے عوامل تصنع کا شکار ہوتے چلے گئے۔ تہذیبی ترقی کے نتیجے میں جب انسان آزمائشوں کا

شکار ہوتا ہے تو فطرت کی آغوش میں ہی سکون محسوس کرتا ہے۔ دنیا کی کلفتوں سے دور فطرت کی سادگی اور معصومیت اسکے پراگندہ ذہن کو سکون عطا کرتی ہیں۔ اقبالؔ کی نظم ' ایک آرزو' ایسے ہی لمحے کی تلاش کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جو منظر نگاری کا نادر او اعلی نمونہ پیش کرتی ہے ۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑہ ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو [۵۷]

مندرجہ بالا بند میں دامن کوہ میں بہتے ہوئے ایک چشمے کے کنارے گل بوٹے' پرند' شفق، شبنم، بادل، بجلی اور قدرتی پس منظر میں ایک شیدائے فطرت کی ایسی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے آدمی بالکل اسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جس کی محض ایک

کاغذی تحریر اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ فطرت کے رنگ و آہنگ کی اس سے زیادہ حسین اور موثر نقاشی اور بھلا کیا ہو سکتی ہے۔

''بانگ درا'' کی ایک نظم 'ایک شام' ہے۔ اس نظم میں شام کا سماں' سکون اور خاموشی کی فضا کو الفاظ کی ترتیب اور ان کی اندرونی موسیقی کے ذریعے نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ پوری نظم ایک مخصوص رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس میں خارجی اور داخلی دنیا کی ہم آہنگی نے ایک خوبصورت سماں پیدا کر دیا ہے' جہاں کائنات کا سکوت اور ایک خاموش طلسمی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں ۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی   شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش   کہسار کے سبز پوش خاموش
کچھ ایسا سکوت کا فسوں   ہے نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے   یہ قافلۂ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا   قدرت ہے مراقبے میں گویا ۵۸؎

'قدرت ہے مراقبے میں گویا' نے اس منظر کشی کو مزید پر کشش اور پاکیزہ بنا دیا ہے۔

''موج دریا'' میں بھی یہاں کے فطری مناظر کی عکاسی ملتی ہے۔ ترانہ ہندی میں تو گنگا جمنی تہذیب کو نمایاں کرنے کے ساتھ ہمالہ یہاں کی ندیوں اور اقبال مندیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز یہاں کی مٹی سے بھی اپنی محبت کا اظہار کیا ہے ۔

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبرودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا ۵۹؎

ان کی ''ابر'' نامی نظم میں بادل اور بارش کی منظر کشی کی گئی ہے ۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر بن کا
نہاں ہوا جو رُخ مہر زیر دامن ابر ہوائے سرد بھی آئی سوار توسن ابر
گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
چمن میں حکم نشاط مدام لائی ہے قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے، اٹھے زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل اٹھی وہ اور گھٹا، لو برس پڑا بادل
عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا یہیں قیام ہوا وادی میں پھرنے والوں کا[60]

اس نظم میں پورب سے اٹھنے والی گھٹا کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس نے پہاڑ پر سیاہی کی چادر تان رکھی ہے۔ سرد ہوائیں آنا شروع ہو گئی ہیں۔ یہ گھٹا بہت پیاری ہے کیونکہ یہ ٹوٹ کر برسنے والی ہے لیکن اس میں گھن گرج نہیں ہے۔ بارش کی وجہ سے گیتئی کہسار سیراب ہوئی اور پژمردہ پھول پتیوں میں جان سی پڑ گئی۔ مجموعی طور پر اس میں ہندوستانی پہاڑوں سے اٹھنے والی گھٹا کا نہایت پر کیف انداز میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اقبال کی ایک نظم ''عشق اور موت'' منظر نگاری اور شاعری کا ایک بہت ہی اچھوتا سنگم ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس میں اشعار تو اقبال کے ہیں لیکن مناظر فطرت کا یہ بیان حقیقی مشاہدے کا نہیں بلکہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ لیکن یہ اقبال کے فن کا کمال ہے کہ اس حد فاصل کا تعین مشکل ہے جو حقیقی مشاہدے اور تخیل کے درمیان حائل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سہانی نمود کی گھڑی تھی تبسم نشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاج و زر مل رہا تھا عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی
کہیں تاج ہستی کو لگتے تھے پتے کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
اٹھی اودی اودی گھٹا کالی کالی کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی[61]

اقبال مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کے دلدادہ اور صبح کے مناظر و شفق کی سرخی کے

شیدائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال بڑے ہی اہم اور سنجیدہ موضوع کو بھی رنگ و بو اور مناظر قدرت کے استعاروں میں بیان کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ حضرت آدم کے جنت سے رخصت ہونے کا اور زمین کی زبانی اس مہمان کے استقبال کا ذکر صبح کے طربناک منظر اور رنگ و بو کے موسم میں اس طرح کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم 'روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں فرمایا ہے ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ[۶۲]

مندرجہ بالا اشعار کو دیکھ کر دل و نگاہ متحیر رہ جاتی ہے کہ تشبیہ، استعارے اور علامت کا سہارہ لئے بغیر یہ طلسماتی فضا کیونکر تخلیق ہوگئی اور یہی اقبال کے فن کی معراج ہے۔

اقبال کی نظم ''جواب شکوہ'' کے یہ بند قابل غور ہیں ؎

دیکھ کے رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہے چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے[۶۳]

اقبال کی نظم ''ساقی نامہ'' میں جمال فطرت کے سحر انگیز جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظم کی ابتدا ہی بہاریہ ہے۔ درج ذیل اشعار میں رنگ، خوشبو، پھول اور پرندوں کے چہکنے کا ذکر ہے ۔

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور۶۴

نظم کے اس بند میں چمن فطرت کی تصویر پر خزاں کے بعد بہار میں آفتاب کے طلوع ہونے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ محبت اور فطرت کے کنایے شکوہ جواب شکوہ کے راز و نیاز کو ولولہ انگیز بنا دیتے ہیں۔

اقبال فطرت کے گوناگوں مظاہر میں اپنی فکر، احساس اور جذبے کوان سے آمیز ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اسے اپنا اضطراب اور اپنا سکون فطرت کے اضطراب اور سکون سے مماثل نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں فطرت اسے اپنی ہم راز اور ہم نوا معلوم ہوتی ہے۔ وہ فطرت سے محو گفتگو بھی ہوتا ہے، مناظرہ اور مکالمہ بھی کرتا ہے۔ اقبال کا شعری کردار بھی فکر و احساس کی سطح پر ہمیشہ فطرت کے قریب رہتا ہے۔ بانگ درا کی ایک خوبصورت نظم 'رات اور شاعر' میں رات جو فطرت کا ایک مظہر ہے شاعر کی بیدارئ شب اور اس کے اضطراب سے بے چین ہو کر سوال کرتی ہے ۔

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
خاموش صورت گل مانند بو پریشاں

دریا کی تہ میں چشم گرداب سو گئی ہے
ساحل سے لگ کے موج بیتاب سو گئی ہے
شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیوں کر مرے فسوں سے ۶۵

اقبال کی متعدد مختصر نظموں میں فطرت کسی خاص مقصد کو پیش کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ ان کی اس قبیل کی نظموں کی ابتدا فطرت کے مناظر کی سادہ منظرکشی سے ہوتی ہے لیکن اختتام تک پہنچتے پہنچتے فطرت کا رشتہ کسی گہری فلسفیانہ فکر سے استوار ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر 'بانگ درا' کی نظم 'چاند' ہے جس کے ابتدائی بندوں میں شاعر چاند سے اپنے گہرے ربط و تعلق کا اظہار کرتا ہے اور خود میں اور چاند میں متعدد مماثلتیں دیکھتا لیکن آخری اشعار تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنی ہستی کے وجود میں آنے کے اعلی وارفع مقاصد کا آفاقی پیغام دیتا ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
میں رہ منزل میں ہوں تو بھی رہ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے میرے دل میں ہے
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے
پھر بھی اے ماہ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے ۶۶

مندرجہ بالا اشعار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ کس طرح فطرت شاعر کے انکشافات ذات اور عرفان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اقبال نے شاعری کے ہر پہلو کو نئی فضا سے آشنا کرایا۔ ان کے کلام میں مصورانہ منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں جس میں فکری عناصر کے ساتھ مشاہدے کی تیزی اور فطرت کا عمیق مطالعہ شامل ہے۔ ان کے کلام کے ہر لفظ میں ایک تصویر پوشیدہ ہے اور تصویر اپنے پس منظر سے جڑی ہوئی ہے۔

اقبال کو منظر کشی میں مہارت حاصل ہے۔ وہ لفظوں کی ترتیب سے ایسا جادو جگاتے ہیں کہ فطرت کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اقبال کو فطرت سے بہت گہرا لگاؤ تھا اس لئے ابتدا سے انتہا تک ان کے یہاں فطرت کی پیکر تراشی ملتی ہے۔ ان کے کلام میں دریا' پہاڑ' ریگزار' پیڑ' پودے' خار وگل' برگ و بار' اور خزاں' بہار' پھول' کے پیکر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

اقبال کو لالہ کا پھول بہت پسند ہے۔ جہاں کہیں مناظر قدرت کی عکاسی کرتے ہیں وہاں لالہ کے پھول کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے۔ 'لالۂ صحرا' بھی اس قبیل کی ایک خوبصورت نظم ہے' جس میں لالۂ صحرا شاعر کو اپنا ہم زاد معلوم ہوتا ہے کیونکہ دونوں کی کیفیت میں یکسانیت ہے۔ دونوں ہی حقیقت کے متلاشی اور مظہر ہیں۔

یہ گنبد مینائی یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی میں شعلۂ سینائی [67]

اس طرح اقبال کی نظمیں فطرت کے ان سادہ اور روزمرہ نظر آنے والے مظاہر میں ایک نئی معنویت اور ایک نئی کیفیت کا پتہ دیتی ہے۔ بظاہر فطرت کے یہ معمولی نظارے اپنے اندر معنی کی ایک کائنات کا انکشاف کرتے ہیں۔ فطرت کے بہت سے نظارے جو روزمرہ زندگی میں معمولی شئے کی حیثیت رکھتے ہیں ایک شاعر کی نگاہ بینا اور اس کے شعری رویئے اسے غیر

معمولی بنا دیتے ہیں۔

اقبال نے لالہ کے پھول کو علامتی طور پر اپنے کلام میں مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے 'جاوید نامہ' میں جہاں اپنے بیٹے کو فطرت شناسی کی تلقین کی ہے وہیں لالہ وگل کا بھی ذکر کیا ہے ؎

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ وگل سے کلام پیدا کر ۶۸

اقبال کے یہاں منظر نگاری کا مقصد صرف منظر نگاری یا عکاسی یا توصیف فطرت نہیں ہے بلکہ وہ اسے ایک ارفع تر مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔اور وہ ارفع تر مقصد ہے حقیقت کی تلاش وجستجو۔ایک تو ان کی شاعری کا کینوس بہت بڑا ہے اور ان کا لب ولہجہ نشاطیہ اور زندگی آموز ہے۔مناظر فطرت کو استعاراتی انداز میں پیش کرنے پر تو انہیں قدرت حاصل ہے۔اردو شاعری میں پہلے سے بھی شعرا نے مناظر قدرت وفطرت پر نظمیں کہی ہیں مگر اقبال نے اس میدان میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ بے مثال ہے۔

پنڈت برج نارائن چکبست (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۲۶ء): کے یہاں منظر نگاری کی حسین مثالیں پائی جاتی ہیں۔ان کے یہاں فطرت کی تصویریں نہایت واضح انداز میں ملتی ہیں۔ ان کی نظم 'سیر دہرہ دون' میں فطرت کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے ؎

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون — عجیب خطہ دلکش ہے شہر دہرہ دون
کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے — یہ سبزہ زار کھلایا ہے دست قدرت نے
سپرو جدھر نگاہ اٹھے ہر طرف ہے ہریالی — لباس پہنے ہیں گل خشت و سنگ سبزہ کا
بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا — گھنے درخت' ہری جھاڑیاں' زمیں شاداب
لطیف وسرد ہوا' پاک وصاف چشمہ آب — طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ وشجر پہلوؤں میں صف بستہ — یہاں جو آکے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انہیں پہلے سلام کرتے ہیں — بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر

فریب دیتا ہے ندی کا پیچ خم اکثر　　نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا ۶۹

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد پہاڑوں کا صحیح نقشہ نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ان اشعار میں مبالغہ بہت کم ہے۔شاعر نے زیادہ تر مشاہدات کی روشنی میں پہاڑوں کی تصویر کشی کی ہے۔ "جدھر نگاہ اٹھے ہر طرف ہے ہریالی۔" اس مصرع کو پڑھیے تو نظر کے سامنے کوسوں دور تک لہلہاتے ہوئے سبزے کا منظر گھوم جاتا ہے۔ گھنے درخت' ہری جھاڑیاں' زمیں شاداب' یہ مصرع واضح الفاظ میں پہاڑوں کے مناظر پیش کرتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی کی منظر کشی اس سے بہتر اور کسی طرح نہیں ہوسکتی کہ اس کو "سفید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا" کہا جائے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اس نظم کی خوبیاں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"سیر دہرہ دون ان کی منظری نظموں میں بہترین سمجھی گئی ہے۔منظر نگاری کی اکثر خوبیاں اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔جزیات کی تفصیل' تصویروں کی صفائی اور بیانات کی حقیقت کے اعتبار سے یہ نظم اردو شاعری کے مناظر میں ایک منظر کش اضافہ ہے۔" ۷۰

چکبست کی نظم "کشمیر" میں بھی مصورانہ بیان کی جھلکیاں ملتی ہیں۔یہ نظم مسدس کی شکل میں ہے۔اس نظم میں چکبست نے وادیٔ کشمیر کی نہایت خوبصورت مصوری کی ہے۔ان کے یہاں الفاظ کے انتخاب میں میرانیس کا سا سلیقہ پایا جاتا ہے کچھ بند ملاحظہ ہو ے

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا　　چشموں سے پہاڑوں کے وہ اچھلنا
گاتے ہوئے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا　　ڈل کا وہ سر شام ادھر کروٹیں لینا
وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آنا

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا　　وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق' کوہ پہ لالے کا لہکنا　　مستوں کی طرح ابر کے ٹکروں کا بہکنا

ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا

وہ طائر کہسار لب چشمۂ کہسار   وہ سرد ہوا وہ کرم ابر گہر بار
وہ میوہ خوش رنگ وہ سر سبز چمن زار   اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار
یہ باغ وطن روکش گلزار خباں ہے
سرمایہ نازِ چمن آرائے جہاں ہے ۱۵؎

اس نظم میں وادئ کشمیر کے باغ و چمن کا نقشہ صاف ستھرے انداز میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن مناظر میں عمومیت کا احساس ہوتا ہے مقامیت کا کہیں پتہ نہیں۔

❁ ❁ ❁

ترقی پسند تحریک

آزادی سے قبل کا اردو کا شعری ادب ترقی پسند تحریک سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ اردو نظم کو اس تحریک نے ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ ترقی پسند شعرا نے بنیادی طور پر نظم کو ہی اپنے خیالات کی ترسیل کا وسیلہ بنایا۔ یوں تو ترقی پسند شعرا کی ایک طویل فہرست ہے لیکن اہم شعرا میں جوشؔ، فیضؔ، جذبیؔ، مخدومؔ، سردار جعفری، کیفیؔ اعظمی، جانثار اخترؔ، احمد ندیم قاسمی اور ساحرؔ لدھیانوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا میں فیضؔ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ تحریک سے فکری وابستگی کے باوجود ان کا ادبی نظریہ ترقی پسند ادبی نظریے سے مختلف رہا ہے۔ ان کے نزدیک فن کی اہمیت موضوعات سے کم نہیں ہے جب کہ عمومی طور پر ترقی پسند ادبی رویہ یہ رہا کہ شاعری میں اسلوب اور طرز ادا کو ہمیشہ ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

مخدوم اور سردار جعفری دوسرے اہم نام ہیں جن کی تخلیقات میں طرز احساس اور طرز اظہار میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ان شاعروں نے بھی انفرادی احساس کی اہمیت کو قبول کیا۔ ان کے علاوہ دوسرے شعرا مثلاً احمد ندیم قاسمی، جاں نثار اختر، سلام مچھلی شہری اور کسی حد تک کیفی اعظمی کی شاعری میں بھی ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں جن پر ترقی پسند نظریہ شعر کی مکمل چھاپ نہیں ملتی۔ ترقی پسند شاعروں نے رفتہ رفتہ آزاد نظم کی ہیئت قبول کی اور اس کے امکانات سے فائدہ اٹھایا۔

دراصل ترقی پسند شعری جمالیات ''افادیت'' اور ''مقصدیت'' کے اصول پر قائم ہے جس کی رو سے شاعروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی ترجمانی کریں اور بہتر زندگی کی راہ دکھلائیں۔ ترقی پسند تحریک نے جب اپنا انقلابی سفر شروع کیا تو خیال کی

تبدیلی پر ہی بنیادی زور دیا اور اسلوب اور طرز ادا کو وسیلہ سمجھ کر ثانوی یا ضمنی حیثیت دی۔ اس طرح یہ تحریک ''نیچرل شاعری'' کی تحریک کا تسلسل کہی جا سکتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے تحت کہی گئی نظموں میں مناظر فطرت

فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۲ء): فراق گورکھپوری کا شمار منظر نگار شاعر کی حیثیت سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ویسے تو انہیں غزل گو کی حیثیت سے اردو دنیا زیادہ جانتی ہے لیکن ان کی نظمیں بھی خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اپنی شاعری کے آغاز میں یعنی ۲۲۔۱۹۲۰ء میں انہوں نے تین انگریزی نظموں کے ترجمے کئے تھے جن میں دو ان کے مجموعے 'روح کائنات' میں شامل ہیں۔ ان کی فطرت پرستی کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی شاعر شیلی کی مشہور نظم Ode to the west wind سے متاثر ہو کر ان کی نظم ''ترانۂ خزاں'' لکھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری پر مغربی تقلید کا اثر نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے لیکن ایسا صد فی صد درست نہیں۔ ان کی نظموں' غزلوں اور رباعیوں پر فارسی اور اردو شاعری کی بہترین روایتوں کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

فراق گورکھپوری انگریزی ادب سے متاثر ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''انگریزی شاعری کا رچا ہوا مذاق فطرت پرستی (Nature Worship) یا مناظر قدرت سے والہانہ عشق رہا ہے۔ اردو ادب میں ہم کو آپ کو نیچریہ شاعری تو ملتی ہے لیکن یہ شاعری رسمیت یا محض مصوری سے آگے نہیں بڑھتی۔ نیچر کی رمزیت' انسانی زندگی اور خواب زندگی سے منظر قدرت یا ابدی کائنات کی ہم آہنگی یا زندہ رشتے کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ انسانیت کا محض انسانیت ہو کر رہ جانا اسے انسانیت سے محروم کر دیتا ہے۔ زمین' دریا' سمندر' پہاڑ' جنگل' وادیاں' موسموں کا جلوس'

فلکیات اور قدرت کے تمام مظاہر، جانوروں کی زندگی، یہ سب ایسے حقائق ہیں جن سے انسان کو ہم آہنگ ہونا ہے۔''۲ے

فراق کو اساسی طور پر عشقیہ شاعری کے لئے یاد کیا جاتا ہے لیکن فطرت کی پرستش کو بھی انہوں نے اپنی شاعری کے لئے ضروری سمجھا ہے۔ اپنے مضمون ''میری زندگی کی دھوپ چھاؤں'' میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے:

''دھرتی آکاش اور ان کے رنگا رنگ مناظر محض ایک سیر گاہ نہیں ہیں۔ ان کا درشن کر کے ہم اپنا درشن کرتے ہیں۔ ان کا سائنسی شعور ہمارے لئے ضروری اور اہم ہوتے ہوئے بھی ہمیں وہ وجدانی اور جمالیاتی شعور فطرت نہیں دے سکتا جو اس فطرت پرستی (Nature Worship) کی توفیق عطا کرتا ہے۔ جو ہندوستانی تہذیب کی بیش بہا ترین دین یا برکت ہے۔''۳ے

فراق کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ''آدھی رات کو'' ہے۔ اس کے منتخب حصے ملاحظہ کیجیے ۔

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گم شدگی
اک ایک کر کے فسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
فلک پہ تاروں کو پہلی جمائیاں آئیں
گلوں نے چادر شبنم میں منہ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کے مسکراہٹ بھی

ذ را سی سنبل تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوت نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں
سکوت نیم شبی ہے انہیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو[۴۷]

مندرجہ بالا نظم میں آدھی رات کے خاموش اور سرور سے بھرے منظر کی نشاندہی بہت ہی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ اس میں جہاں فراق مناظر سے آوازیں آتی ہوئی سنتے ہیں وہاں آفاق کے لامحدود سکوت کا بھی مستقل احساس انہیں رہتا ہے۔ مندرجہ بالا نظم احساسِ سکوت کی اعلیٰ مثال ہے۔ فراق کی اس نظم کا شمار اردو کی شاہکار نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ نظم میں منظر شب سے فطرت کے مظاہر نمودار ہوتے ہیں جن سے انوکھے طور پر حسن کا ایک ہیولیٰ تیار ہوتا ہے اور نسائی حسن کا یہ خاکہ فطری حسن کے ارتقا کی دین معلوم ہوتا ہے۔

فراق کی دوسری نظم کا عنوان ''پرچھائیاں'' ہے۔ یہ نظم پہلے 'دھندلکا' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو:

یہ شام آئینہ نیلگوں یہ نم یہ مہک
یہ منظروں کی جھلک کھیت باغ دریا گاؤں
وہ کچھ سلگتے ہوئے کچھ سلگنے والے الاؤ
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسماں سے نزول
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
پرانے وقت کے برگد کی یہ اداس جٹائیں
قریب و دور یہ گودھول کی ابھرتی گھٹائیں
یہ کائنات کا ٹھہراؤ یہ اتھاہ سکوت

یہ نیم تیرہ فضا روز گرم کا تابوت
دھواں دھواں سا زمیں ہے گھلا گھلا سا فلک ۵؎

مندرجہ بالا نظم میں شام کے دھند لکے اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔اس میں مقامی رنگ صاف دکھائی دیتا ہے۔مثال کے طور پر الاؤ کا سلگنا' گودھول کا اڑنا وغیرہ خالص ہندوستانی رنگ کو ظاہر کرتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فراق کو صبح وشام اور اس میں رونما ہونے والے فطرت کے عناصر سے خاصا شغف ہے مثال کے طور پر ان کی یہ نظم' جگنو' بھی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

یہ مست مست گھٹا یہ بھری بھری برسات
تمام حد نظر تک گھلاوٹوں کا سماں
فضائے شام میں ڈورے سے پڑتے جاتے ہیں
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے
دہک اٹھا ہے طراوت کی آنچ سے آکاش
ز فرش تا فلک انگڑائیوں کا عالم ہے
یہ مد بھری ہوئی پروائیاں سنکتی ہوئی
جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا

یہ شاخسار کے جھولوں میں پینگ پڑتے ہوئے
یہ لاکھوں پتیوں کا ناچنا یہ رخص نبات
یہ بے خودئی مسرّت یہ والہانہ رقص
یہ تال سم' یہ چھما چھم کہ کان بجتے ہیں
ہوا کے دوش پہ کچھ اودی اودی شکلوں کی
نشے میں چور سی پرچھائیاں تھرکتی ہیں
افق پہ ڈوبتے دن کی جھپکتی ہیں آنکھیں
خموش سوز دروں سے سلگ رہی ہے یہ شام ۶؎

مندرجہ بالا اشعار میں بھری برسات کی رات کا اتنا خوبصورت اور فطری منظر بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں پر فطرت کی مصوّری میں محویت اور ٹھہراؤ کا عنصر نمایاں طور پر دیکھائی دیتا ہے اور برسات کی ایک جگنوؤں کے ہجوم سے جگمگاتی ہوئی رات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ یہاں شاعر نے منظر کشی میں ایک محاکاتی فضا قائم کردی ہے جو کہ کسی بھی منظر نگاری کی کامیابی کا ضامن ہے۔

فراق نے اس نظم میں بیس برس کے ایک نوجوان کے جذبات رقم کیے ہیں جس کی ماں اسی دن مرگئی جب وہ پیدا ہوا۔ ماں کے بغیر مکان کے صحن، سن رسیدہ پیپل، اس پر پڑے جھولوں، پہلی جنگ عظیم کے جنمے اندیشوں، صبحوں اور شاموں کا منظر پیش کیا ہے اور ایک یتیم کے مختلف ادوارِ زندگی کو گہرے جذبے سے بیان کیا ہے۔ یہ ماں سے منسوب اردو کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ نظموں کے علاوہ فراق کی رباعیوں میں بھی فطری منظر نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے مجموعے کلام 'روپ' کی رباعیوں میں منظر نگاری کے خوبصورت مرقعے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک رباعی دیکھیے

یہ رات فلک پر تھرتھراتا سا غبار
شیشے پہ نرم نرم پڑتی ہے پھوار
یا بیٹھ کے ماہ نو میں دیوی کوئی
چھیڑے ہوئے راگنی بجاتی ہے ستارے

سکوت شب کا ساز اور مترنم آہستہ خرامی فضا آفرینی کا کھلا ہوا ثبوت پیش کرتی ہے۔ فراقؔ کی منظری شاعری کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ٹھوس اور جامد کائنات کا ہر نظارہ گویا سانس لے رہا ہے اور نغموں میں تحلیل ہوتا جارہا ہے۔ سکوت اور آواز گویا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور یہ ازل سے ابد تک آپس میں آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۸ء۔۱۹۸۲ء): جوشؔ ملیح آبادی کا شماران باکمال شاعروں میں ہوتا ہے جن کی نظیر زمانہ دوبارہ پیدا نہیں کرسکے گا۔ بیسویں صدی میں ٹیگور اور اقبالؔ کے بعد

جتنی عزت، شہرت اور مقبولیت جوشؔ کو نصیب ہوئی، کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ جوشؔ ہماری کلاسیکی شعری روایت کے آخری بڑے نظم گو شاعر ہیں۔

بنیادی طور پر تو جوشؔ کو شاعر انقلاب کہا جاتا ہے لیکن ان کے موضوع سخن کا دوسرا اہم اور روشن پہلو ان کا حسن فطرت سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں فطرت کے حسن و جمال کے جو مرقعے کھینچے ہیں اور البیلی صبحوں، ڈھلتی شاموں، ساون کے مہینوں اور گرجتی برستی گھٹاؤں سے آواز کی سیڑھیوں کے ذریعے جو باتیں کی ہیں، اور دن، رات، لو، گرمی، تپش، بہار اور برسات کی جو کیفیتیں بیان کی ہیں وہ پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ واقعتاً جوشؔ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اتنی توجہ نہیں ہوئی جتنا کہ اس کا حق ہے۔

جوشؔ کی فطرت پسندی کا بین ثبوت تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اوّلین تصنیف ''روح ادب'' فطرت کی نذر کی ہے۔ مناظر فطرت کے خصوصی مطالعے و مشاہدے اور اس کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے انہوں نے ملیح آباد میں ایک خصوصی مکان ''قصر سحر'' کی تعمیر بھی کرائی تھی، جہاں سے وہ صبح و شام، دن رات، چاند سورج، اُفق، شفق، مناظر برسات، شجر و حجر، چڑیوں کی چہکار اور اسی طرح کے مختلف مناظر قدرت بہ نظر عمیق مطالعہ و مشاہدہ کیا کرتے تھے۔

جوشؔ کا یہ شعر ان کی فطرت پرستی کا بین ثبوت ہے، حالانکہ اس کا موضوع عقیدہ ہے ؎

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ویسے تو جوشؔ ملیح آبادی نے دیگر شعراء کی طرح مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے لیکن فطرت بھی ان کی شاعری کا بہت ہی اہم موضوع رہا ہے۔ جوشؔ کو فطرت سے والہانہ ربط تھا جس کی بنا پر ان کے اوپر تجسّس کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ اس رنگ و بو کے پردے میں حسن مطلق کو بے نقاب دیکھنا چاہتے تھے۔ اسکی مثال ان کے مجموعے ''روح ادب'' کی چند منظریہ نظموں میں ملتی ہے۔ ''برقِ عرفاں'' ''پانچ نغمے'' ''ہماری سیر'' وغیرہ اس کی

چند مثالیں ہیں ۔

جب صبح کا ستارہ ذرّوں کو جگمگائے
تو اک زرا نکل کر پردے سے مسکرائے
لہریں ہنس ہنس کر عجب نغمے سناتی ہیں مجھے
ڈالیاں پھولوں کی جھک جھک کر بلاتی ہیں مجھے
شاخیں اپنے سائے میں پہروں بٹھاتی ہیں مجھے
ندّیاں اپنے کنارے پہ سلاتی ہیں مجھے
کوئی مجھ کو رنج ان احباب میں دیتا نہیں
اور اس خدمت کی قیمت بھی کوئی لیتا نہیں ۸ے

جوشؔ کی ایک طویل اور مکمل منظری نظم ''طوفان بے ثباتی'' ہے۔اس میں شاعر نے صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیانی وقفہ کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ تارے ڈوبنے ہی والے ہیں، پو پھٹنے کو ہے، نسیم صبح اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ بہ زبان شاعر ان حسین مناظر کو ملاحظہ کریں ۔

چاندنی تھی، صبح کا ہنگام تھا
میں یکا یک اپنے بستر سے اٹھا
ڈوبتے تاروں کو دیکھا غور سے
آنکھ میں اشکوں سے طوفاں آ گیا
ذرّہ ذرّہ میں زمیں سے تا فلک
موجزن تھا اک سمندر حسن کا
وہ نسیم صبح کی اٹکھیلیاں
وہ ترنم خیز جھونکے وہ ہوا ۹ے

ان کی ایک نظم ''جامن والیاں'' ہے جس کی تخلیق ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ اس نظم کا شمار جوشؔ کے مجموعے 'نقش و نگار' کی نمائندہ نظموں میں ہوتا ہے۔اس کے چند بند اس طرح ہیں ۔

روح شاعر آج پھر ہے وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی
غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہوا
پتّی پتّی اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئی ۸۰؎

جوشؔ کی مناظر فطرت پر کہی گئی نظموں کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فطرت کی آغوش میں سکون واطمینان محسوس کرتے ہیں تھوڑی دیر کے لئے حسن فطرت میں محو ہو کر ان کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو جاتے ہیں اور یہی اسلوب بیان قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔'برسات کی ایک شام' 'پیغمبر فطرت' 'نغمہ مسجد' 'برسات کی شفق' 'البیلی صبح' 'گریۂ مسرت' 'کلیوں کی بیداری' 'بدلی کا چاند' وغیرہ اس قبیل کی نظمیں ہیں۔

جوشؔ نے 'گریۂ مسرّت' میں ندی کی روانی کو یوں پیش کیا ہے ؎

جھاگ اُڑاتی 'پھاندتی' اُڑتی ہوئی — کپکپاتی' لوٹتی' مڑتی ہوئی
چُلبلی ' اُبھری ہوئی نکھری ہوئی — چیختی' سر پھوڑتی ' بپھری ہوئی
بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی — دم بدم آتی ہوئی جاتی ہوئی
اس طرف سے اُس طرف ہوتی ہوئی — پتھروں کو چھانٹتی دھوتی ہوئی ۸۱؎

جوشؔ نے اپنی نظم 'کسان' میں شام کے خاموش منظر کو پیش کیا ہے۔شام کے وقت دریا کی نرم روی اور شفق کے بدلتے ہوئے رنگ مناظر فطرت پر ایک سحر انگیز رنگ طاری کر دیتے ہیں۔مندرجہ بالا اشعار جوشؔ کے جمالیاتی احساس کے اظہار کی بہترین مثال ہیں ؎

جھٹپٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب — کھیتیاں میدان خاموشی غروب آفتاب
زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود — مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا — شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلہ
دُوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سُرور — چرخ پر بادل زمیں پر تتلیاں سر پر طیور

پتیاں مخمور کلیاں آنکھ چھپکاتی ہوئی نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی ۸۲؎

جوش نے اپنی نظموں میں اکثر جھٹ پٹا' لفظ کا استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں سورج ڈوبتے وقت کا اندھیرا۔ گویا شاعر کے دل کو غروب آفتاب کے بعد شفق کا منظر اور اندھیرے اور اجالے کی ملی جلی کیفیت کچھ زیادہ ہی پسند تھی۔

جوش کی ایک نظم ''شب ماہ'' چاندنی رات کے مناظر مثلاً کلیوں کا تبسم' ستاروں کا جمال' دریا کا نکھار' سکوت کوہسار' ہوا کے سسکتے جھونکے' جھاڑیوں میں جگنوؤں کا انتشار وغیرہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ شاعر کے الفاظ بھی ان مناظر کی دلکشی کو بعینہ ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتے ؎

الاماں کیا چاندنی چھٹکی ہوئی ہے دور تک
گر رہے ہیں خاک پر چاندی کے لاکھوں آبشار
یہ شگوفوں کا تبسم' یہ ستاروں کا جمال
موج رنگیں کے یہ ہلکورے یہ دریا کا نکھار
اجلی اجلی چوٹیوں پر یہ روپہلی چاندنی
دور تک یہ جھاڑیوں میں جگنوؤں کا انتشار
یہ سسکتے سرد جھونکے کارواں در کارواں
یہ ہمکتی چلبلی موجیں قطار اندر قطار
آہ اے فطرت! تیری برنائیوں کے سامنے
بہترین الفاظ ہو جاتے ہیں شرمسار ۸۳؎

جوش کی ایک نظم ''بدلی کا چاند'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خورشید' وہ دیکھو ڈوب گیا' ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب' وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگے
سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے کہسار کا سر چکرانے لگا
پردہ جو اٹھایا بادل کا دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی میدان کا دل گھبرانے لگا
ابھرا تو تجلی دوڑ گئی ڈوبا تو فلک بے نور ہوا ۸۴؎

بدلی کے چاند کا یہ خوبصورت منظر بظاہر ہر شخص نے دیکھا ہوگا لیکن جوش نے اس منظر کو لفظوں کے حصار میں جس طرح مقید کیا ہے اس کی دوسری مثال اردو شاعری میں بہ مشکل ہی ملتی ہے۔

نظم ''رم جھم'' (۱۹۵۰ء) میں موسم برسات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ رم جھم برستا ہوا پانی، اڈے ہوئے بادل، ندی نالے جل تھل، چاروں طرف پھیلی ہریالی جیسے خوشنما مناظر انسان کو متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

سنکتے جھونکوں میں زندگانی، کھنکتی بوندوں میں دل ستانی
زمین طوفان شادمانی، تو آسماں سیل کامرانی
چمک رہے ہیں رواں فسانی گرج رہی ہے رواں کہانی
شراب کھلتا ہوا شگوفہ، شباب کھلتی ہوئی کہانی
اٹھو کہ رم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی
بجا رہا ہے ستار پانی ، بجا رہا ہے ستار پانی!
اٹھو کہ رم جھم برس برس کر بجا رہا ہے ستار پانی ۸۵؎

نظموں کے علاوہ جوش ملیح آبادی نے غزلوں اور مرثیوں میں بھی فطری منظر نگاری کے دلفریب مرقعے پیش کئے ہیں۔ انکی نظم گوئی کی شروعات ہی نظم ''امانی گنج کا باغ'' اور ''ہلال محرّم'' جیسے موضوعات سے ہوئی ہے۔ انھوں نے اقبال کی طرح فطرت سے پیغام رسانی کا کام نہیں لیا بلکہ فطرت کو خدا کا حسین تحفہ اور عرفان خداوندی کا ذریعہ تصوّر کیا۔

یہی وجہ ہے کہ فطرت برائے فطرت کے نمونے جوشؔ کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی فطری منظر نگاری میں فطرت کے ذی روح ہونے کا تصور، انسان کے لئے فطرت میں جذبۂ احترام، فطرت کا داخلی بیان، فطرت سے انسان کی ہمدردی، قدرتی مناظر اور انسانی جذبات کا باہمی امتزاج وغیرہ شامل ہیں۔ اس سلسلے میں آثر لکھنوی نے جوش کے کلام کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے:

''جوشؔ کی نظمیں اوّل سے آخر تک پڑھ جایئے، جتنے مناظر ہیں، منظری حیثیت سے بہشت نظر اور ترنم الفاظ و شگفتگی و تراکیب کے اعتبار سے فردوس گوش اور حلاوت و عدوبت کے لحاظ سے بادۂ کوثر کے چھلکتے جام ہیں، مگر ان میں آلودگئ نفس کا شائبہ نہیں اور یہی ایک فطری شاعر کی پہچان ہے۔'' ۸۶؎

عبدالمغنی کے لفظوں میں:

''مناظر فطرت اور ان کی خیال انگیزیوں سے جوش نے بڑی رنگیاں اور شاداب تشبیہیں اور تصویریں مرتب کی ہیں۔ جوشؔ نے فطرت کو معرفت اور بصیرت کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔'' ۸۷؎

جوشؔ کے تمام ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ جوشؔ کے یہاں مناظر فطرت کی کامیاب عکاسی ملتی ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی ان نقادوں میں ہیں جو جوش کو فطرت کا پرستار اور اردو کا ورڈس ورتھ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کا ماننا ہے کہ جوش کے یہاں فطری مناظر کی جو پر کیف اور پر جوش عکاسی ملتی ہے اس کی نظیر ہمارے ادب میں بہت کم ہے۔ فطرت ان کے یہاں محض سادہ ورق نہیں بلکہ بولتی گاتی ہوئی حقیقت ہے جو رموز و نکات کھولتی چلی جاتی ہے۔ جذبات کو جگاتی ہے، خیالات کو جنم دیتی ہے اور افکار و احساس کے نہ جانے کتنے پھول کھلاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

سجاد ظہیر (۱۹۰۵ء۔۱۹۷۳ء): اردو ادب و شاعری میں سجاد ظہیر کی شخصیت نابغۂ روزگار کی ہے۔ان کی پیدائش گولا گنج لکھنؤ میں ہوئی۔ان کے والد کا نام وزیر حسن تھا۔ان کو گھر کے لوگ پیار سے بنّے کہتے تھے۔ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق گھر پر حاصل کی پھر لکھنؤ کے اسکول میں داخلہ ہوا۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ آکسفورڈ گئے اور وہاں تاریخ اور معاشیات میں اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوئے۔

سجاد ظہیر کا شمار اردو دنیا میں ایک مصنف، ناول نگار، شاعر، مختصر افسانہ نویس کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وہ مارکسی نظریے کے حامل اور ترقی پسند تحریک کے اولین علم برداروں میں ہیں۔انہوں نے اپنے کئی منظوم اور نثری سرمایے اردو دنیا کو دیئے ہیں جن کے نام انگارے، پگھلا نیلم، لندن کی ایک رات، ذکر حافظ، بیمار (ڈراما) اور روشنائی وغیرہ ہیں۔

سجاد ظہیر بنیادی طور پر نثر نگار اور افسانہ نگار تھے لیکن جدت پسند طبیعت کے مالک بھی تھے۔اسی جدت پسندی کے سبب انہوں نے ادب و شاعری کے مختلف گوشوں پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی اور فنی روایات میں بعض اہم اضافے کئے۔انہوں نے اردو شاعری کے میدان میں اپنی نثری نظم کے مجموعے ''پگھلا نیلم'' سے ایک نیا تجربہ پیش کر کے ادبی ورثے میں قابل ذِکر اضافہ کیا۔

سجاد ظہیر کی نظموں کا موضوع زیادہ تر سیاسی، سماجی، انسانی اور عشقیہ ہے لیکن سبھی موضوعات میں ایک جمالیاتی فضا دکھائی دیتی ہے اور زندگی کی کڑوی حقیقتیں بھی ان جمالیاتی فضاؤں میں سانس لیتی ہیں ایسے میں بے پناہ دلکشی جذب کر لیتی ہیں۔منظر نگاری کے نمونے بھی ان کی نظموں میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

ان کی ایک نظم ''برسات کی رات'' ہے۔اس نظم میں دلکش منظر نگاری ملاحظہ کیجیے ؎

بھیگی ہری اوڑھنیاں اوڑھے
جوہی۔۔۔۔چنبیلی
چمپا کامنی
رس بھری ہواؤں کے

تھپیڑوں سے
کپکپاتی ہیں گھپ اندھیرے میں
جگنوؤں کی بے آواز بوندیں
ٹپکتی ہیں۸۸؎

مندرجہ بالا نظم میں خوبصورت تشبیہ و استعارے اور علائم نے نظم کو پرکشش بنا دیا ہے بھیگی ہری اوڑھنیاں، رس بھری ہواؤں کے تھپیڑے، جگنوؤں کے بیچ بے آواز ٹپکتی بوندیں سب مل کر خوبصورت امیجری پیدا کر دیتے ہیں۔

سجاد ظہیر کے پاس خوبصورت اور حسین الفاظ کا بیکراں خزانہ ہے۔ خوبصورت فقرے اور نئی تشبیہات و استعارات نے نظموں کو جمالیاتی فضا اور خوشگوار رعنائی عطا کی ہے۔ ان کے مجموعے پگھلا نیلم کی دو نظمیں ''پرانا باغ'' اور ''ہونٹوں سے کم'' ہیں جو اس سلسلے میں درج کی جاتی ہیں ؎

اک یاد کی خوشبو آتی ہے
رنگین و منقش
تتلی کے تھرتھراتے پر جیسے
لیکن، وہ بھی
اک جھونکا لے کر
اڑ جاتی ہے۸۹؎

دوسری نظم ''ہونٹوں سے کم'' کے یہ مصرعے جو شعریت سے بھرپور موسیقیت کی جھنکار لئے ان نظموں کی فضا کو غنائیت عطا کرتے ہیں ؎

نور کی بارش ہوتی ہے
جھرنے بہتے ہیں نغموں کے

اور لمبے، قد آور پیڑ چنار کے
اپنے جھل مل سبز خنک سایوں کو
پھیلاتے ہیں ۹۰

مندرجہ بالا نظموں میں سجاد ظہیر نے خوبصورت الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ زبان کی نرم روی، سادگی اور پرکاری سب نے مل کر نظم کو دل کش اور منظر نگاری سے بھرپور اور پراثر بنادیا ہے۔

اختر شیرانی (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۴۸ء): اختر شیرانی بمقام ٹونک محلہ مہدی باغ راجستھان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کل تینتالیس سال کی مختصر عمر پائی لیکن اتنی مختصر زندگی پانے کے باوجود اردو نثر و نظم میں ان کی جو یادگاریں ہیں وہ کسی طرح بھی کم نہیں اور ان کی انہیں تخلیقات نے انہیں زندگی دوام عطا کی ہے۔

بیسویں صدی کی اردو شاعری میں، خصوصا اردو رومانی شاعری کی تاریخ میں اسرار الحق مجاز کے بعد خالص رومانی شاعر کی حیثیت سے جس فنکار نے مستقل شہرت حاصل کی ہے اسے ادبی دنیا اختر شیرانی کے نام سے جانتی ہے لیکن شاعر رومان کے علاوہ وہ بہت کچھ ہیں افسانہ نگار، مکتوب نویس، ڈرامہ نگار، صحافی، مترجم غرض مختلف علمی و ادبی حیثیتوں کے مالک ہیں۔

اختر شیرانی نے اگرچہ متعدد غزلیں لکھی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی پہچان ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں قائم ہوئی ہے۔ رومان ان کی نظموں کا مرکزی محور ہے۔ انہوں نے اپنی رومانی نظموں میں جن نسائی ناموں کا بار بار ذکر کیا ہے ان میں ایک 'سلمہ' اور دوسری 'ریحانہ' اور 'عذرا' ہیں۔

بسا اوقات رومانی فنکار اپنے کلام کو کئی رنگوں کی آماجگاہ بنا دیتے ہیں۔ ان رنگوں میں بہت ہی نمایاں رنگ فطری مناظر کا رنگ ہے۔ اپنی نظم 'گجرات کی رات' میں انہوں نے

برسات کی رات کے منظر کو پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے ۔

آج قسمت سے نظر آئی ہے برسات کی رات
کیا بگڑ جائے گا ' رہ جاؤ یہیں رات کی رات
ہائے وہ مست گھٹا ہائے وہ سلمیٰ کی ادا
آہ ! وہ رود چناب آہ ! وہ گجرات کی رات
اف وہ سوئی ہوئی کھوئی ہوئی فطرت کی بہار
اف وہ مہکی ہوئی بہکی ہوئی برسات کی رات ۹۱

اس نظم میں محبوبہ کا جو حسّی اور لمسی پیکر موجود ہے اس کے ساتھ مقامی وفطری مناظر کا آمیزہ اختر کے عشق اور محبوبہ کی ارضیت کو بہت نمایاں کر دیتی ہے۔

اختر کی شاعری کی رومانیت کی مختلف النوع شکلیں ہیں۔ ان کی رومانی شاعری میں کئی جگہ دھرتی کی بو باس بھی موجود ہے۔ نظم 'نغمۂ سحر' ملاحظہ ہو ۔

فضا پر بستیوں پر جنگلوں پر
دھواں دھار ایک بدلی چھا رہی ہے
چھما چھم مینہ کی بوندیں پڑی ہیں
کہ ساون کی پڑی کچھ گا رہی ہے
نئے بھیگے ہوئے سبزے کی خوشبو
ہوا کے ساتھ اڑ کر آ رہی ہے
صبا کے مست جھونکوں کے اثر سے
خوشی سی دل میں اٹڈی جا رہی ہے ۹۲

اختر کی رومانی شاعری میں منظر نگاری کا حسن پنہاں ہے اور یہ مناظر قدرت انجانے اور تخیلی نہیں ہیں' بلکہ اس میں اپنے وطن کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ نظم 'نغمۂ سحر' کے آخری بند کے اختتام پر دیہات میں صبح کی آمد کا نیچرل منظر ملاحظہ ہو ۔

سیاہی اڑتی جاتی ہے افق سے
عروس صبح بڑھتی جا رہی ہے
شوالے میں گجر بھی جاگ اٹھا
ٹھنا ٹھن ٹھن کی آواز آرہی ہے
کوئی چڑیا نکل کے گھونسلے سے
گھنے جنگل میں منگل گا رہی ہے
کوئی بکری کہیں کرتی ہے میں میں
کوئی بچھیا کہیں چلا رہی ہے ۹۳

اس نظم میں بے جا طوالت کے باوجود نظم کی سب سے بڑی خوبی دیہی مناظر کا بے باک اور فطری بیان ہے۔ان کی دیگر نظموں مثلاً ''اے سر زمین گجرات'' ''وادی گنگا میں ایک رات'' وغیرہ میں بھی ان کی پسندیدہ کائنات کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ایک نظم ''دنیا کی بہار'' بھی نہایت پر اثر اور منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو

نہ لے جا خلد میں یارب' یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

جوش ملیح آبادی کی طرح اختر شیرانی نے بھی فطرت کو پیچ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی ایک مشہور رومانی نظم 'برکھارت' اس میں شیرانی نے فطری مناظر کا بہت ہی خوبصورت التزام کیا ہے ؎

آسماں پر چھا رہا ہے ابر پاروں کا ہجوم! نو بہاروں کا ہجوم!
آہ یہ رنگیں آوارہ نظاروں کا ہجوم ! کوہساروں کا ہجوم!
ننھی ننھی بوندیں گرتی ہیں حجاب ابر سے ! یانقاب ابر سے !
چھن رہا ہے قطرے بن بن کر ستاروں کا ہجوم! نور پاروں کا ہجوم! ۹۴

اختر کو فن کاری کے بہت سارے ہنر معلوم ہیں بلکہ انہیں لفظوں کا مزاج داں کہا جائے

تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک نظم 'شب ہائے رفتہ' کے آخری مصرعے میں جو طریقہ اظہار ہے وہ کہیں اور بہ مشکل دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا قلم بے جان میں بھی جان پیدا کر دیتا ہے

سردیوں کی چاندنی شبنم سے کمہلاتی تھی جب
باغ پر اک دھندلی دھندلی مستی چھا جاتی تھی جب
آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے ۹۵

سردیوں کی چاندنی کا شبنم سے کمہلانا اور باغ پر مستی کا چھا جانا کیسی محاکاتی تصویریں پیش کرتا ہے۔ ایسی جاندار تصویریں اختر کے یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان بنائی ہوئی تصویروں میں بقول اختر اورینوی تخلیقی فن کاری (Creative Art) ہے۔

اختر نے اپنے خیالات اور محسوسات کے اظہار کے لئے خوب سے خوب تر پیمانے تلاش کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مختلف ہیئتوں کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ ان کے کلام میں نظم مسمط اور اس کی تقریباً تمام شکلیں ترکتب بند اور ترجیع بند، غزل، قطعہ، رباعی، فردیات، مستزاد، گیت، سانیٹ، ماہیے سبھی نمونہ ہائے فن موجود ہیں۔

'او دیس سے آنے والے بتا' کافی طویل نظم ہے اور اس نظم کی اہم خوبی اس کا ہندوستانی رنگ و آہنگ ہے۔ ہندوستانی گاؤں کی معصوم منظر کشی، فطری نظارے، وہاں کے کھیت، جنگل، مور، جھینگر، تالاب، دریا کا خواب آور گھاٹ، مستی بھری ہوائیں، پربت پر گھنگھور گھٹائیں یہ سارے دلکش مناظر ایک خوشنما ماحول سازی کا کام کرتے ہیں ؎

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب کنارِ دریا پر؟
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں شاداب کنارِ دریا پر؟
اور پیار سے آ کر جھانکتا ہے مہتاب کنارِ دریا پر؟
دریا کا وہ خواب آلودہ گھاٹ اور اس کی فضائیں کیسی ہیں؟
وہ گاؤں، وہ منظر، وہ تالاب اور اس کی ہوائیں کیسی ہیں؟
وہ کھیت، وہ جنگل، وہ چڑیاں اور ان کی صدائیں کیسی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا! ۹۶

اختر شیرانی کی ایک علامتی نظم' آثار سحر' ہے۔اس نظم میں سحر کا حسین جلوہ دیکھایا گیا ہے پھولوں کا گدگدانا' مشرق میں عروس نور کا جاگنا' سارے جہاں کی قسمت کا چمکنا' طائران گلشن کا جاگنا' غور کیا جائے تو صبح کی منظر نگاری میں ایک نئی صبح کا خواب پنہاں ہے۔

اختر شیرانی ایک رومانی مزاج شاعر تھے اور جہاں رومانیت مزاج میں ہو وہاں فطرت پرستی کا عکس بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔نظم' کرنوں کا گیت' ہو یا باغوں کی بہاریں' ایک لڑکی کا گیت یا تاروں کی بستی' یا بانسری کی آواز یہ تمام منظومات فطری مناظر سے لبریز ہیں۔

اختر شیرانی کی ایک بہت ہی پیاری نظم'' آج کی رات'' ہے یہ رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ نیچرل شاعری کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

اختر کی شاعری کے سلسلے میں عبارت بریلوی کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

''ان کے نغموں اور نالوں سے متاثر ہوکر ہم انہیں خالص رومانی شاعر کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں'' ۹۷

اختر شیرانی کا مطالعہ گویا ایک پوری نسل کا مطالعہ ہے۔ان کے اثرات قبول کرنے والوں میں ن م راشد' مرزا ادیب' احمد ندیم قاسمی' مجاز' ساحر' فیض احمد فیض اور جمیل مظہری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اختر اورینوی (۱۹۱۰ء۔۱۹۷۷ء): اختر اورینوی کا وطن' کا کو' ضلع گیا تھا۔انہوں نے ہائی اسکول کی تعلیم مونگیر سے حاصل کی۔سائنس کالج پٹنہ سے آئی ایس سی کیا۔اس کے بعد انہوں نے ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا لیکن علالت کی بنا پر انہیں اسے چھوڑنا پڑا۔علالت اور نہایت نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے انگریزی آنرس اور اردو میں ایم اے میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور طلائی طمغے بھی حاصل کیئے۔بعدازاں لکچرر پٹنہ کالج بحال ہوئے۔

اختر اورینوی کی شعری و ادبی خدمات بے حد اہم اور وقیع ہیں۔وہ بیک وقت افسانہ نگار' ناول نگار' تنقید نگار' ڈرامہ نگار' محقق اور شاعر ہیں۔ان کے مجموعے کلام'' انجمن آرزو'' (۱۹۶۴ء) اور'' یک چمن گل'' (۱۹۶۹ء) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے

گلشن شعرو شاعری میں دیدہ زیب اضافے کئے ہیں۔ نیز یہ مجموعے اختر اورینوی کی شخصیت اور فکر و خیال کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں۔

اختر اورینوی نے دیگر موضوعات کے علاوہ فطری منظر نگاری کو بھی اپنے کلام میں بطور خاص پیش کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ''گوآ'' ہے۔ یہ ایک محاکاتی نظم ہے جس میں گوآ کے جغرافیہ اوراس کی خوبصورت فضا کے بیان سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ نظم تو دراصل گوآ کی آزادی پر لکھی گئی ہے لیکن نظم شروع ہونے کے بعد کافی دور تک ایک منظری نظم کی سجاوٹ سے پُر دیکھائی دیتی ہے۔ کچھ بند درج ذیل ہیں ؎

چھٹا کہرا!
چمکتا ہے حسیں سورج!
ذرا دیکھو فضا کی دھج!

زمیں سے آسماں تک ایک سیل نور جاری ہے
تھرکتی ناچتی کرنوں پہ وجد و حال طاری ہے
گگن نیلا، پون ہولے چلے مستی میں اتراتی
کرن کنچن ہر اک سو رقص کرتی سونا برساتی
دلاری دھوپ نکلی ہے دلہن کے روپ میں سج کر
فضا آئینہ ساماں ہے، پرندے پیار سے نغمہ گر ۹۸

مندرجہ بالا نظم میں گوآ کے حسین قدرتی مناظر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ہندی کے الفاظ جابجا استعمال کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دھج، گگن، پون، کرن، کنچن وغیرہ جو نظم کے اسلوب میں نکھار پیدا کرتا ہے۔

ان کی ایک نظم ''کوئل'' ہے۔ یہ ایک رومانی نظم ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد انگریزی کے رومانی شاعر کیٹس کی مشہور نظم Ode to a nightingle کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس نظم کے کچھ بند درج کئے جاتے ہیں ؎

امر جیوتی کوک ہے تیری امرت کی ہے دھار
مدھر بولی سے تیرے گونجے بستی اور کہسار
سب میں ایسا جذبہ بھر دے جاگ اٹھے سنسار
آشا کو بل بوتا دے دے ناؤ ہے منجدھار
ٹوٹا ہے پتوار! کوک' کوک' اے کوئل کوک ۹۹

اس نظم کی پوری فضا خالص ہندوستانی ہے اور مقامی رنگ ہر جگہ جھلکتا ہے۔ ہندی الفاظ' علامات اور ترکیبوں کے ذریعہ مناظر کو شاعر نے محاکاتی رنگ دے دیا ہے۔

اختر اورینوی کی ایک نظم ''دھان کا کھیت'' ہے جو ایک خوبصورت منظری نظم ہے۔ اس نظم میں نقاشی کے ساتھ ساتھ مصوّری بھی دکھائی دیتی ہے۔ مثالیں درج ذیل ہیں ؎

پودے ہیں دھان کے یا
اتری ہیں سبز پریاں
یا سبز پوش عذریٰ
نظریں ہیں میری حیراں
کشت زمرّدیں پر
شبنم کے چھوٹے قطرے
قالین مخملیں پر'
موتی ٹکے ہوں جیسے ۱۰۰

مندرجہ بالا بندوں میں الفاظ کا حسن شاعر کی وسعت مشاہدہ کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں کائنات کے خارجی مناظر و مظاہر کی خوبصورت جلوہ گری سے نظم کی لطافتوں میں دلکشی اور دل آویزی پیدا ہوگئی ہے۔

ان کی ایک نظم ''جگنو'' ہے جو حسن فطرت کی رعنائیوں سے معمور ہے۔ شاعر نے خوبصورت تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا ہے جس سے منظر نگاری کا حسن کو دوبالا ہو گیا ہے ؎

جگنو نہیں بجلی ہے
ہاں مثبت منفی ہے
عاشق کی سیہ بختی
معشوق کی شوخی ہے
خورشید کا ذرّہ ہے
یا برق کا ٹکڑا ہے
داغ دل افسردہ
خال رُخ زیبا ہے[۱۰۱]

جگنو بہت تراشیدہ اور خوبصورت منظری نظم ہے۔ شاعر نے نگار خانۂ فطرت میں حسن کی جھلک دیکھی ہے اور اپنے احساس، اسلوب اور تخیل کی مدد سے اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی ہے۔

اختر کی ایک نظم کا عنوان ''پیام فطرت'' ہے جو عنوان کے اعتبار سے بھی منظری نظم معلوم ہوتی ہے۔ اس نظم پر اقبال کے اثرات نمایاں طور پر دیکھائی دیتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے صحرا کی رنگینی اور دلربائی کا تذکرہ کچھ اس طور پر کیا ہے کہ فطرت کی عریانی اور فراوانی کو دیکھ کر قاری کا دل بھی ان جلووں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کرتا ہے۔ اس میں شاعر نے جنگل کو حسن و کیف کا گلستاں قرار دیا ہے۔ اس نظم کا درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

حقیقت حسن سے مل کے گلے، وادی میں رقصاں ہے
یہاں ہر خار سے پیدا جمال صد گلستاں ہے

''پیام فطرت'' ایک رومانی تجربہ ہے جس میں فطرت کی رعنائیاں موجود ہیں۔ اس نظم پر اقبال کی نظم 'ایک آرزو' کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

اختر اور ینوی کو دریائے سون سے ایک والہانہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے اس موضوع پر کئی نظمیں تخلیق کی ہیں جو منظر نگاری کا ایک خوبصورت مظہر ہیں۔ ان نظموں میں ''دریائے سون'' ''رومان رفتہ'' اور ''ابدی رات'' قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں دریائے سون کے حسین اور

دلکش مناظر کا بیان ملتا ہے۔

نظم ''دریائے سون'' میں سون کی شان وشوکت کے ذریعے زندگی کے پیہم رواں رہنے کا تجربہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں تخیلات کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کا روشن پہلو بھی دیکھائی دیتا ہے

مرمر سیّال ہے تو سون یا سیم رواں
ریت کے ذرّوں کی تابانی ہے رشک کہکشاں
نور کی پریاں فضاؤں میں تری ہیں پرفشاں
تیرے دامن میں ہیں کتنے جلوہ ہائے دلستاں

سر بہ سر تنویر ہے تو رود بار تیز رو!
تو سراپہ حسن ہے آماجگاہ نور ضو! ۱۰۲

''دریائے سون'' عظمت رفتہ کی گواہ' احساس جمال میں ڈوبی ہوئی اور پیام فطرت کی مظہر ایک شاہکار نظم ہے۔ اس نظم میں سادگی اور روانی کے ساتھ آہنگ میں نغمگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ اختر شیرانی کی طرح اختر اورینوی کے یہاں بھی فطری رومان پرستی اور مصوری کے نمونے خاص طور پر دیکھائی دیتے ہیں۔

اختر اورینوی کی نظموں کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظموں پر اقبالؔ' اختؔر شیرانی' جمیلؔ مظہری' اور مجازؔ کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

اختر اورینوی کی منظر نگاری عمیق مشاہدہ اور لطیف تجربات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں سوز گداز اور لطافت ونزاکت ہے۔ ان کی پیام فطرت سے متعلق منظری نظموں میں جگنو' دھان کا کھیت' کوئل' برق' پیام فطرت' دریائے سون اور نوائے زندگی وغیرہ ہیں۔ ان کی منظر نگاری مجاہد' تاج محل' رومان رفتہ' رخصت' ابدی رات' ایک شام اور نغمے وغیرہ نظموں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان تمام نظموں میں ہندوستانی رنگ وآہنگ اور مقامی اثرات دیکھائی دیتے ہیں۔ ان نظموں میں فطرت کے مناظر کو خوبصورتی کے ساتھ پیش

کرنے کا سلیقہ ملتا ہے۔ یہ نظمیں فطرت کے رازوں کی گرہیں کھولتی ہیں۔ اختر اورینوی ایک بڑے فطرت نگار و منظر نگار شاعر ہیں اور ان کی نظمیں انہیں ایک رومانی فطری نگار شاعر کی حیثیت سے ان کی شناخت اردو دنیا میں قائم کرتی ہیں۔

فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء): فیض احمد فیض سیالکوٹ کی نارووال تحصیل کے کالا قادر قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام چودھری سلطان محمد خان تھا جو کہ ایک درمیانے درجے کے زمیندار اور علم و ادب دوست انسان تھے۔ فیض نے سیالکوٹ کے اسکاچ مشن ہائی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی اور عربی میں ایم اے کیا اور ایم اے او کالج میں انگریزی کے استاد مقرر رہوئے۔ انہیں دنوں ترقی پسند مصنفین انجمن کا اجراء ہوا تھا۔ فیض کو یہ راستہ اچھا لگا چنانچہ وہ بھی اس کارواں میں شامل ہوگئے اور انہوں نے ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک معروف ادبی مجلّے ''ادب لطیف'' کی ادارت بھی کی۔

فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ ان کا شمار اردو کے ان شعراء میں نمایاں طور پر ہوتا ہے جنھوں نے زندگی کے حسن و جمال اور نشیب و فراز کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ ان کی نظر یکساں طور پر مشرقی اور مغربی ادب پر گہری ہے۔ ان کی شاعری پر، جس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں ابتدائی چند برسوں میں رومانویت غالب دیکھائی دیتی ہے۔

''نقش فریادی'' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی دور کی شاعری رومان سے لبریز ہے۔ کہیں کہیں منظر نگاری کے خوبصورت نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے کلام ''نقش فریادی'' کے اوّل حصہ کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے ۱۰۳؎

مندرجہ بالا اشعار میں پختگی اور اظہار بیان میں فیض کی انفرادیت و تمثیلی رنگ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

بیشتر رومانی شاعروں نے فطرت (نیچر) کو کسی نہ کسی انداز میں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اکثر نے حسن فطرت سے تحریک و جذبہ حاصل کیا ہے۔ محبوب یا آئیڈیل کے حسن کا تاثر دینے یا اس کی تصویر بنانے کے سلسلے میں تقریباً سبھی شعرا نے فطرت کی حسین اشیاء کا تشبیہاً ذکر کیا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن کے یہاں ایک الگ نظریہ حیات یا فلسفہ فطرت ملتا ہے۔ وہ فطرت کے حسن ظاہری کو ایک نعمت بھی سمجھتے ہیں اور ادراک حقیقت کا ذریعہ بھی۔ بعض شاعر فطرت کے حسن ظاہری سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور اس کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ ان کے یہاں مناظر فطرت کی تصویر کشی حصول مسرت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وہ فطرت کے حسن ظاہری کی دیواروں کو توڑ کر اس حسن کی تلاش نہیں کرتے جسے ورڈسورتھ اور فارسی و اردو کے صوفی شعراء نے فلسفۂ وحدت الوجود کی مدد سے دیکھا ہے۔

فیض کے کلام میں جو علامتیں ہیں ان میں سے بیشتر خیر و شر کی قوتوں کے اشارے ہیں۔ صبح، سحر، اجالا، روشنی، بہار، یہ سب درخشاں رومانی مستقبل کے اشارے اور قوت خیر کی علامتیں ہیں۔

فیض نے اگر صوفی شعراء یا ورڈسورتھ کی طرح ان میں کوئی خاص معنٰی تلاش نہیں کیے تو اس نے کیٹس کی طرح حسن فطرت کو حصول لذت کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ تشبیہوں میں وہ حسن فطرت کا ذکر اپنے محبوب کے حسن و جمال اور اس کی شان ناز سائی کی ایک جھلک دیکھانے کے لیے کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل مثال ان کی نظم ''تمہارے حسن'' کی ہے جو کہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے۔

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
بکھر گیا جو کبھی رنگ پیرہن سر بام

نکھر گئی ہے کبھی صبح ، دوپہر ، کبھی شام
کہیں جو قامت زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرد صنوبر سنور گئے ہیں تمام ۱۰۴

فیض بعض اوقات کسی ایسے خیال کی وضاحت کے لئے جس کا براہ راست حسن فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' مظاہر فطرت کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے اشعار میں فطرت سادہ اور آسان لیکن دلکش اور بامعنی علامتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور مثال کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار مثال کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب

یہاں عہد شباب کے عارضی ہونے پر زور ہے۔ پھول اس شعر کا موضوع نہیں ہے۔ ایک اور شعر کا ذکر برمحل ہوگا ؎

آسماں پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے

یہ دل کی اداسی ہے جو تاروں پر اور پورے ماحول پر چھا گئی ہے۔ اس سلسلے میں کولرج کے نظریے کو اگرچہ واضح طور پر فیض نے کہیں پیش نہیں کیا تاہم معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ فطرت کے بارے میں کولرج کے اس نظریے کا حامی ہے جو اس نے اپنی نظم ''اداسی کے نام'' میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

نہ گل کھلے ہیں' نہ ان سے ملے' نہ مئے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے
چمن میں غارت گلچیں سے جانے کیا گذری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے ۱۰۵

فیض کے یہاں رومانی شاعر کے احساس کی شدت بھی ہے لیکن ایک قسم کا ٹھہراؤ بھی پایا جاتا ہے۔ سرود شبانہ' تہ نجوم' یاس اور ایک منظر ان کی ناقابل فراموش نظمیں ہیں۔ ان نظموں

میں اعلیٰ پایہ کی مصوّری اور فنکاری فیض کی شاعرانہ عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ خاص طور پر ان کی نظم ''سرود شبانہ'' قابل ذکر ہے جس میں فنکاری اور منظر نگاری کا بہترین سنگم موجود ہے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا آنکھوں سے
کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں
آرزو خواب تیرا روئے حسیں [۱۰۶]

مندرجہ بالا اشعار میں فیض نے نئے الفاظ اور خوبصورت تشبیہوں سے کام لیا ہے۔ گہرے مگر متوازن جذبات و احساسات رنگین و شاداب تخیل سے ہم آہنگ ہو کر فیض کی نظموں میں دیرپا تاثر قائم کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض جب پابند سلال تھے اس وقت بھی حزن اور مایوسی ان پر حاوی نہیں ہو سکی۔ وہ جیل خانے میں بھی ایک اچھی خاصی بزم سخن آراستہ کیے رہتے تھے۔ اور پتھریلے فولادی پردوں کے پیچھے بھی فطرت کی رعنائیوں کے حسین پہلو کو تلاش کر ہی لیا کرتے تھے۔ جون ۱۹۵۲ء میں جب حیدرآباد جیل میں سندھ کی گرمی اور ریت کے جھکڑ ان اسیران نازک مزاج کو پژمردہ کیے ہوئے تھے، فیض خوبصورتی اور ترقی کے لمحات تلاش کر لیتے ہیں، جب وہ لکھتے ہیں:

''آج کل رات کو چاند نکلتا ہے۔ جب جیل کی دیواریں محو ہو جاتی ہیں۔ میرے برآمدے کے فرش پر چاندنی کی لہروں میں ریشمی سائے لہراتے ہیں اور درختوں اور ہوا کی سرسراہٹ سے کہسار میں بہتے ہوئے ندی نالوں کا نغمہ ذہن میں آتا ہے۔ کل کافی رات گئے میں اپنے بستر پر بیٹھا کشمیر اور شملہ

کی راتیں یاد کر رہا تھا اور دل کی صورت یہ ماننے پر راضی نہ تھا کہ یہ جیل خانہ ہے اور جوانی کے دن نہ جانے کب کے کب بیت چکے ہیں۔''

اسی لطیف احساس اور نہایت ذاتی قسم کی تنہائی وہ اسی دھیمے تاثر کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ دست صبا کی اس نظم کے کچھ بند ملاحظہ ہوں ۔

مہرباں چاندنی کا دست جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موج درد فراق یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں ۱۰۷

فیض نے اپنی نظم ''زنداں کی ایک صبح'' قید و بند کے اندر شام کے وقت کی اداسی اور حزن کے سماں کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے ۔

عکس جاناں کو ودع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے تیرتے مرجھاتے رہے کھلتے رہے

رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے
صحن زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطح ظلمت سے دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان آنکھوں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد فراق رخ محبوب کا غم ۱۰۸؎

فیض احمد فیض کی ایک نظم ''اے روشنیوں کے شہر'' ہے جو منٹگمری جیل کراچی میں لکھی گئی ہے۔اس نظم میں ان کی امیجری کا کمال دیکھائی دیتا ہے ؎

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی' زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق پر گھٹتی' بڑھتی' اٹھتی' گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر ۱۰۹؎

مندرجہ بالا بند کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جیل کی سلاخیں بھی فیض کے لطیف احساس کو متزلزل نہیں کر سکیں اور ان کی ذہنی وفکری روش ایک خوبصورت مناظر سے ہمکنار ہوتی رہی۔

فیض نے منٹگمری جیل کی قید کے دوران جس ذہنی سکون اور جمالیاتی نزاکت سے لبریز احساس کا بیان انہوں نے اپنی شریک حیات ایلس کو ایک مراسلے میں کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے:

''میری رہائش گاہ کچھ جاذب نظر جگہ ہے۔چھوٹی سی کٹیا جس پر کھپریل کی سرخ چھت۔ پشت پر نازک نازک پتوں والے پیڑ ہیں اور سامنے کے جنگلے پر ایک بہت پھیلی ہوئی بیل اپنے سرخ اور نارنجی پھولوں کی بہار دکھا رہی ہے۔ جب چاند نکلتا ہے تو میرا صحن عشاق کی سیر گاہ معلوم ہوتا ہے۔ کٹیا اس میں جھلملاتا ہوا پیٹرومیکس لیمپ۔ پس منظر میں ایک سفید اور سبز دھبہ سا' جو میرا غسل خانہ ہے اور سامنے کا جنگلہ اور اس کے پھول۔ یہ سب چیزیں جیل کی دیوار پھاند کر کسی اور دنیا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔اور

یوں لگتا ہے کہ ہم جیل میں نہیں، کہیں دیہات کی کھلی فضا میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔"

کچھ اس طرح کی ذہنی کیفیت اور احساس ان کی نظم ''ملاقات'' میں نظر آتے ہیں۔ فیض کہتے ہیں ؂

الم نصیبوں جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے[۱۱۰]

فیض کی زندانی شاعری کی بنیادی شناخت خوبصورت و نازک ایمیجز کی تشکیل اور فطری مناظر کی عکاسی ہے۔

فیض کی شاعری رومان، حقیقت اور منظر نگاری کا بہترین سنگم ہے۔ یہ عناصر ان کے کلام میں باہم ایسے شیر وشکر دیکھائی دیتے ہیں کہ ان کو الگ الگ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اکثر اوقات حقیقت رومان میں اور رومان حقیقت یں ڈھلتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے۔ حقیقت اور رومان کے اس امتزاج کی ایک خوبصورت مثال مندرجہ ذیل ہے ؂

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ رخسار کی پھوہار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری [۱۱]

نقش فریادی کے دیباچے میں ن م راشد' فیض کی شاعری کے متعلق کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

''یہ ایک شاعر کی نظموں غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے'' [۱۲]

ترقی پسند شاعروں میں بیشتر نے کلاسیکی روایتی شاعری کے موضوعات پیش کیے ہیں لیکن ان میں سے جن شاعروں نے طرز ادا میں انفرادی رنگ پیدا کیا ہے ان میں فیض کا رنگ سب سے نمایاں ہے۔ فیض کا یہی کمال ہے کہ انھوں نے کلاسیکی روایتی الفاظ و تراکیب کو نیا پس منظر عطا کیا ہے۔ اور سماجی معنویت اور ترقی پسند منشور کو انہوں نے اپنی شاعری پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے انہوں نے کس طرح پیکر تراشی کے نمونے پیش کیے ہیں ؂

اس بام سے نکلے گا تیرے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حنا کی
اس در سے بہے گا تیری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھولے گی شفق تیرے قبا کی [۱۳]

مذکورہ بالا اشعار میں محبوب کے رنگ حنا کا پھوٹنا' محبوب کی قبا سے شفق کا پھوٹنا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض نے شعوری طور پر رنگوں کو شعری پیکر کا حصہ بنایا ہے۔

فیض نے متعدد اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے جو کہ نظم' غزل' نوحہ' واسوخت' مرثیہ امام اور شخصی مرثیہ' حمد' قطع' شہر آشوب' گیت' ترانہ' مدح' قوالی پر مشتمل ہے۔ فیض نے پوری انسانیت کی کراہ اور دنیا کے کریہہ مناظر کو بھی بڑی نرمی کے ساتھ اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔

ان کی نظموں کا ایک خاص مذہبی اور ثقافتی پس منظر بھی ہے۔ گرچہ وہ ترقی پسند اور کمیونزم سے وابستہ تھے مگر ان کی ذہنی تربیت میں دینی تعلیم کا بھی رول رہا ہے۔ ان کا تمام تخلیقی سرمایے ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علی سردار جعفری (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۰ء): علی سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور ترقی پسند تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ویسے تو وہ ایک ناقد بھی تھے اور ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اردو دنیا میں کافی مقبول رہی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

علی سردار جعفری کا شعری سرمایہ زمانی اعتبار سے کم و بیش نصف صدی کے عرصے میں پھیلا ہوا ہے اور تقریباً ایک درجن چھوٹے بڑے مجموعوں پر مشتمل ہے۔ سردار جعفری کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی تخلیقات میں کسی بھی نظریہ سازی سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے ہمیشہ تخلیقی جمالیات' لسانی اقدار اور تہذیب کو سامنے رکھا۔ سردار جعفری اردو شاعری کی ساری وراثت کو قبول کرتے ہوئے بھی انیسؔ، اقبالؔ اور جوشؔ سے متاثر ہونے والا مزاج لے کر آئے تھے۔

سردار جعفری کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ محض سیاسی زندگی کے ابھرنے والے روزمرہ کے مسائل کے شاعر ہیں' صحیح نہیں ہے۔ اشتراکی نظریہ صرف سیاسی نظریہ نہیں ہوتا ہے بلکہ ساری زندگی اور انسانی تاریخ پر حاوی ہوتا ہے۔ ان کی متعدد نظموں میں ایک نظم ''میرا سفر'' ہے جو یقیناً اس زمانے کی اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

ان رجحانوں کے علاوہ سردار جعفری کے یہاں فطری منظر نگاری کا رجحان بھی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے جو کہ قابل ذکر ہے۔ ان کے یہاں زمین سے لے کر آسمان تک سبھی مظاہر یعنی نظام فلکی' نظام شمسی' چاند' سورج' ستارے' بادل' ہوا' سمندر' آبشار' دریا' شفق' اور انسانی زندگی کے سبھی پہلو یعنی کھیت' کھلیان' کارخانے' مسجد' مندر' گرودوارے' کسان' مزدور' مرد' عورتیں' بچے' چرند' پرند' چکی' چولہے' یہاں تک کے سانپ' بچھو اور کیڑے مکوڑے' تتلیاں سبھی

اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔

حسن موسم کا ہو یا مناظر کا، اودھ کی خاک حسین کا ہو یا ممبئی کی بے رونق سڑکوں کا یا جیل کی تنہا شاموں کا یہ سب کچھ جس شدت کے ساتھ انہیں متاثر کرتے ہیں اس کا اظہار ان نادر امیجری سے ہوتا ہے جو ان کے کلام میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ فطرت کا حسن ان کے لئے خاص طور سے کشش رکھتا ہے۔ ان کا زندہ و بالیدہ احساس خود ان کی ذات کو اس منظر میں ضم کر دیتا ہے۔ وہ خود کو فطرت کے پراسرار اور دلکش مظاہرے سے الگ نہیں پاتے۔ جس کی مثال ان کی سوانحی نظم ''نومبر میرا گہوارہ'' اور ''آبلہ پا'' ہے جس میں انہوں نے منظر نگاری کے خوبصورت مرقعے پیش کئے ہیں ؎

مجھے سورج نے پالا
چاند کی کرنوں نے نہلایا
ہر اک شئے مجھ سے تھی مانوس
مجھ سے بات کرتی تھی
درختوں کی زباں
چڑیوں کے نغمے میں سمجھتا تھا
ہوا میں تتلیاں پرواز کرتی تھیں
میں ان کے ساتھ اڑتا تھا
مری مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے
میں پریوں کے پرستانوں میں جاتا تھا[۱۱۴]

اور پھر آگے چل کر دوسری نظم میں کہتے ہیں ؎

میں خود فطرت تھا، فطرت میری ہستی تھی
اسی فطرت نے میرے خوں میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں
مسیں بھیگیں، رگ و پے میں جنوں کا بانکپن آیا

مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چلن آیا
ہر اک شمشاد پیکر لے کے فردوس بدن آیا ۱۵

سردار جعفری کی ایک نظم جس کا عنوان ''نئی دنیا کو سلام'' ہے۔ اس نظم میں غلام ہندوستان میں عام انسانوں کی بدحالی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس تمثیلی نظم کا ہیرو جاوید کہتا ہے جو درج ذیل ہے ۔

ہم سے بہتر ہیں کیڑے مکوڑے
ان کے سر پر ہری گھاس کے سائباں ہیں
سبز پیڑوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں
طائروں کے حسیں آشیاں ہیں ۱۶

یہاں کیڑوں کے سر پر 'ہری گھاس کے سائباں' ایک خوبصورت Composite image ہے اور تصویر کشی کا انداز شاعر کے شفاف مشاہدے کی غمازی کرتی ہیں۔

چونکہ سردار جعفری کے فکری نظام میں انسان ہی کو مرکزیت حاصل ہے اس لئے سماجی زندگی کا ہر مظہر اور انسانی زندگی کا ہر پہلو ان کی پیکر تراشی میں جلوہ فگن ہے۔ ان کی ایک معروف نظم ''اودھ کی خاک حسین'' میں گاؤں کی زندگی کا یہ منظر دیکھئے ۔

لہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھویں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں ۱۷

نظم کے مندرجہ بالا بند میں صراحیوں کا چاک پر رقص کرنا' آٹے کا راگ بن کر چکی سے نکلنا' چولہوں میں آگ کے پھول کھلنا اور توے کا چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنسنا کچھ

ایسے بصری و سماعی پیکر ہیں جو نہ صرف ہمارے حواس کو بیک وقت متاثر کرتے ہیں بلکہ اس مانوس منظر کو ایک نئی نظر سے دیکھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

سردار جعفری کی شاعری میں ایک طرف دیہات کے سیدھے سادے منظر ان کے شاعرانہ تخیل کو مہمیز کرتے ہیں تو دوسری طرف عروس البلاد بمبئی کے دلکش مناظر بھی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے داد وصول کرتے ہیں۔ ''بمبئی'' نام کی ایک نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں ؎

راتیں آنکھوں میں جادو کا کاجل لگائے ہوئے
شام نالی ہوا کی نما میں نہائی ہوئی
صبحیں شبنم کے باریک ملبوس پہنے ہوئے
خواب آلودہ کہسار کے سلسلے
جنگلوں کے گھنے سایے
مٹی کی خوشبو، مہکتی ہوئے کونپلیں
پتھروں کی چٹانیں
اپنی باہوں میں بحر عرب کو سمیٹے ہوئے ۱۱۸؎

مندرجہ بالا نظم میں بحر عرب کے خوبصورت منظر کو شاعر نے پیش کیا ہے اور بمبئی شہر کی مثالی خوبصورتی کو بھی اجاگر کیا ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کا ایک اہم پہلو پروٹسٹ پوئٹری بھی رہا ہے جسے انہوں نے عام طور پر منفرد شعری پیکروں میں ڈھالا ہے۔ اسی قبیل کی ایک نظم ''پتھر کی دیوار'' ہے۔ جس کا تعلق ان کے جیل کے تجربے سے ہے۔ یہ نظم ایک لطیف احساس سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی ابتدائی بندوں میں منظر نگاری صاف دیکھائی دیتی ہے ؎

پتیوں کی پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے مسکراتے ہیں تارے

چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر تیرگی کے ناخن کی ۱۱۹

مندرجہ بالا نظم میں پتیوں کی پلکوں پر اوس کا جگمگانا' پیڑوں پر دھوپ کا پر سکھانا' چاند کے کٹورے سے چاندنی کا چھلکنا اور پھر ریت میں گرے ہوئے دودھ کی طرح برباد ہو جانا نادر پیکر تراشی اور منظر نگاری کے نمونے ہیں۔

سردار جعفری کی اکثر و بیشتر تصنیف معاشرت کو فطرت سے قریب کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ فطرت کی خوبصورت پیکر تراشی کرتے ہیں لیکن کسی رومانی شاعر کی طرح اس کے آغوش میں سو رہنے کے قائل نہیں ہیں۔ فطرت کے ان پیکروں سے وہ تحرک' تفاعل' رفتار اور توانائی کے خصائل حاصل کر کے انہیں تمام انسانوں کے لئے مفید کار بنانا چاہتے ہیں۔ سردار جعفری کے فنکارانہ تخلیقی رویے کی ایک مثال مندرجہ ذیل نظم ہے جو منظر نگاری کے حسین مرقعوں سے مزین ہے۔

وہ سمندر کا کنارا وہ چمکتی ہوئی ریت
موجیں پگھلے ہوئے نیلم کی طلسمی پریاں
رقص کرتی ہوئی آتی تھیں ترے قدموں میں
اور پھر ریت میں کھو جاتی تھیں
ڈوبتی شام کے سورج کی سنہری کرنیں
تیرے کاکل تیرے رخسار پہ سو جاتی تھیں ۱۲۰

سردار جعفری ترقی پسند دور کے ایک بہترین نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری بہت شفاف اور قوت اظہار کی توانائی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی نظموں میں جہاں خوبصورت منظر نگاری اور پیکر تراشی کے نمونے ملتے ہی وہیں ان کا آفاقی وژن اور جذبہ' فکر کی توانائی اور تہہ داری' داخلیت' فنی نظم و ضبط اور وحدت تاثر بھی نمایاں طور پر دیکھائی دیتا ہے اور یہی

امتیازات انہیں ان کے معاصرین شعرا میں منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔

کیفی اعظمی (۱۹۱۸ء۔۲۰۰۲ء): ہندوستان میں ترقی پسند اکابر شعراء کی صف میں کیفی اعظمی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں ترقی پسند تحریک کے بنیاد کاروں اور معماروں میں میں ان کا نام نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں کیفی کی شاعری کا رنگ رومانی دکھائی دیتا ہے۔ان کے تین مجموعے کلام ''جھنکار''،'' آخر شب'' اور'' آوارہ سجدے'' منظر عام پر آچکے ہیں۔'' آخر شب'' کی ابتدائی نظمیں رومگنی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ان نظموں میں منظر نگاری کے نمونے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ان کی نظم ''ملاقات'' کے چند بند ملاحظہ کیجیے۔

کلی کا روپ پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آجکل خزانہ بہار لے کے آئی تھی
جبین تابناک میں کھلی ہوئی تھی چاندنی
وہ چاندنی میں عکس لالہ زار لے کے آئی تھی
گلابی انکھریوں کی سحر کاریوں میں خندہ زن
غرور فتح و رانگ اعتبار لے کے آئی تھی
وہ سادہ سادہ عارضوں کی شکریں ملاحتیں
ملاحتوں میں سرخی انار لے کے آئی تھی [۱۲۱]

کیفی نے اردو شاعری کو دیگر موضوعات کے علاوہ منظری شاعری سے بھی مالا مال کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی نظمیں یلغار، دوشیزہ مالن، ملاقات وغیرہ مناظر فطرت کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ وہ ترقی پسند شعرا کے اس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی کے ہر دور میں محنت کش عوام اور ان کی تحریکوں سے جڑے رہے۔

سلام مچھلی شہری (۱۹۲۰ء۔۱۹۷۳ء): سلام مچھلی شہری جون پور کے ایک چھوٹے سے خطے مچھلی شہر (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک شاعر اور صحافی کی حیثیت سے جانے

جاتے ہیں۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں ملازمت کے فرائض انجام دیے اور ترقی پسند تحریک کے فعال کارکن بھی رہے۔ ان کی کئی تصنیفات منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں جن میں میرے نغمے، وسعتیں، پائل اور ناول' بازو بند کھل کھل جائیں قابل ذکر ہیں۔

سلام کے کئی گیتوں میں فطرت پرستی کے ساتھ ہی حسین مناظر اور ارضی عشق کے بہت سے پہلو ملتے ہیں۔ بعض گیتوں کے عنوانات سے ہی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چاندنی، پھر شام ملن کی آئی، گگریا چھلکے پنگھٹ پر، کوئلیا دھیمے دھیمے بول، پنچھی جاگو، رم جھم مینہاں برسیو غیرہ اہم ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر عزیز اندوری فرماتے ہیں:

> ''ان کے گیتوں میں فطرت پرستی سے رغبت کی نشاندہی کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ ان کی ابتدائی ذہنی نشوونما قصباتی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لئے مچھلی شہر اور فیض آباد کے منظر نے انھیں بے حد متاثر کیا۔''[۱۲۲]

کشمیر کے دلکش مناظر پر سلاؔم نے اردو کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں سب سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ سلاؔم کو ملازمت کے سلسلے میں کشمیر کی حسین وادیوں میں قیام پذیر رہنے کا کافی موقع ملا۔ انہوں نے ان وادیوں کے حسن کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا جمالیاتی احساس اس وادیٔ حسین میں پوری طرح گم ہو کر اس کی ساری لطافت و عظمت کو سرمایہ نگاہ و دل بنا چکا ہے۔

ان کی ایک نظم ''ایک خط کا جواب'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

تم نے پوچھا ہے کہ کشمیر پہنچ کر مجھ کو
کیسے کیسے گل و مہتاب نظر آتے ہیں
جانِ من! جنت گیتی کے حسیں دامن میں
جاگتے گاتے ہوئے خواب نظر آتے ہیں
دل کے آغوش میں جہلم کے حسیں دامن میں

ان گنت گوہر نایاب نظر آتے ہیں
مست زلفوں میں چناروں کی گھنی چھاؤں میں
جلوہ ہائے دل بیتاب نظر آتے ہیں
میری ان آنکھوں سے کشمیر کا منظر دیکھو
نغمہ و حسن سنو، رقص گل تر دیکھو ۱۲۳

سلام نے کشمیر کو جنت نشاں مانتے ہوئے اس کے حسن کا اعتراف کچھ اس طرح کیا ہے ۔

دھرتی پر جنت سے بڑھ کر یہ کشمیر ہمارا ہے
پربت پربت چاندی برسے جھیلم دودھ کی دھارا ہے
ہنستی جھلیں گاتے جھرنے
سندر باغ منوہر چشمے
راہوں میں انگور کے خوشے
ہر سو پربت اونچے اونچے
ڈل کی جھیل سے سونا برسے
جھیلم دودھ کی دھارا ہے
دھرتی پر جنت سے بڑھ کر یہ کشمیر ہمارا ہے ۱۲۴

❁ ❁ ❁

حلقہ ارباب ذوق

ترقی پسند تحریک کے متوازی ایک دوسرے میلان نے اردو شعر و ادب میں جنم لیا جسے'' حلقہ ارباب ذوق'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔'' حلقہ ارباب ذوق'' نے ترقی پسندوں کی طرح موضوع کو مقصد کی زنجیر نہیں پہنائی لیکن عملی طور پر انہوں نے بھی خود کو چند موضوعات تک محدود رکھا۔ دراصل حلقہ والے بھی ترقی پسندوں کی طرح روایتی سماج کے مخالف تھے اور ایک نیا سماج نئی قدروں کے ساتھ چاہتے تھے۔ وہ نئی قدر حلقہ والوں کے نزدیک'' انفرادی آزادی'' کی قدر تھی جس کی تشکیل میں فرائڈ کی نفسیاتی توضیح و تعبیر نے حصہ لیا تھا۔ ن م راشد' میراجی' یوسف ظفر' قیوم نظر' مختار صدیقی اور ضیاء جالندھری کا شمار حلقہ ارباب ذوق کے نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے۔ ان حضرات نے حلقہ ارباب ذوق کی تشکیل میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق دو متوازی میلانات کی طرح ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کے خلاف اپنی خوبیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کی خامیوں کو طشت از بام کرنے کی پوری پوری کوششیں کیں۔

حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک دونوں نئی قدروں کی ضمانت لے کر اٹھے مگر حلقہ والوں نے کسی طرح کی وابستگی اور پابندی سے خود کو الگ رکھا جب کہ روایات سے انحراف کے باوجود ترقی پسندوں نے اخلاقی قدروں کا پاس بھی رکھا۔ حلقہ والوں نے کسی پر کسی طرح کا قدغن نہیں لگایا۔ اس سلسلے میں ن م راشد لکھتے ہیں:

''حلقہ کے دروازے ہر طرح کے مصنفین اور ان کی تحریر کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ جمالیات پرست ہوں' بائیں بازو سے متعلق ہو' مذہبی ذہن رکھتا ہو' صوفی ہو' روایت پرست ہو یا جدید۔ بس یہ شرط ہے کہ ان کی تحریروں میں ادبیت پائی جائے۔''[۱۲۵]

حلقہ ارباب ذوق کی نظموں میں مناظر فطرت

ن م راشد (۱۹۱۰ء۔۱۹۷۵ء): نذر محمد راشد (ن م راشد) گوجرانوالہ کے ایک قصبے اکال گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام راجہ فضل الٰہی چشتی تھا جو فارسی شاعری سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اسی قصبے میں حاصل کی اور گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے ۱۹۳۴ء میں معاشیات میں ایم اے کیا۔ گھر میں علمی ماحول ہونے کی وجہ سے شعر کہنے کا شوق ورثے میں پایا۔ ن م راشد زمانہ طالب علمی سے ہی ادبی حلقوں میں معروف ہو چکے تھے۔ انگریزی شعروادب کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا جس کا بین ثبوت ان کی نظمیں فراہم کرتی ہیں۔

ن م راشد کو آزاد نظم کا موجد کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''ماورا'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ یہ آزاد نظم کا پہلا مجموعہ ہے جو منظر عام پر آیا۔ چونکہ انہوں نے شاعری کی شروعات پابند نظموں سے کی تھی اس لئے اس میں چند پابند نظمیں بھی شامل ہیں۔

ن م راشد کی رومانوی شاعری میں منظر نگاری سے زیادہ لمسی یا جنسی لذت کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظموں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرائڈ کے نظریہ جنس سے متاثر تھے۔

راشد زندگی کے شب و روز کا تجزیہ منطقی (Rational) انداز میں کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی نظموں میں قدیم روایات اور اقدار در آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''صحرا'' اور ''ریت'' کو راشد نے بیشتر مقامات پر علامتوں کے طور پر اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ ریت جو صحرا کا ذیلی تلازمہ ہے وہ راشد کے تہذیبی لاشعور میں ایک معصوم بچے کی طرح

موجود ہے۔ ریت کی خاموشی، اس کی تابانی اور سفیدی انسانی صداقت کے لئے باعث رشک ہے۔

راشد کی ''ریت'' پر لکھی نظم ملاحظہ ہو ؎

رگیک کے ذرّو! ابرتی صبح تم / آؤ صحرا کی حدوں تک آ گیا روز طرب
دل مرا صحرا نورد پیر دل / آ چوم ریگ
ہے خیالوں کے پری زادوں سے بھی معصوم ریگ
اس کا ابریشم ملائم، نرم خو خنداں رہے ۱۲۶

مندرجہ بالا نظم کے مطالعے سے ریت کے کئی پہلو صاف طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ریگ کے حوالے سے تبسم کاشمیری نے لکھا ہے:

''ریگ جدید اردو شاعری میں پہلی بار ایک تخلیقی تمثال کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔'' ۱۲۷

راشد کے یہاں عرب تہذیب و تمدن اور صحرائی مشرقی تہذیبی روایات کے عناصر موجود ہیں۔ ریت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس ریت کے پس منظر میں راشد نے عصری تہذیب کے کھوکھلے پن کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان کا تجربہ سب سے الگ اور انوکھا ہے۔ ایک وسیع اور پر سکوت صحرا میں پانی اور گھاس کی پٹی (Oasis) اور اس میں بھوک اور پیاس کی شدت سے مضطرب ایک پرندہ اور پھر ایک صحرا نورد مسافر کا گیت ۔۔۔ گویا یہ منظر صحرا میں زندگی کی رمق کا تصور پیش کرتا ہے۔ نظم ''تسلسل کے صحرا'' کے اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

تسلسل کے صحرا میں
اک ریت کے ٹیلے کی آہستہ آہستہ لرزش
کسی گھاس کے اک نامکمل جزیرے میں اک جاں بلب
طائر شب کی لرزش
کسی راہ بھٹکے عرب کی سحر گاہ حمد و ثنا

تسلسل کی بے اعتباراتِ دن میں تغیر کا

تنہا نشاں ۔۔۔ محبت کا تنہا نشاں ۱۲۸؎

یہ آگ، مسافر کے گیت، پرندوں کی آوازیں، اتھاہ تاریکی میں دور کہیں الاؤ کا روشن ہونا ۔۔۔ گویا یہ تلازمے صحرائی زندگی اور تہذیب کو باقی رکھتے ہیں۔ ن م راشد کی نظموں میں قافلوں کا صحرا سے گزرنا، خیمہ لگانا، آگ روشن کرنا اور اس کے گرد کچھ بڑے بوڑھوں کی قصہ گوئی عرب کی صحرائی تہذیب کا حصہ رہی ہے۔

راشد کی چشم مشاہدہ ہر رنگ میں وارہتی ہے اور ان کے تخیل میں دور رسی ہے۔ کئی نظموں میں انہوں نے شبیہ سازی کے خوبصورت نمونے پیش کیے ہیں ؎

زمستاں کے دن تھے

لگاتار ہوتی رہی شام سے برف باری

دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے

مگر برف کا رقص سیمیں تھا جاری

مندرجہ بالا اشعار موسم زمستان میں برف باری کے منظر کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔

ن م راشد کا دنیائے اردو شاعری میں ایک منفرد مقام ہے۔ ان کی مختلف نظموں میں جا بجا منظر نگاری کے نمونے اپنے خاص رنگ و آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اردو شاعری میں انہیں ایک ٹرینڈ سیٹر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

میراجی (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۴۹ء): محمد ثناء اللہ ڈار جو اپنے ادبی نام و تخلص میراجی سے ہی ادبی حلقوں میں معروف ہوئے، گوجرانوالہ کے ایک موضع اٹارہ میں پیدا ہوئے۔ میراجی کے والد منشی مہتاب الدین ریلوے میں برج انسپکٹر تھے اور ملازمت کی نوعیت کے اعتبار سے انہیں اکثر مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اسی لئے میراجی کی ابتدائی تعلیم و تربیت مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے پہلے ہی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ البتہ کتب بینی کا شوق جو انہیں بچپن سے تھا، برابر جاری رہا۔ انہوں نے

قدیم اور جدید انگریزی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا۔

میراجی کا شمار حلقہ ارباب ذوق کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انکی ادبی شہرت کا آغاز ''ادبی دنیا'' سے ہوا اور ان کی حلقہ ارباب ذوق سے اتنی گہری وابستگی ہوگئی کہ حلقہ اور میراجی ایک ہی ذات کے دو نام بن گئے۔ میراجی کا شمار ان نظم نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے آزاد نظم اور معریٰ نظم کو تقویت پہنچائی۔

میراجی کی نظموں میں دور کنارا' یگانگت' برقع' اس کی انوکھی لہریں' جنگل میں ویران مندر' برہا اور کٹھور وغیرہ فطرت کی خوبصورت تصویروں سے مزین ہیں اور ان میں ایک ایسے شاعر کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے جو فطرت کا پجاری ہے۔

میراجی کی نظموں میں ہندوستانی دیو مالا سے ان کے گہرے رشتے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ رشتہ ان کی جنسی نظموں میں زیادہ واضح صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم ''سنجوگ'' کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے

یہ چندا کرشن ستارے ہیں جھرمٹ برندا کی سکھیوں کا
اور زہرا نیلے منڈل کی رادھا بن کر کیوں کر آئی
کیا رادھا کی سندرتا چاند بہاری کے من بھائے گی
جنگل کی گھنی گپھاؤں میں جگنو جگمگ جگمگ کرتے جلتے بجھتے چنگارے ہیں
اور جھینگر تال کنارے سے گیتوں کے تیر چلاتے ہیں
نظموں میں بہتے جاتے ہیں [۱۲۹]

مندرجہ بالا اشعار میں انہوں نے رات کی تاریک گود میں پلنے والے تمام فطرت کے مظاہر کو وصل کے جذبے سے سرشار دیکھا ہے اور اس سرشاری کو کرشن اور رادھا کی جنسی سرشاری کے مماثل قرار دیا ہے۔

اس نظم میں مناظر فطرت میں جنسی جذبے کی تلاش اور رادھا' کرشن کے رشتے سے اس کی مماثلت نے ایک پراسرار فضا تشکیل کی ہے جس سے منظر کی علامتی معنویت بھی اجاگر ہوئی ہے۔

اسی طرح ان کی ایک نظم ''دور کنارا'' بھی ہے۔اس میں انہوں نے وصل کی خواہش کو دریا میں اٹھنے والی لہر اور ساحل کے ذریعے بیان کیا ہے۔نظم ملاحظہ ہو ؎

لہر سے لہر ٹکرائے کیسے' کہو؟
اور ساحل سے چھو جائے کیسے' کہو؟
لہر سے لہر کو دور کرتی ہوئی بیچ میں سیکڑوں اور لہریں بھی ہیں
اور کچھ بھی نہیں ۱۳۰؎

میراجی نے جنسی احساسات کی نظموں میں اکثر علامت کے طور پر مظاہر فطرت کا استعمال کیا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مظاہر فطرت میں کسی بھی انسانی احساس کے علامات بننے کی پوری گنجائش ہوتی ہے۔دوسری وجہ میراجی کا مخصوص مزاج بھی ہوسکتا ہے' نیز وہ اپنی شناخت آریائی نسل سے کرتے تھے اور آریائی نسل کو جنگل سے گہرے لگاؤ کا وہ کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

''آریا جب پہلے پہل ہندوستان پہنچے تو انہیں دو چیزوں سے سابقہ پڑا۔ جنگل اور جنگلی۔جنگلی کو تو انہوں نے مار بھگایا اور ملک کے افتادہ حصوں میں پہنچے لیکن جنگل کے جادو سے بچ نکلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ نہ صرف ان کی تہذیب کا گہوارہ جنگل ہے بلکہ ان کے تمام بنیادی خیالات کی نشوونما جنگلوں کی تنہائی اور گہرائی میں ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات میں کسی جنگل کے اتھاہ ساگر کے ایسا عمق پایا جاتا ہے۔رفتہ رفتہ زندگی کا ڈھب بدلا' گاؤں بنے' انہیں گاؤں میں سے بڑھ کر قصبے بنے۔قصبے پھلے پھولے اور شہروں کے آثار نظر آنے لگے اور پھر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ہندوستان کے یہ دور دراز سے آئے ہوئے باشندے مناظر فطرت سے دور ہوتے ہوئے چلے گئے۔لیکن نسلی تجربے کے لحاظ سے اب بھی وہ تاثرات جو انہیں جنگلوں سے حاصل ہوئے ان کے نقش لاشعور میں موجود ہیں اور اکثر یہ نسلی تجربے ادب کے ذریعے سے ظاہر ہوئے ہیں۔''۱۳۱؎

میراجی نے مناظر فطرت کو کس کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے اس کی ایک مثال ان کی نظم ''ایک عورت'' بھی ہے ۔

کبھی مسکراتے ہوئے، شور کرتے ہوئے، پھر گلے سے لپٹ کر کرو ایسی باتیں
ہمیں سرسراتی ہوا یاد آئے
جو گنجان پیڑوں کی شاخوں سے ٹکرائے دل کو انوکھی پہیلی بجھائے مگر وہ پہیلی
سمجھ میں نہ آئے
کوئی سرد چشمہ ابلتا ہوا اور مچلتا ہوا یاد آئے
جو ہودیکھنے میں ٹپکتی ہوئی چند بوندیں
مگر اپنی حد سے بڑھے تو بنے ایک ندی، بنے ایک دریا، بنے ایک ساگر
یہ جی چاہتا ہے کہ ہم ایسے ساگر کی لہروں پہ ایسی ہوا میں بہائیں وہ کشتی
سکوں سے ملاتی چلی جاتی ہے [۱۳۲]

ترقی پسند شعرا کے مقابلے حلقہ ارباب ذوق کے شعرا کی زبان بڑی مختلف ہے۔ انہوں نے موضوع کے ساتھ اسلوب میں بھی جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تبدیلی ہمیں واضح طور پر میراجی کے یہاں نظر آتی ہے۔ میراجی کی نظموں کی فضا عام طور پر ہندوستانی ہے اور اسی مناسبت سے ہندوستان کی عام بول چال کی زبان کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''چل چلاؤ'' کو دیکھیں ۔

طوفان کو چنچل دیکھ ڈری، آکاش کی گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا، تارے سوئے، طوفان مٹا، ہر بات گئی
دل بھول گیا پہلی پوجا، من مندر کی مورت ٹوٹی
دن لایا باتیں انجانی، پھر دن بھی نیا اور رات نئی [۱۳۳]

میراجی کا شمار جدید دور کے اقبال کے بعد کی نسل کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ میراجی نے جدید نظم کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کا مخصوص اسلوب بیان انہیں دیگر شاعروں سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ میراجی کی نظمیں

جدید نظم کے ارتقاء میں ایک اہم موڑ کا پتہ دیتی ہیں۔

یوسف ظفر (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۲ء): یوسف ظفر نے خوش حال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی مگر زمانے کی گردش نے انہیں زندگی کی تلخیوں کا احساس بچپن میں ہی دلا دیا تھا۔ جب پندرہ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد بڑی بہن کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ شروع میں پنڈی کے راجہ بازار میں غبارے بیچ بیچ کر اپنی ماں اور چھوٹی بہن کی پرورش کی۔ انہوں نے دہلی ریلوے اسٹیشن پر ہوٹل بوائے کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

یوسف ظفر کا تعلق بھی حلقہ ارباب ذوق سے ہے۔ انہوں نے اس کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا۔

ن م راشد اور میرا جی کے ساتھ ساتھ حلقے کے نمائندہ شعرا میں یوسف ظفر کا نام بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یوسف ظفر کی ذہن سازی میں ان کی زبوں حالی کا بڑا ہاتھ ہے۔ حیات اور ماحول کی ویرانی اور اجاڑ پن یوسف ظفر کو ایک مستقل احساس غم میں مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن وہ اپنے غم کو غلط کرنے کی جہد مسلسل میں مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ غم حیات سے گھبرا کر وہ عشق کے رومانوی تصور کے رنگین دھندلکوں میں پناہ لینا چاہتے ہیں اور قلبی تسکین کا راستہ نکالتے ہیں۔ ان کی نظمیں تحلیل' ابدیت' فردوس گوش' وحشت' اس سلسلے میں ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ ''تحلیل'' میں شاعر چاندنی میں گھاس پر لیٹے لیٹے ماحول کی سختیوں کو بھول کر تخیل کی وادی میں محبوب کی صدا سنتا ہے او یہ صدا جادو کی جھیل بن جاتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے ؎

ایک وادی میں جہاں تیری صدا
گھل کے بن جاتی ہے اک جادو کی جھیل ۱۳۴

ان کی ایک نظم ''فردوش گوش'' ہے۔ اس میں شاعر نے محبوب کے رومانوی تصور کو فطرت کے عنصر شفق' گلستاں اور ستاروں کے تمثیلی رنگ میں ابھارا ہے۔ ایک بند درج کیا جاتا ہے ؎

شفق میں مجھ کو نظر آئی ایک کشتیٔ زر
سوار جس میں تھی وہ میری راز دار بہار
وہ میری جان گلستاں لئے ہوئے ہمراہ
خم شراب' ستاروں کے زرد پیمانے ۱۳۵

نظم ''سفر'' یوسف ظفر کی ذہنی اور نفسیاتی سفر کی کہانی بیان کرتی ہے جو تھکن' تنہائی اور مایوسی سے عبارت ہے لیکن نظم کا مرکزی خیال فضا آفرینی کا اثر پیدا کرتا ہے۔

بھیگتی بھیگتی رات کی بے نور' سیہ تاریکی
راستے پر کئی سنسان سبک سر سائے
میری آہٹ پر اچک کر مجھے دیکھتے ہیں
جس طرح گھات میں دشمن کوئی گھبرا جائے ۱۳۶

یوسف ظفر کے مجموعہ کلام ''زنداں'' اور ''زہر خند'' کی قریب قریب ہر نظم میں حرکت اور حرارت کے عناصر نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں منظر نگاری واضح طور پر تو دکھائی نہیں دیتی لیکن ان کی نظمیں سورج' چاند' آگ اور آگ کے شعلوں کے اثر سے متصف ہیں۔

قیوم نظر (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۸۹ء) : قیوم نظر کا اصل نام عبد القیوم بٹ اور نظر تخلص کرتے ہیں۔ ان کی جائے پیدائش لاہور ہے۔ میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ گیٹ سے کیا۔ بی اے کرنے کے بعد ناگزیر حالات کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے ملازمت کر لی۔ ادبی اور شعری ذوق طالب علمی کے زمانے میں ہی پروان چڑھا۔

قیوم نظر اپنے مسلک شعر کے اعتبار سے 'حلقہ ارباب ذوق' کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کا شمار فن برائے فن کے نظریے کے حامی شعراء کی فہرست میں نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں موضوع کے اعتبار سے بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ہر لمحہ بدلتی دنیا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس لئے ان کی نظموں میں عشق ومحبت سے لے کر مناظر فطرت' سامراجی تشدد' معاشرتی استحصال' انسانی عظمت اور تہذیب وثقافت گویا ہر طرح کے موضوع

شامل ہیں۔ اس کے باوجود ان کی بیشتر نظموں میں افسردگی کا پرتو نظر آتا ہے۔ بقول وزیر آغا:

"قیوم نظر نے ماحول کی یاس انگیزی اور میکانیکی کیفیات کے خلاف بغاوت کرنے ایک تابناک مستقبل سے لو لگانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے شخصی غم کو اس طور سے پھیلایا ہے کہ اس میں ماحول کی یاس انگیز کیفیات ضم ہو کر رہ گئی ہے۔" ۱۳۷

ان کی نظموں میں دیگر موضوعات کے علاوہ منظر نگاری بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی ایک نظم "ایک پل کے لئے" ہے، جس کے بند درج ذیل ہیں ۔

عجیب دن ہے' ابھی گھٹائیں مچل رہی تھیں
برستے نغموں نے روپ دھارا تھا ندّیوں کا
ابھی رواں کا رواں تھا شفاف گنبدوں کا
ابھی فلک سیر بوندوں کے طلائی ریزے
اڑاتے پھرتی تھی نرم رو' مشک بو ہوائیں
ابھی چمک اٹھی ہر طرف ان گنت صدائیں
پھدکتی چڑیاں' شریر کوّے' متین چیلیں
ہوا میں بہتی بلندیاں جن کے آشیانے
لٹا رہے ہیں مسرتوں کے بھرے غزالے
لچکتی شاخوں کے لاڈلے گیت گاتے پتے ۱۳۸

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے برسات کے موسم کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔

قیوم نظر کو نیچر اور مناظر فطرت سے گہرا لگاؤ تھا خاص طور پر گاؤں اور کھیتوں سے انہیں بے حد پیار تھا۔ ان کی نظموں میں سرکنڈوں اور جھولوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ دہقان اور ان کی زندگی قیوم نظر کے حصار فکر سے باہر نہیں۔ دو نظموں کے بند لیجیے ۔

میرے کھیتوں میں گندم کے ہرے خوشے ہوا کی سلوٹوں کو گدگداتے ہیں
کنارے آب سرکنڈوں کے جھولے جہاں بیٹھے ہوئے ننھے حسیں طائر

خوشی کے پیارے پیارے گیت نازک کاغذی ناؤں کی صورت میں بہاتے ہیں

(نظم: واپسی)

پھر چناروں کے حسیں طائفے' ان کے پتے
دھوپ کو راستے میں روکنے کو تنتے
جن سے چھن چھن کے شعاعوں کا دمکتا ہوا حسن
گلبدن خاک پہ یوں اترے بکھر جانے کو
جس طرح برف زمستاں میں گرا کرتی ہے
اور وہ پھیلی ہوئی سیڑھیاں وہ دھان کے کھیت
جن میں صدیوں سے تنومند جفاکش دہقاں
شام تک کام کئے جانے کی دھن میں کھوکر
گنگناتے ہیں کہ احساس کی تلخی نہ بڑھے ۱۳۹

(نظم: وادئی کشمیر)

مندرجہ بالا نظموں میں مناظر فطرت کی پیش کش میں داخلی کیفیت اور شعری اظہار کے تلازمے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انسانی جذبات میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ سماج' تہذیبی تناظر اور مناظر قدرت کی سمائی آسانی سے ہو جاتی ہے۔

قیوم نظر کے یہاں مناظر کو استعارے اور کنایے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی نظموں 'کبھی ہسپانیہ میں' ساقی نامہ' تہذیب' جہلم کا پانی' چھم' سراب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نظم ''جہلم کا پانی'' کے یہ ٹکڑے دیکھئے ؎

یہ جہلم یہ میرا دریا مجھ کو ہنس ہنس تکتا ہے
اس کو مجھ سے' مجھ کو اس سے کون جدا کر سکتا ہے
کتنا خوش ہوتا ہے دکھا کر مجھ کو اپنی جوانی
جہلم کا بہتا پانی
اس کی لگن میں میں نے ریت کے ہر بندھن کو توڑا

میرے لئے اس نے میدانوں سے بھی ناطہ جوڑا
میری کہانی دنیا سے کہتی ہے اپنی زبانی
جہلم کا بہتا پانی ۱۴۰

اس طرح دیکھیں تو قیوم نظر کی تخلیقیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کی شاعری راشد اور میرا جی کی طرح جدید انسان کی جذباتی افسردگی اور نفسیاتی الجھن کی مصوری کرتی ہے۔ اسی لئے بہار کے موسم میں بھی احساس محرومی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کی نظم ''خلش تاثر'' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گاؤں کی فضا میں فطرت سے قریب ہو کر بھی شاعر اپنی بے خوابی اور بے چینی کو دور نہیں کر سکتا۔ نظم کا آخری بند درج ذیل ہے ؎

کیوں میں نے ڈالا ہے اپنے ہی جی کو آپ ہلاکت میں
کیوں ہو ہی نہیں جاتا میں خود پیوستہ جہان قدرت میں
کیوں لے ہی نہیں لیتی مجھ کو اپنی آغوش کی وسعت میں
یہ شام' یہ گہری شام' یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی ۱۴۱

قیوم نظر کی اکثر نظموں کی یہ خصوصیت اہم ہے کہ وہ موضوع کو اپنی شخصیت میں تحلیل کر کے اور فطرت کو پس منظر بنا کر ایک مربوط جذباتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''برسات کی رات'' سے یہ حصہ دیکھیے ؎

کالی کالی بہت ہی ہے کالی !
بے ربط مگر جواں حسینہ !
کیا رکھتی ہے زیست کا قرینہ ؟
ہلنے لگے اس کے سرنگیں لب
دانتوں کی لکیریں ہیں درخشاں
یا روح بہار ہے پر افشاں ۱۴۲

قیوم نظر کی ایک نظم ''زندگی'' کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

یہ تیرگی کا اجالا' بھٹکتا چمگادڑ!
فضا کے سینے کو بوجھل پروں سے سہلاتا
نہ جانے کون سی بستی کو اڑتا جاتا ہے[۱۴۳]

قیوم نظر کی نظمیں اختصار' حسن اور غنائیت کا جادو رکھتی ہیں۔ انہوں نے مغربی زبانوں کی نظموں کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور کئی انگریزی نظموں کے منظوم تراجم بھی کیے ہیں۔ والٹ وٹمن کی ۵۶ نظموں کے منظوم تراجم جو ''گھاس کی پتیاں'' کے عنوان سے چھپ چکے ہیں' جو ان کی وسعت نگاہ اور عمیق مطالعہ کا بین ثبوت ہیں۔

ضیاء جالندھری (۱۹۲۳ء۔۲۰۱۲ء): ضیا جالندھری کا شمار بھی حلقہ اربابِ ذوق کے ان نمائندہ شعرا میں کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اردو شاعری میں انفرادی رنگ و آہنگ کو اہمیت دی۔ وہ ان شعرا کی صف میں آتے ہیں جنہوں نے مابعد اقبال کی جدید اردو شاعری میں طویل نظم نگاری کی طرح ڈالی اور اسے اپنا مخصوص وسیلہ اظہار بنایا۔ ۱۹۴۳ء سے ضیاء جالندھری کے کلام ان کی نظمیں' گیت اور غزلیں لاہور کے موقر ادبی جریدوں ''ادبی دنیا'' اور ''ادب لطیف'' میں شائع ہونے لگی تھیں۔ ضیاء جالندھری کو جدید اردو ادب کی تیسری جنریشن کا سب سے اہم اور نمائندہ شاعر مانا جاتا ہے۔

ضیاء کے شعری مزاج کی ساخت و پرداخت اس دبستان ادب میں ہوئی ہے جو ہنگامی اور سیاسی موضوعات سے فن کو الگ تھلگ رکھنے پر اصرار کا خوگر ہے اور فقط دوامی موضوعات اور صرف جمالیاتی قدروں کا گرویدہ ہے۔ ضیاء جالندھری کی شاعری یک رخی نہیں بلکہ پہلودار ہے۔ ان کی نظمیں اپنے ارتقائی مراحل سے گذرتی اور چھوٹی حقیقتوں سے بڑے مسائل کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ضیا جالندھری کی نظموں میں منظر نگاری کے نمونے خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''بشارت'' ۱۹۷۱ء کے قومی سانحے کے کچھ دنوں بعد لکھی گئی تھی۔ ''بشارت'' کا

خالق اپنے قومی منظر کو دیکھتا ہے تو اسے جشن نو بہار کا سماں نظر آتا ہے۔اس کے دل کی آنکھ گلاب کی ایک کلی کو کھلتے ہوئے دیکھ رہی ہے جو لب کشا ہوئی اور اب پھول بن رہی ہے۔نظم کے دو بند پیش کیے جاتے ہیں ؂

منجمد تال میں
چادر برف پر خال خال
نیلے پانی کے بلور حلقے
درخشندہ آنکھوں کی مانند
بیدار ہونے لگے
اور پگھلتی ہوئی برف کے ہاتھ سے
چار جانب کناروں کا دامن پھسلنے لگا
رفتہ رفتہ وہ تال آئینہ بن گیا
خشک شاخوں کے پوروں پہ
خوابیدہ آنکھوں سی گرہیں کھلیں
تو اجاگر ہوئیں
کونپلوں کی لویں
نرم کلیوں کی شمعیں
بہاروں کے پیغامبر۱۴۴؎

یہ زمستان کی برف کے پگھلنے کے بعد آمد بہار کا منظر تھا۔ بہار آرہی ہے پوری طرح آئی نہیں ہے۔جشن نو بہار ابھی ہونے کو ہے۔درج ذیل بند ملاحظہ ہو؂

بارہا ہم نے دیکھا
بہاروں کے آنے سے پہلے
بہاریں اجاڑی گئیں
اب کے پھر آرہی ہے بہار

پھر بشارت سے ڈرتا ہے دل
غنچے کھول آنکھ رک رک کے کھول
کھل پہ آہستہ آہستہ کھل[145]

ان کی ایک نظم ''ہم'' ہے جو کہ اردو کی عصری عالمی ادب کی سطح پر ایک غیر معمولی نظم ہے۔ یہ نظم عالم وجود میں انسان کے مقام اور حیثیت کا تعین کرتی ہے اور یہ بات باور کرتی ہے کہ کارگہہ جہاں میں آدمی کی کیا حیثیت ہے۔ نظم میں پھول کے ذریعہ جو استعاراتی نظام قائم کیا گیا ہے قابل دید ہے۔ کچھ بند درج کئے جاتے ہیں۔

یہ پھول کو اختیار کب تھا
کہ کون سی شاخ پہ کھلے
کون کنج میں مسکرائے
اور کن فضاؤں میں خوشبو بکھیرے
نحیف، شعلہ جمال کونپل
جو دست نازک کی نرم پوروں سے دھیرے دھیرے
دریچہ شاخ کھول کر
صبح کی سپیدی میں جھانکتی ہے
یہ سوچتی ہے
کہ باغ سارا اسی کے دم سے مہک رہا ہے
اسی کے پرتو سے گوشہ گوشہ دمک رہا ہے
اسی کے دیدار میں مگن
خوشبوں سے بوجھل ہواؤں میں
شوخ تتلیاں رقص کر رہی ہیں
وہ بے خبر ہے
کہ شاطر وقت کی نظر میں

کوئی اکائی

شجر حجر ہو کہ ذی نفس ہو

نظام کل سے الگ نہیں ہے ۱۴۶

مندرجہ بالا نظم میں انسان کے جزوی اختیار کو اتنے کم الفاظ میں اور اتنے خوبصورت استعاراتی نظام کے ساتھ بیان کرنا ضیا جالندھری کا ہی خاصہ ہے۔

وزیر آغا نے ضیا جالندھری کی نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ضیا جالندھری نے موت کو زندگی کے مترادف قرار دے کر دراصل موت سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی ہے عین ممکن بھی ہے:

> ''ضیا جالندھری کی نظموں میں برف' زمہریر' زمستان' بجھتا ہوا الاؤ اور دوسری چیزیں موت کی علامت بن کر نمودار ہوئی ہیں اور شاعر نے ان میں سکون تلاش کر کے یا انہیں زندگی کے مترادف قرار دے کر دراصل موت سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۴۷

مختار صدیقی (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۲ء): مختار صدیقی کی شاعری روایت پسندی اور جدید رویوں کا حسین امتزاج ہے۔ وہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے نیز جوش' اختر شیرانی اور میراجی سے بھی متاثر رہے ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ مختصر اور معاصرین سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔

مختار صدیقی کی نظموں میں ان کے فنی شعور کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں اور اس کی ترتیب میں غیر معمولی فنکارانہ مشاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ الفاظ کی مدد سے اپنی نظموں میں ایک ایسی خوابناک فضا کی تعمیر کرتے ہیں جو قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ مختار صدیقی کے کلام میں سیماب کی زبان دانی' حفیظ کا ترنم' اختر شیرانی کی رومانیت' میراجی کا ہندی ڈکشن اور جنسی رجحانات جیسے اوصاف نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

مختار صدیقی اپنی تخلیقات میں مواد معاشرتی زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔ معاشرتی زندگی کے کسی اہم موضوع سے جب ان کا جذباتی لگاؤ ہو جاتا ہے تو وہ اس پر غور و فکر کرتے ہیں اور اس کی کئی تہوں کو کھولتے ہیں اور اس کی جزیات میں کھو سے جاتے ہیں۔

مختار صدیقی نے کلاسیکی موسیقی کے مختلف راگوں کو اپنی چند نظموں میں بنیادی تاثر کے طور پر استعمال کیا ہے جس میں فطرت کے چند عناصر کا ذکر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ خیال ''چھایا'' کا تاثر اس بند میں ملاحظہ ہو:

رات میں کیسے رچی ہے میری رنجوری کی لاگ
نیم جاں ہے آج ارمانوں کی ہم سن چاندنی
نرم جھونکے بن رہے ہیں بے سبب آہوں کے جال
جن میں گھٹ گھٹ کر رہی جاتی ہے کم سن چاندنی ۱۴۸

ان کی ایک نظم ''کیدار کا ایک روپ'' جس کو پڑھ کر ان کے ذہن کے سُر تال اور راگ کے نظام کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں منظر فطرت کے نمونے خاص طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ رات اور چاندنی کے حوالے سے چند بند ملاحظہ کیجیے:

اور سیمائے جہاں کا اب تو دل ہے چاندنی
دم بخود پیڑوں کو، ساکت جھیل کو، بیگانہ سبزے کو
مدہوشی کا سماں چاندنی
رات کی رانی کی متوالی، گھنی خوشبو کو مخموری کا عنوان چاندنی
شہر و صحرا میں بھٹک کر مضمحل ہے چاندنی!
اور۔۔ نیندوں کی گراں باری میں آسودہ سوئی ہوئی ہے
خستہ ساماں چاندنی
اس خموشی کے فسوں، پھیلے سکوں کی اب ہے گویا
جان جاناں چاندنی
اور اب، پیڑوں کی اونچی کونپلیں ہو رہی ہیں زرنگار

چاند اوج آسماں پر آ چکا' ہر شئے ہوئی آئینہ زار
سائے سمٹے' شاخوں اور پتوں سے چھنتی آ رہی ہے چاندنی
حسن کی زہرہ وشی کا روپ' بے مہری کا رنگ ناز' بنتی
جا رہی ہے چاندنی
ہم اسی عالم میں محرومی کی راہیں تکتے تکتے مر چلے!
منتظر ہے کون' جاناں' تم جو بن ٹھن کر چلے!
جاناں' تم جو بن ٹھن کر چلے!!۱۴۹

ان کی ایک نظم ''منزل شب'' ہے جس میں منظر کشی بھی ملتی ہے اور انسانی وجود کے ٹوٹنے بکھرنے کا روح فرسا عکس بھی۔ حالانکہ اس نظم میں کشمیر کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے اور انسانی رشتوں اور سسکتی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں۔۔ نکہت تھے وہ لوگ
کس جہنم کی خدائی جس کی جنت میں ہے اب
یہ بہشتی سی زمیں جس دست قدرت میں ہے اب
کاش وہ دن آئیں جب اس کو فنا کر پائیں ہم ۱۵۰

مختار صدیقی نے اپنی نظموں میں فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ موضوعات کو بھی اہمیت دی ہے۔ دیگر موضوعات کے علاوہ کسی نے کسی صورت میں منظر نگاری کو بھی ملحوظ رکھا ہے جو ان کے کلام کا خاصہ ہے۔

ن م راشد' میراجی' قیوم نظر' یوسف ظفر' مختار صدیقی اور ضیا جالندھری کے علاوہ حفیظ ہوشیارپوری' تابش صدیقی' نظیر صدیقی' شہرت بخاری اور انجم رومانی وغیرہ بھی حلقے سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھے۔ ان شعرا نے بھی متذکرہ بالا موضوعات پر نظمیں لکھیں اور اردو شعر و ادب میں قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔

❁ ❁ ❁

ترقی پسند کے عہد میں غیر ترقی پسند شعرا کی منظر نگاری

حامد اللہ افسر میرٹھی (۱۸۹۸ء۔۱۹۷۴ء): افسر میرٹھی کے یہاں بھی نظموں میں مناظر فطرت کی جھلک جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں مناظر فطرت کی عکاسی میں دلکشی اور انوکھا پن ہے۔ انکی نظمیں 'چاند' 'ابر بہار' 'سکوت شام' وغیرہ منظر نگاری کے کامیاب نمونے پیش کرتی ہیں۔ انکی شاعری میں مقامی رنگ بھی اپنی تمام جولانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ نظم 'برسات' میں وہ برسات کا منظر یوں بیان کرتے ہیں ؂

اُٹھتی ہے پہاڑ سے گھٹائیں	اُڑتی ہوئی آتی ہیں صدائیں
بادل سے چھلک رہی ہیں بوندیں	پتّوں سے ڈھلک رہی ہیں بوندیں
اُڑتے ہیں طیور چہچہا کر	سبزا بڑھا ہے لہلہا کر
کیا شور مچا رہے ہیں چشمے	سوتوں کو جگا رہے ہیں چشمے ؁۱۵۱

افسؔر میرٹھی نے بچّوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں زیادہ تر مظاہر فطرت کی عکّاسی کی گئی ہے۔ مناظر فطرت سے متعلق نظموں میں افسؔر فطرت کے ساتھ انسان کی ہم آہنگی کو بڑے ہی دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

وہ الفاظ کی ترتیب اس خوبصورت پیرائے میں کرتے ہیں کہ بچّوں کا معصوم ذہن ان نظموں کو پڑھ کر فطرت کی دلفریبیوں اور رعنائیوں میں کھو کر ان حسین نظاروں کی سیر کرنے لگتا ہے۔ بچّوں کی شاعری میں افسؔر کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں 'برسات' 'تارے' 'گرمی کی بہار' 'ابر خراماں' 'پہاڑی ندی' 'آمدِ بہار' 'چاند' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نظم

'بہار' کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

کلیاں کیا کیا چٹک رہی ہیں ساری روشیں مہک رہی ہیں
ہلکی ہلکی یہ ان کی خوشبو پھیلی ہے چمن میں ہر سو
چڑیاں گاتی ہیں گیت پیارے سنتے ہیں چمن کے پھول سارے
کتنی راحت فزاں ہوا ہے گویا جنّت کا در کھلا ہے
کیسی دلکش چاندنی ہے چادر اک نور کی تنی ہے ۱۵۲

اسی طرح ان کی نظم 'پہاڑی ندی' کا یہ مصرع غور طلب ہے ۔

کوہ سے ندی چلی آتی ہے لہراتی ہوئی
بے خودی میں ڈگمگاتی جھومتی گاتی ہوئی

افسر کی نظم 'چاند' کا شمار انکی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔اس میں انہوں نے بچّوں کی نفسیات کا پورا خیال رکھتے ہوئے سیدھے سادے اسلوب کے ساتھ منظر کشی کی ہے ۔

تم ندی پر جاکر دیکھو جب ندی میں نہائے چاند
ایسی ڈبکی لگائی اس نے ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی اک سیڑھی لے کر چھم چھم کر اتر آئے چاند
جھولے میں پانی کی لہروں کے کیا کیا پینگ بڑھائے چاند
جب تم اسکو پکڑنے جاؤ بادل میں چُھپ جائے چاند ۱۵۳

حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۲ء): حفیظ جالندھری' جالندھر کے ایک مفلوک الحال محنت کش اوران پڑھ مسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔والد کا نام حافظ شمس الدین اور والدہ کا نام بتول تھا۔حفیظ نے سات جماعتوں تک کی تعلیم جالندھر میں ہی حاصل کی مگر مفلسی اور بعض دوسری مجبوریوں کے باعث باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔حفیظ کو ابتدائی عمر ہی سے علم وادب سے بے حد دلچسپی تھی اورانہوں نے ذاتی مطالعے سے باقاعدہ تعلیم کی کمی کو بہت حد تک پورا کیا۔

حفیظؔ کی زندگی میں استقلال کی کمی تھی لیکن انہوں نے انسانی زندگی اور معاشرتی عناصر کا بہت گہرا مشاہدہ کیا جسکی جھلک ان کی مختلف نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ابتدا میں داغؔ کا اثر قبول کیا لیکن بعد میں اقبالؔ کے رنگ میں رنگ گئے۔ ان کی شاعری میں منظر کشی اور حسن آفرینی کا رنگ گہرا ہے۔ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ''شاہ نامہ اسلام'' ہے جو کہ فردوسی کے ''شاہنامہ'' کے انداز میں اسلام کی درخشندہ تاریخ ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل اس تاریخ اسلام کو حفیظؔ نے بہت ہی موثر پیرائے میں نظم کیا ہے۔

حفیظ خالصتاً ہندوستان کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اسی سرزمین کے تمدن اور طرز معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں' ہندی کے نرم و نازک الفاظ' فارسی کی شیریں تراکیب کے استعمال' تکرار الفاظ' بول چال کے لب ولہجہ اور انداز بیان کی گھلاوٹ سے ایسے خوبصورت گیت لکھے ہیں کہ پڑھنے والا محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے گیتوں میں ابھی تو میں جوان ہوں' برسات' کرشن کنہیا' طوفانی کشتی' بسنتی ترانہ' فرقت یار میں پئے جا' تاروں بھری رات' جاگ سوز عشق' کرشن بنسری' دل ہے پرائے بس میں' پرانی بسنت' پریت کا گیت' سپنا' الفت کا اظہار' اندھی جوانی' حسن اور موت' اور کابل کا گیت ان کی شاہکار تخلیقات ہیں۔

حفیظؔ جالندھری فطری مناظر کے دلدادہ رہے ہیں۔ انہوں نے فطرت کا بغور مطالعہ کیا ہے اور انکے کلام کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو مناظر قدرت و فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کی نظمیں 'جلوۂ سحر' 'برسات' 'تاروں بھری رات' 'راوی میں کشتی' 'شام رنگین' 'ہمالہ' 'صبح و شام کوہسار' 'سچی بسنت' 'تصویر کشمیر' کرشن کنہیا وغیرہ نظمیں مناظر فطرت کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کو بھی پیش کرتی ہیں۔

رئیسہ پروین نے حفیظ جالندھری کی منظر نگاری کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''حفیظ کی نظموں میں کہیں کشمیر کی دلکشا وادیاں ہیں جہاں ڈھلانوں پر لمبی لچکتی ہوئی گھاس ہے۔ اس گھاس کی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی ہے۔ ترشے ہوئے زینہ بہ زینہ کھیت ہیں۔ آئینہ نما جھیلیں ہیں' پہاڑوں کے حسن

اور قدرت کی بوقلمونیاں ہیں تو کہیں تاروں بھری رات کی سحر انگیز فضا ہے۔ کہیں صبح کی دلفریبیاں اور رعنائیاں ہیں تو کہیں برف سے ڈھکے بلند بالا کہسار کا سلسلہ ہے اور کہیں فلک شگاف چوٹیوں کا منظر دلوں کو لبھاتا ہے اور آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔''۱۵۴؎

حفیظؔ کی نظم 'ہمالہ' میں بھی ان کے تخیلات کی بلند پروازی کچھ کم نہیں ہے ۔

یہ اونچے شامیانے دست قدرت نے لگائے ہیں
یہ لا تعداد خیمے سبز مخمل کے سجائے ہیں
یہ دیو زادوں کا جنگل قدرتی پریوں کی بستی ہے
یہاں خاموشیاں اگتی ہیں موسیقی برستی ہے
یہاں پگھلی ہوئی چاندی کے فوارے اچھلتے ہیں
یہاں سوتے نکلتے ہیں یہاں چشمے ابلتے ہیں
یہ منزل ہے ہوا کی برشگالی کاروانوں کی
یہیں پر ختم ہوتی ہے بلندی آسمانوں کی
یہاں آکر زمیں نے آسماں کی ہمسری کر لی
یہاں مٹی نے حاصل دو جہاں کی سروری کر لی
کوئی دیکھے یہاں آکر تبسّم لالہ زاروں کے
ترنّم جوئے باروں کے تکلّم آبشاروں کے ۱۵۵؎

حفیظؔ نے ہندوستانی سرزمین' یہاں کی مٹی کی خوشبو' دریا اور پہاڑ' گنگا اور جمنا و کشمیر کے مناظر کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ہندوستان کے موسم برسات کی کیفیت کو بڑی خوبصورتی سے حفیظؔ نے پیش کیا ہے۔ آموں کے شاخوں پر جھولے ڈالنا اور لڑکیوں کا جھولتے ہوئے گیت گانا ہماری ہندوستانی تہذیب کا حصہ رہے ہیں۔ برسات کے اسی موسم کا ذکر ان کی اس نظم میں ملتا ہے۔

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے سیمیں تنوں نے
برق افگنوں نے
گیت ان کے پیارے میٹھے رسیلے
ہلکی صدائیں سادہ ادائیں
خود مسکرانا خود منہ چڑانا
پھر جھینپ جانا الھڑ پنے سے ۱۵۶

حفیظؔ کے کلام میں مناظر فطرت کا حسن اور دلکشی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ دریائے راوی کی سبک خرامی اور شام کے وقت شفق کی رنگینیوں کی سرخی نے جو طلسمی فضا پیدا کی ہے وہ ان کی نظم 'توبہ نامہ' میں قابل دید ہے۔ حفیظؔ نے اپنی اس نظم میں راوی کی سنہری و سیمیں لہروں کے حسن کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے ؎

اُف وہ راوی کا کنارہ وہ گھٹا چھائی ہوئی
شام کے دامن میں سبزے کی بہار آئی ہوئی
وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
اور راوی کی طلائی نقرئی لہروں میں جنگ ۱۵۷

حفیظؔ کی ایک نظم "چاند کی سیر" ہے۔ اس کو پڑھ کر رنگ و نور کا ایک دلکش منظر نظر کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

عطر بیز لالہ زار نغمہ ریز جوئبار
حشر خیز آبشار
کیف موج بیقرار چاندنی میں کوہسار
تھا بہار در بہار
میں یہ شانِ کردگار دیکھتا چلا گیا!! ۱۵۸

چاند کی سیر کا یہ بند کتنا خوبصورت اور دلکش ہے۔ اس کی حسین ترکیبیں اور تشبیہات کلام میں موسیقیت کا رنگ بھر دیتی ہیں۔ اس نظم کے الفاظ جتنے خوبصورت ہیں اتنے ہی جاندار بھی۔ لالہ زار کو عطر بیز اور آبشار کو حشر خیز سے تشبیہ دینا بہت ہی خوبصورت اور برمحل معلوم ہوتا ہے۔

حفیظؔ کے کلام میں چند ایسی نظمیں ہیں جو ہئیت کے لحاظ سے بھی کامیاب ہیں اور منظر نگاری میں کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ مثلاً 'تاروں بھری رات' کا یہ بند ملاحظہ ہو جس میں ہیئت کا بھی تجربہ کیا گیا ہے اور منظر نگاری بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

دلکش نظارے

ندی کی تہ میں　　　رقصاں ہیں سارے

گاتی ہیں لہریں　　　گیت ایسے پیارے

جب دم بخود ہیں　　　دونوں کنارے

ہر سمت سبزہ

سرمست صہبا

لیٹا ہے کیسے

پاؤں پسارے ۱۵۹؎

مندرجہ بالا نظم میں موسیقیت بھی ہے، مصوری بھی ہے اور حسین الفاظ کا انتخاب بھی۔ حفیظ نے اس میں رات کی خاموش فضا کا جو فطرت پر مرتب ہوتا ہے، اس کو پیش کیا ہے۔ اس نظم کے علاوہ 'ابھی تو میں جوان ہوں' اور 'چاندکی سیر' کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں منظر فطرت کو ایک نئے ہیئت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ابھی تو میں جوان ہوں ویسے تو کوئی منظریہ نظم نہیں ہے لیکن اس میں مناظر فطرت کو بطور پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ شاعر مناظر قدرت کے حسن کے ساتھ بہک جاتا ہے اور ساقی سے بادہ نوشی کی فرمائش کرتا ہے اور خیال زہد کو پاس

بھی نہیں بھٹکنے دیتا۔ اس میں مئے کشی کا سرور اور مناظر فطرت کا انبساط دونوں کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ دل مسرت سے سرشار ہو جاتا ہے ؎

ہوا بھی خوشگوار ہے　　　گلوں پہ بھی نکھار ہے

ترنم ہزار ہے　　　بہار پر بہار ہے

کہاں چلا ہے ساقیا

ادھر تو لوٹ ادھر تو آ

ارے یہ دیکھتا ہے کیا

اٹھا سبو سبو اٹھا ۱۶۰

حفیظ نے اپنے گیتوں اور نغموں میں ہیئت کے تجربے بھی کئے ہیں۔ انہوں نے مثلث، مربع، مخمس، مسدس وغیرہ سے ہٹ کر ایک نئی شکل میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی فرماتے ہیں:

''انہوں نے مثلث، مربع، مخمس اور مسدس وغیرہ سے الگ ہٹ کر ایک نئے فارم پر اپنے بند پیش کئے ہیں۔ اس کا مقصد بھی موسیقیت پیدا کرنا ہے'' ۱۶۱

ذیل میں حفیظ کی ایک نظم ''برسات'' کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے ہیئت کے تجربے کئے ہیں ؎

گھر گھر کے آیا

ہر پھر کے آیا

تند اور دھواں دھار　　　تاریک بسیار

ابر گہربار

بجلی چمکنا　　　آنکھیں جھپکنا

توبہ یہ کڑکا　　　سینوں کا دھڑکا

بوندوں کی بھرمار مینہ موسلا دھار
ہر سمت یکدم جل تھل کا عالم

پر لطف موسم
حق نے دکھایا

گھر گھر کے آیا ہر پھر کے چھایا ۱۶۲

اس نظم کا یہی ایک بند ہے ایسا ہے جو برسات کی تصویر پیش کرتا ہے۔ باقی بندوں میں برسات کی تصویر دھندلی ہے، روشن نہیں۔

حفیظؔ کی منظر نگاری پر ایک عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کی نظمیں کسی منظر کو مکمل طور پر پیش نہیں کرتیں۔ ان پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ وہ کلام کی گہرائی کے بجائے موسیقی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظمیں خصوصاً منظر نگاری کے سلسلے میں اکثر مبہم خیالات اور تاثرات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''حفیظؔ کی مختلف نظموں میں مناظر فطرت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ مگر اکثر جلوے صاف اور روشن نہیں ہوتے ہیں بلکہ نہایت مبہم نظر آتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کسی منظر کی تصویر مکمل طور پر نہیں پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی منظریہ نظموں کو پڑھنے سے ہماری نظروں کے سامنے کسی ایک منظر کا صحیح نقشہ نہیں اترتا ہے۔'' ۱۶۳

حفیظ نے اپنی نظم ''تصویر کشمیر'' میں منظر نگاری کی بہترین مثال پیش کی ہے پیش کی ہے۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

برف دیو زاد تودے نور کے آئینہ دار
نقرئی جھیلوں میں صبح شام عکس زر نگار
نغمہ خواں جوشاں خروشاں آبشار و جوئبار
خندۂ قدرت گل اندر گل بہار اندر بہار

کیوں شگفتہ ہو نہ دل اک شاعر دلگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
ندیاں ہر سو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی پیچ و بل کھاتی ہوئی
آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
اپنی اپنی منزل مقصود کو جاتی ہوئی
کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا ۱۶۴؎

حفیظؔ کی فنی قدر و قیمت کا تجزیہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے منظر نگاری پر توجہ دی ہے اور ساتھ ساتھ ہیئت کے تجربے بھی اپنے کلام میں کئے ہیں، نیز نغمگی کا بھی پورا لحاظ رکھا ہے۔ منظر نگاری کو جا بجا بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔

حفیظ جالندھری کی معرکتہ الارہ تصنیف ''شاہ نامہ اسلام'' ہے جو کہ ۱۹۲۹ء میں منظر عام پر آئی۔ حفیظؔ نے یہ شاہنامہ فردوسیؔ کے شاہنامے سے متاثر ہو کر لکھا ہے لیکن دونوں کے مقاصد ایک نہیں تھے۔ اس سلسلے میں مظفر شہمیری فرماتے ہیں:

> ''فردوسی نے اپنے شاہنامے میں ایران کو زندہ کرنا چاہا ہے جب کہ حفیظؔ اسی شاہنامے کے ذریعے مسلمانوں کا مردہ ایمان تازہ کرنا چاہتے ہیں'' ۱۶۵؎

شاہنامہ اسلام میں حفیظؔ نے بعض جگہ بہترین منظر نگاری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ رات کے منظر کو اس طرح بیان کیا ہے جو جاندار اور حقائق سے پُر دکھائی دیتا ہے ۔

کیا خورشید نے مغرب کے گھر ساماں بسیرے کا
بساط ارض پر قائم ہوا بستر اندھیرے کا
سکوت مرگ نے شب خون مارا فوج ہستی پر
سیاہ خواب قابض ہو گئی آنکھوں کی بستی پر

فضا ہنگامۂ شور و فغاں سے ہو گئی خالی
فلک پر لشکرِ سیّارگاں نے چھاؤنی ڈالی
افق سے چاند مشعل لے کے نکلا دید بانی کو
اڑھادی چاندنی نے چادر خاک اور پانی کو[۱۶۶]

حفیظ ''شاہنامہ اسلام'' کے خالق کی حیثیت سے اور نئے طرز کے مترنم گیتوں نیز اپنی شاعری کے متنوع موضوعات' خیالات' جذبات' تشبیہات' تلمیحات' اور مخصوص انداز کی منظرکشی کے اعتبار سے اپنے دور کے شاعروں میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔

جمیل مظہری (۱۹۰۴ء۔۱۹۸۰ء): جمیل مظہری محلّہ مغل پورہ پٹنہ سیٹی (بہار) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خورشید حسنین تھا جو کہ شاعر تھے اور خورشید تخلص کرتے تھے۔ جمیل مظہری نے ابتدائی تعلیم مظفر پور میں حاصل کی نیز انہوں نے ایم اے تک کی ڈگری کلکتہ میں حاصل کی۔

جمیل مظہری نے تعلیم کے ابتدائی زمانے سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے کئی مجموعے کلام منظر عام پر آئے ان میں سے چند' ذکر جمیل' فکر جمیل' عرفان جمیل وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جمیل مظہری کے شعری مرتبے کا تعین کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ انہوں نے اردو زبان میں رائج تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے نظمیں' غزلیں' رباعیاں' قطعے' مرثیے' قصیدے' مثلث' مسدّس' گیت' بھجن' مثنوی' ریختی' ہجو بھی لکھے ہیں۔ ان کا شمار جوش ملیح آبادی' اختر شیرانی' حفیظ جالندھری' ساغر نظامی' احسان دانش اور روش صدیقی کے ہم عصروں میں ہوتا ہے۔ انہیں بجا طور پر ایک مفکر شاعر کہا جا سکتا ہے۔

دیگر اصناف سخن کے علاوہ جمیل نے اپنے کلام میں منظر نگاری کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''مالن کی بیٹی'' کا یہ بند ملاحظہ ہو ۔

چن چن کے پروتی جاتی ہے دھاگے میں شگفتہ کلیوں کو
دھگہ جو الجھ جاتا ہے کبھی ماتھے پہ شکن پر جاتی ہے
منظر پہ اداسی چھانے سے گلشن میں خزاں آجانے سے
اور پھولوں کے مرجھانے سے دنیا کو سجھتی جاتی ہے ۱۶۷ے

مندرجہ بالا بند میں شاعر نے فلسفیانہ کمال کے ساتھ رنگارنگ تصویریں پیش کی ہیں جو شاعر کے مخصوص زاویہ نظر کی غمازی کرتے ہیں۔

ان کی ایک نظم ''عروسی'' ہے جس کا ایک بند درج کیا جاتا ہے ۔

شفق گویا حنائے نو عروسی کا ہے افسانہ
سہانی رات آئی زلف میں کرتی ہوئی شانہ
چلی آتی ہے عطر نو عروسی کی لپٹ بھینی
یہ عالم ہوتو پھر کیونکر نہ مچلے ذوق گل چینی ۱۶۸ے

مندرجہ بالا بند میں شاعر نے ایک مخصوص ماحول اور فضا سے فلسفۂ حیات کو اخذ کیا ہے اور شفق کو ایک تمثیلی رنگ میں پیش کیا ہے۔

جمیل مظہری کے مجموعہ کلام ''عرفان جمیل'' کا ایک حصہ قصائد کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ ان قصیدوں میں 'طلوع سحر' مئے خانۂ کوثری میں بھی منظر نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں ۔

کف گل دیکھ کے رندوں کو پیمانہ
الٰہی خیر تو یہ کی عجب موسم ہے رندانہ۔۔۔۔ (مے خانۂ کوثری)
تجلی چھن رہی ہے آفتاب روئے روشن سے
نہ اس صحرا نے پہچانا نہ اس صحرا نے پہچانا۔۔۔۔ (طلوع سحر) ۱۶۹ے

چونکہ جمیل مظہری کا مزاج فلسفیانہ ہے اس لئے کوئی خارجی منظر اور بہاریہ پیکر صاف اور روشن نظر نہیں آتا۔ یہاں بھی ان کا سوچتا ہوا ذہن اور متجسس طبیعت اپنی جھلک دکھاتی ہے اور خارجی مناظر کی دھندلی سی تصویر سے داخلی احساسات اور فکری ارتعاش کی کرنیں

پھوٹتی ہیں۔

ان کی ایک رومانی نظم ''شاما کی یاد میں'' ہے جس میں منظر نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں چند بند ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوئی جاتی ہے چاندنی پھیکی پھیکی   سرکتی ہے چہرے سے زلفیں کسی کی
سنو آرہی ہے صدا بانسری کی   کہیں دل نے چھیڑا ہے ساز محبت
پریشاں ہیں آہیں تلاش اثر میں   ترے جلوے مہماں ہیں اب تک نظر میں
کہ چھٹکی ہوئی چاندنی ہے کھنڈر میں ۱۷۰   اس اجڑے ہوئی دل میں تیرا تصور

مندرجہ بالا بندوں میں منظر نگاری کے ساتھ ساتھ زبان کی شادابی و شگفتگی، بحروں کی روانی، تخیل میں نزاکت اور جذبۂ اظہار کا توازن نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

جمیل مظہری دیگر اصناف سخن کے علاوہ اپنے مرثیوں کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ ان کے مرثیوں میں منظر نگاری کے نمونے خاص طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں انہوں نے نمایاں طور پر انیس کی پیروی کی ہے۔ میر انیس کو مناظر قدرت کی مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ جمیل نے بھی اپنے مرثیوں میں نور سحر، غروب آفتاب، صحرا، دریا، بیاباں کے مناظر کو بیان کرنے میں تشبیہات اور استعارے سے کام لیا ہے۔

جمیل مظہری کے مرثیہ ''عزم محکم'' سے یہ مثال دیکھیے ؎

خواب گراں نے پیار کیا چشم ناز کو   کھولا عروس شب نے جو زلف دراز کو
جھونکا دیا تخیل راز و نیاز کو   شعلہ بنایا نرگس جادو طراز کو
انگڑائیاں تصورِ آغوش ہو گئیں ۱۷۱   سر سے ردائیں ڈھل کے سر دوش ہو گئیں

مرثیوں میں منظر نگاری کے متعلق ڈاکٹر سلام سندیلوی فرماتے ہیں:

> ''میر انیس کے مرثیوں کا اصل مقصد واقعات کربلا کا بیان ہے مگر مرثیہ کے تاثر کو بڑھانے کے لئے انہوں نے منظر نگاری بھی پیش کی ہے جس کی حیثیت محض پس منظر کی ہے۔'' ۱۷۲

جمیل مظہری نے حسن فطرت کے جو نمونے اپنے مرثیوں میں پیش کئے ہیں ان میں

تاریک راتوں کا منظر زیادہ ہے۔ایک جگہ ایک مرثیے میں صبح کی منظر نگاری کا دھندلا خاکہ ملتا ہے۔اس کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

محو دعا تھے شہ کہ سحر ناگہاں ہوئی
تمثیل رخصت مہ و انجم عیاں ہوئی
فطرت زبان حال سے افسانہ خواں ہوئی
سرخی شفق کی زیب سر داستاں ہوئی
وہ داستاں جو وقت کا خونی پیام تھی
وہ داستاں جو عصر سے پہلے تمام تھی

کھینچا عروس شب نے جو گوشہ نقاب کا
پردے سے منعکس ہوا رخ آفتاب کا
ٹوٹے خمار جیسے بتدریج خواب کا
جاگا سحر کی آنکھ میں جادو شباب کا
جلوے بکھیرتی ہوئی اٹھی سنگار کو
روکے لبوں پہ خندۂ بے اختیار کو

وہ صبح اور اس کے دھند لکے میں آسماں
سیدانیوں کے دل کا وہ اٹھتا ہوا دھواں
تڑکا تھا نور کا کہ تجلی تھی پر فشاں
آئینہ دار روئے علی اکبر جواں
آیات روشنی کے مفسر تھی وہ سحر ریش
سفید ابن مظاہر تھی وہ سحر۱۷۳

یہاں جمیل مظہری نے اپنے انداز بیان میں منظر نگاری کا جو بیان پیش کیا ہے وہ یقیناً حسن کارانہ ہے صبح کے منظر کی جیتی جاگتی مرقع کشی ہے۔

اردو شاعری میں جہاں جوش اور فراق ادب عالیہ کی آبرو سمجھے جاتے ہیں وہیں جمیل بھی ان کے شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔ان کے طرز بیان کی شگفتگی، حسن و عشق کی دلکش داستان سرائی، جذبات کی شدت، احساسات کی نزاکت، خیالات کی نفاست، لہجے کی شیرنی اور ترنم کی پر کیف فضا انہیں موجودہ دور کا باوقار شاعر قرار دیتی ہے۔

سلاؔم سندیلوی (۱۹۱۹ء): ڈاکٹر سلام سندیلوی کا اصل نام عبدالسلام اور تخلص سلام ہے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم سندیلہ ضلع ہردوئی اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ سے حاصل کی۔انہوں نے اردو اور تاریخ میں ایم اے کیا پھر پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں نیز گورکھپور یونیورسٹی میں درس و تدریس سے جڑے رہے۔

سلام سندیلوی ایک خوش گو شاعر ہیں اور ان کا خاص رجحان شروع سے ہی منظر نگاری

کی طرف رہا ہے۔ انہیں اپنی زندگی میں بے شمار مصائب و آلام سے دو چار ہونا پڑا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی مضطرب روح نے آغوش فطرت میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب شاعر خود کو مظاہر فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ کر لیتا ہے تو فطرت کی ہلکی سی کروٹ بھی اس کے دل و دماغ میں کیف و سرور کی لہریں پیدا کر دیتی ہیں۔ سلام سندیلوی نے اردو شاعری کے کینوس کو بڑی وسعت دی ہے۔ نیز ایسے زاویے اور گوشے دیئے ہیں جن میں نظر نوازی اور نظر فریبی کے ساتھ فطرت کا کامل حسن و جمال نمایاں ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی کو منظر نگار شعرا کی صف میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے کیونکہ وہ اس میدان کے شاعر ہی نہیں بلکہ محقق بھی ہیں۔ انہیں اردو شاعری میں منظر نگاری پر ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت وحدت تاثر ہے۔ ان کا ہر ایک مجموعہ کلام منظر نگاری پر مشتمل ہے۔ رباعیات کا مجموعہ 'شام وشفق' منظر نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ ہر رباعی میں ایک منظر پیش کیا گیا ہے اور پھر اس منظر کو کسی تاریخی یا روایتی واقعہ کا پس منظر بنا کر نئی معنویت بخشی ہے۔

ان کے مجموعے ''برگ و بار'' کی بیشتر نظمیں مختلف درختوں' پھولوں' پودوں وغیرہ پر مبنی ہیں۔ ان کی منظر نگاری میں بیرونی پہلو بھی ہے اور داخلی بھی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غم زدہ انسان بہتر طور سے منظر کشی کر سکتا ہے اور فطرت کو اپنے آرٹ میں سمو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی عمر سے ہی وہ فطرت کے متلاشی رہے ہیں۔ انہوں نے باغ و صحرا' تالاب' وسم' چاندنی شب' بسنت' ماہی گیری' بھوالی سینی' عشق پیچاں' کس می کو ئیک' نائٹ اوکلاک' رات کی رانی' کینا' گلاب' بیلا' برگ حنا' گل سوسن' گل مہدی' گل شبو' نرگس' میڈین ہیر' بلیڈنگ ہارٹ' بیچلرس بٹن' لاجونتی' ناگ پھنی' ہیوی کس' سالویا' پنیزی اور دوسرے پھول پتے' پودے' کانٹے اور موسم کا گہرا مشاہدہ اپنی منظری نظموں میں بڑے ہی دل فریب انداز میں کیا ہے۔ انہوں نے فطرت کے ان عناصر کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر فن کو حسن سے' حسن کو زندگی سے اور زندگی کو عروج انسانی کی عالمگیر جد و جہد سے ہم آہنگ

کیا ہے۔

یوں تو سلام سندیلوی کے مجموعہ ہائے کلام ''ساغرو مینا''، ''نکہت و نور'' اور ''شام شفق'' میں بے شمار منظریہ شاعری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں مگر ان کے مجموعے ''برگ و بار'' کی بیشتر نظمیں درختوں، پتوں، پھولوں اور پودوں پر مبنی ہیں۔ یہ ساری کی ساری نظمیں محاکاتی انداز میں پیش کی گئی ہیں اور مشاہدہ و تجربہ کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ان منظر کی روح سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ اس طرح منظر کشی فطرت نگاری کے ساتھ ساتھ انسانی حالات و کوائف کی نشاندہی بھی کرتی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔

ان کی ایک نظم ''ویپنگ ویلو'' ہے۔ یہ ایک پہاڑی درخت ہوتا ہے جس کی پتیوں کی شکل آنسوؤں کی دھار سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ان آنسو والے درخت کی کیفیت انسان کی فطرت سے کسی حد تک ملتی جلتی ہوتی ہے۔ سلام نے جس دانائی اور ٹھوس حقیقت کے ساتھ اس کی مثال پیش کی ہے قابل دید ہے ؎

روئے گیتی کے خط و خال سے یہ واقف ہے
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں ہے حالات جہاں
اس کی نظروں سے نہیں راز کوئی پوشیدہ
ہر طرف جنگ و جدل، آہ و بکا، شور فغاں[47]

سلام کی کی اک نظم ''بلیڈنگ ہرٹ'' ہے۔ یہ ایک قسم کا پتہ ہوتا ہے جس کی شکل دل سے ملتی ہوئی ہوتی جلتی ہوتی ہے۔ اس پتے پر سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے نشانات نظر آتے ہیں جو خون کے قطروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس پتے پر سلام کا ذہن بے شمار انسانی تاریخ کو عریاں کرتا ہے ؎

غور سے دیکھئے اس برگ حزیں کی جانب
یہ کسی خوگر فریاد و فغاں کا دل ہے
شیر افگن کے مقدر پہ ہے گریاں شاید
خون میں ڈوبا ہوا نور جہاں کا دل ہے

کیوں نظر آتے ہیں اس برگ پہ خوں کے آنسو
کیا سبب ہے جو یہ مغموم و حزیں رہتا ہے
اس پہ تحریر ہے حسرت کی خطائے معصوم
قلب شیرون سے ہمہ وقت لہو بہتا ہے ۵ ے!

''کس می کوئیک'' ایک سرخ رنگ کا ننھا سا پھول ہوتا ہے جس میں صرف دو پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ ایک کرخت اور خاردار شاخ پر کھلتا ہے۔ بعض اوقات کانٹے اس پھول کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ اس کو توڑتے وقت ہاتھ میں کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ اس میں کتنے ہی تاریخی حقائق سلاؔم نے بیان کئے ہیں اور آخر میں زندگی کو محبت کے بغیر بے معنی سمجھ کر زندگی کی پرتیں اس طرح کھولتے ہیں۔

اس کی آواز پہ لبیک کہوں گا میں ضرور
دل کھنچا جاتا ہے اس لے کے تسلسل کی طرف
کانٹے چبھتے ہیں تو چبھ جائیں مجھے فکر نہیں
لب بڑھاؤں گا بہر حال میں اس گل کی طرف ٦ ے!

سلاؔم سندیلوی کی منظر نگاری رسمی اور قیاسی نہیں ہے۔ وہ عینی مشاہدات سے کام لیتے ہیں نیز انہوں نے اردو شاعری میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے فطرت کے دائرے میں داخل دریا، جھیل، تالاب، آبشار، موج، گرداب، ساحل، پہاڑ، وادی، غار، میدان، کھیت، باغ، گلشن، چمن، پھول، پھل، کلیاں، سبزہ، جنگل، چٹان، ٹیلہ، جھاڑی، موسم اور تیوہار وغیرہ کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔

مجموعہ کلام 'ساغر و مینا' میں 'تالاب کے کنارے' 'پھر یہ موسم کہاں' بسنت' مجموعہ کلام ''نکہت و نور'' میں 'پارہ' 'ابر' 'ماہی گیر' اور مجموعہ کلام ''برگ و بار'' میں شامل پیڑ پودے اور پتیوں پر ان کی نظموں میں فطری منظر نگاری کے جلوے بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نظم 'لاجونتی' کا مندرجہ ذیل بند سلام کے عمیق اور عینی مشاہدات کا پتہ دیتے ہیں۔

ہاتھ پتی کو اگر آپ لگائیں بڑھ کر
شرم سے شاخ زمرد پہ سکڑ جائے گی
بند کر لے گی دہن اپنا بصد عشوہ و ناز
چند لمحوں کے لئے موت سے لڑ جائے گی
ختم ہو جاتی ہے اس کی حیا کچھ دیر کے بعد
اصل حالت میں نظر آئے گی پھر نازک شاخ
مسکرائے گی اسی طرح سے پھر گلشن میں
اسی انداز سے لہرائے گی پھر نازک شاخ ۷ ےا

متذکرہ بالا پودا تقریباً ایک فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔ اس کی پتیاں ببول کی پتیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ شاعروں نے اس کا نام ''ٹچ می نوٹ'' رکھا ہے۔ یہ بہت ہی حساس پودا ہوتا ہے۔ کوئی بھی چھوئے فوراً مرجھا جاتا ہے۔ جیسے شرما گیا ہو۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد پھر سابق حالت میں آجاتا ہے۔

ان کی نظم ''گل سوسن'' کی منظر نگاری ملاحظہ ہو ؎

کون کہتا ہے کہ سوسن کا ہے یہ نیلگوں جام
بیٹھی ہے سمٹی ہوئی شاخ کی آغوش میں شام
ذہن میں ایک نیا نکتہ ابھر آیا ہے
نیلگوں آسماں اس گل میں اتر آیا ہے

اور جل کمبھی کا یہ مشاہدہ قابل دید ہے ؎

چند نیلے پھول چسپاں ایک شاخ سبز سے
پانچ پنکھڑیوں کے نیلم ہر گل تر سے عیاں
ہر گل خوش رنگ کی اک پنکھڑی پر زرد داغ
خلد میں بھی ہو نہ شاید اس قدر دلکش سماں ۸ ےا

سلام سندیلوی کی فطری نظمیں بہت معیاری ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں نیچر اور اس کے لوازمات کی ہو بہو عکاسی کی ہے۔ مثال کے لئے ان کی نظمیں ''ماہی گیر'' اور ''بھوالی سینٹوریم'' قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں فطرت کی مصوری بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ 'ماہی گیر' کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

سحر کا وقت ' سہانی فضا' خنک دریا
سبک شعاعوں کا ذرات پر حسین خرام
وفور کیف سے بے خود زمردیں سبزہ
کنار آب چھلکتے ہوئے گلوں کے جام ۱۷۹

مندرجہ بالا بند میں سلام نے سحر کے وقت کی تمام فطری نیرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح نظم ''بھوالی سینٹوریم'' میں ڈاکٹر موصوف کی فطری شاعری کا بہترین مرقع دیکھنے کو ملتا ہے ؎

چیڑ کے پیڑوں پہ گالے روئی کے بکھرے ہوئے
سینۂ کہسار سے اٹھتا ہوا ہر سو دھواں
مست بھونروں کا ترنم شوخ کلیوں کے قریب
رقص وہ کرتی ہوئی پھولوں پہ رنگیں تتلیاں
دیو پیکر کوہساروں کی قطاریں دور تک
چرخ کی چھوتی ہوئی وہ بھیگی بھیگی چوٹیاں
بادلوں کی چھاؤں میں وہ اونگھتے کیفل کے پیڑ
کیف میں ڈوبے ہوئے پودوں کی وہ انگڑائیاں ۱۸۰

مندرجہ بالا بند میں کیف اور کیفل الفاظ کی مناسبت قابل غور ہے جو منظر نگاری کے حسن میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

سلام سندیلوی کی منظریہ نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر حالت میں ذہنی، جسمانی اور جذباتی طور سے انسان کا رشتہ فطرت سے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے

مشاہدے میں آئے ہوئے ہر منظر میں فطرت کو ڈھونڈتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر میں زمین اور کوہ و دشت ہرے بھرے ہیں۔ پہاڑوں نے ہرے رنگ کی اطلس پہن لی ہے۔ مشاطہ نسیاں کے ہاتھ چومنے کو بے قرار ہیں۔ اس نے باغوں کو موتیوں سے آراستہ کیا ہے۔ جس طرح دولھن ماتھے پر ٹیکا باندھتی ہے اسی طرح چمن زار سنہرے زیوروں سے سنورا ہوا ہے۔ ابر بہاری نے جو موتی بکھیرے ہیں ان سے سب دشت و جبل جگمگا رہے ہیں۔ ہری کنچن زمین پر سفید سفید بادلوں سے یوں جھڑی بندھ رہی ہے جیسے عاشق کے آنسو اس کے گریبان پر بہہ بہہ کے آتے ہوں۔ مصفا پانی کی نہریں ہر طرف ہنستی ہوئی بہہ رہی ہیں اور مستی و سرشاری میں چٹانوں سے ٹکرا کر پھر رہی ہیں۔ صبح سویرے جنگلوں میں طیور خوش الحان کے چہچہے جیسے سازندوں نے ساز چھیڑ دیا ہو۔

غرض سلاؔم سندیلوی کی منظریہ شاعری میں منظر نگاری کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن میں فطرت کے حسن و رنگ کو سمیٹنے اور سمونے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش انسانی فطرت و مزاج اور زندگی کی اونچ نیچ کو اجاگر کرتی ہوئی ایک دلپذیر نقش چھوڑتی ہے جن سے زندگی بنتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔

احسانؔ دانش (۱۹۱۴ء۔۱۹۸۲ء): احسان دانش کاندھلہ مظفر نگر کے نہایت مفلس اور کم تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قاضی دانش علی تھا۔ اسی مناسبت سے احسان دانش ان کا نام ہے۔ ان کے والد محنت مزدوری کرکے بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ مفلسی کی وجہ سے احسان چوتھی جماعت تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔ انہیں معاش کے لئے بہت مشقتیں اٹھانی پڑیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے مطالعہ اور شعر و شاعری کے ذوق کو جاری رکھا جس کا انہیں ابتدا سے ہی جنون تھا۔

احسان دانش چونکہ مزدور گھرانے میں پیدا ہوئے اس لئے وہ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے مزدور ان کی شاعری کا خاص موضوع رہے ہیں۔ مفلوک الحال محنت کش طبقے کی صحیح ترجمانی اور بیانیہ شاعری میں دلکش

مرقعوں کے علاوہ احسان دانش کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات اور مناظر فطرت کی عکاسی بھی بہت نمایاں ہے۔ یہ دونوں موضوعات اس دور کے رومانوی شعرا کے یہاں عام طور پر ملتی ہیں۔

وطن اور اس کی تمام اشیاء سے دل بستگی کا اظہار اور مناظر فطرت مثلاً آمد بہار، کیفیات چمن، موسم برسات، طلوع صبح، دیہات کی شام، کھیتوں، دریاؤں، پہاڑوں، اور دامن کوہ کے نظاروں کا بیان میلوں ٹھیلوں کا ذکر وغیرہ احسان نے اپنی

نظموں میں بہت سلیقے سے کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا مجموعہ کلام "نفیر فطرت" کی نظمیں جہانگیر کے مقبرے کی ایک شام، برسات کی ایک چاندنی رات، شباب چمن، دیہات کی ایک شام، کیف برشگال، کیف چمن، صبح گلستاں، صبح بیاباں، وغیرہ اور ان کے مجموعے "چراغاں" کی اس موضوع پر نظمیں مثلاً شام برشگال، آفتاب تازہ، آئینہ سحر، کاروان بہار، ساون کی گھٹا، مہتاب در مہتاب، جلوۂ زار صبح وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "دیہات کی شام۔" چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شام کے اندھیرے میں دن کا اجالا کھو گیا
آگ کے چو گرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا!

بالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دھندلا چراغ!

مشورے ہونے لگے نشو و نما کے باب میں
سادہ خاطر بہہ چلے تقریر کے سیلاب میں

یہ وہ ہیں جن پر تغافل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں

جن کے گردِ رہ سے گزر ہے غازۂ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلف روزگار

بازوؤں پہ جن کے نازاں فطرت گلشن طراز
کاوشوں سے جن کی حسن انجمن مائل بہ ناز!

واہ رے دیہات کے سادہ تمدن کی بہار
سادگی میں بھی کیا کیا ترا دامن زر نگار

دل یہ کہتا ہے فراق انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں![۱۸۱]

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے دیہات میں فطرت کی رعنائی اور سادگی کا بیان بڑی ہی فنکارانہ مہارت کے ساتھ کیا ہے اور اس میں کسانوں اور چرواہوں کے شب و روز کی تلخ حقیقتوں کا بھی دل سوز انداز میں تذکرہ کیا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

محنت کش اور مفلوک الحال عوام کی اتنی بھرپور عکاسی اردو شاعری میں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ عکاسی نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی ہے لیکن انکا لب ولہجہ اتنا تند وتیز نہیں ہے جتنا احسان دانش کا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''نظیر اکبر آبادی کے بعد عوام کی زندگی کی ترجمانی سب سے زیادہ احسان دانش نے ہی کی ہے۔ لیکن نظیر میں اور احسان میں فرق یہ ہے کہ نظیر کے موضوع معین تھے نہ مقصد، لیکن احسان کے پاس دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اسی لئے نظیر اکبر آبادی کے تنوع اور اہتزاز شعری کے مقابلے میں احسان کے پاس تخصیص اور تلخی دکھائی دیتی ہے۔''[۱۸۲]

مجید امجد (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۴ء): مجید امجد کے والد کا نام میاں علی محمد تھا جو محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ مجید چھ ماہ کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ تین برس کے ہوئے تو ان کے والد نے دوسری شادی کر لی اور ان کے نانا میاں نور محمد نے جو کہ اپنے عہد کے فقیہہ' محدث بے مثال عالم اور ماہر طب تھے' نے مجید کو گود لے لیا۔ میاں نور محمد کے یہاں روزانہ اہل علم حضرات کی مجلس ہوتی تھی لہٰذا مجید بھی اس میں شامل ہونے لگے۔ انہیں مجلسوں نے انہیں علمی و ذہنی بالیدگی عطا کی۔

مجید نے تمام زندگی ناکامیوں اور محرومیوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گزاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بھی ان کے درد وغم کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ وہ بظاہر ہمیں کہیں کہیں مسکراتے ہوئے بھی دکھائی تو دیتے ہیں لیکن پس پردہ اس میں ایک درد اور کسک کو بھی صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''پچاسویں پت جھڑ'' سے ان کی اس کیفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بند درج ذیل ہے ؎

اتنا بھرپور سماں تھا' مگر اب کے مجھے جس نے بھی دیکھا یہ کہا!
''جانے کیا بات ہوئی' کچھ تو بتا'
تیرے ہونٹوں پہ تو بس ایک وہ مرجھائی ہوئی موج تبسم بھی گئی۔۔۔''
میں اب کس کو بتاؤں کہ میرے پیکر میں
اک تپش ایسی بھی ہے' جس کے سبب'
روح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے'
سانس کے بل میں پنپنے کی سکت بٹتی ہے'
ٹوٹتی کڑیوں میں جینے کی جتن جڑتے ہیں[۱۸۴]

مجید امجد کو مظاہر فطرت سے گہرا لگاؤ ہے۔ مظاہر فطرت میں انہوں نے ایسے حسین نظاروں کی مرقع کشی نہیں کی ہے جو ہر فرد بشر کا دل موہ لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ کھیت' کھلیان' رہٹ' فصلیں' ندی' نالے' راجباہے' نہریں اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں ان کی شاعری کا محور رہی ہیں۔ درخت تو خاص طور پر انہیں بہت

عزیز ہیں جنہیں تمثیلاً انہوں نے اپنی شاعری میں جابجا استعمال کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''اس کے یہاں ہرے بھرے شجر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نے شجر کو نہ صرف ہر رنگ و روپ میں دیکھا ہے بلکہ زاویہ نگاہ کو بھی بدل بدل کر اس کا نظارہ کیا ہے۔ مجید امجد کے لئے شجر بیک وقت ایک دوست' محبوب' دست گیر' سخی اور بھکاری ہے اور آخر میں تو محسوس ہوتا ہے جیسے خود مجید امجد بھی کسی ترو تازہ پیڑ ہی کا ایک روپ ہے۔۔۔ایسا پیڑ جس نے زمین کو اپنے کلاوے میں جکڑ رکھا ہے مگر جس کا چھتنار سر اٹھائے آسمان سے محو گفتگو ہے۔'' ۱۸۵؎

مجید امجد کا شجر سے یہ تعلق ان کی نظموں ''سوکھا تنہا پتہ'' ''دور کے پیڑ'' ''ایک کوہستانی سفر کے دوران میں'' ''شاخ چنار'' ''توسیع شہر'' ''صبح کے اجالے میں'' ''یہ سر سبز پیڑوں کے سائے'' سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی ایک مختصر نظم ''توسیع شہر'' ہے۔ یہ نظم ایک لحاظ سے درختوں کا نوحہ ہے۔ مسدس کے فارم میں پیش کی گئی اس نظم میں شاعر جب گاتی نہر کے متصل جھومتے کھیتوں کی سرحد پر ہرے بھرے درختوں کی ایک پوری قطار کو قاتل تیشوں کی زد میں دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ جگہ ایک مقتل بن گئی ہے جہاں اس کے دوست اور ہمراز قتل ہو رہے ہیں۔ اور وہ سوچتا ہے کہ وہ ان درختوں کے بغیر تنہا کیسے جی پائے گا۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ ان درختوں کے ساتھ اسے بھی کاٹ دیا جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر' بانکے پہرے دار
گھنے' سہانے' چھاؤں' چھڑکتے' بور لدے' چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے' ہرے بھرے اشجار
جس کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھرام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل جھڑتے پنجر' چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک اے آدم کی آل ۱۸۵

مجید امجد نے شجر کی تمام تر خصوصیات کو مقدور بھر اپنی زندگی میں سمو لیا ہے۔ ان کی پوری زندگی مصائب آلام کا مجموعہ رہی ہے اور انسان کا دل جب غم و الم سے لبریز ہوتا ہے تو وہ فطرت اور اس کے مختلف عناصر سے ہم آہنگ ہو کر بڑا ہی سکون محسوس کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ مجید امجد کو فطرت کے ایک اہم عنصر 'درخت' سے لگاؤ ان کی شاعری میں جا بجا دیکھائی دیتا ہے۔

درخت کو انہوں نے ایثار و قربانی کی علامت کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ درخت خود تو دھوپ میں جلتا ہے مگر تھکے ماندے مسافروں کو ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے۔ درخت کے دل پر آرے چلتے ہیں مگر وہ لوگوں کے لئے پھل مہیا کرتا ہے اور تن من سے خلق خدا کی خدمت میں مصروف رہتا ہے اور اپنی فیض رسانی سے کبھی غافل نہیں رہتا۔ مجید امجد نے درخت کی اسی بے مثال قربانی کے جذبے کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ''ایک کوہستانی سفر کے دوران'' میں درخت کی بے لوث دستگیری کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

تنگ پگڈنڈی سر کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے دونوں سمت گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ' اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخل بلند
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ

موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دست گیری کا امیں
آہ۔ ۔ ۔ ۔ ان گردن فرازان جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنہیں حاصل نہیں!!۱۸۶

مجید امجد کا نام منظر نگار شعرا میں اہم ہے۔ان کی شاعری اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ اس بری کائنات میں ہزاروں شعری موضوعات قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں وہ اس کائنات اور اس کے مظاہر کو انتہائی قریب سے دیکھتے ہیں اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ شاعری کا موضوع بنا دیتے ہیں۔ وہ چاند تاروں اور کہکشاں کی مرقع نگاری نہیں کرتے بلکہ اپنے گردوپیش کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ کھیت' کھلیان' رہٹ' فصلیں' ندی' نالے' نہریں اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں ان کی شاعری کا محور رہی ہیں۔ فطرت کے ساتھ مجید امجد کے گہرے رابطے کی نشاندہی کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''مجید امجد اردو شاعری میں نیچر سے گہری اور با مقصد و با معنی دوستی کی ایک نہایت بلیغ مثال ہے اور اس دوستی کو صرف وہی اہل فن نبھا سکتے ہیں جو اپنے اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا کو یوں مربوط اور ایک جان کر لیتے ہیں کہ جب باہر پھول کھلتا ہے تو مہک ان کے اندر تک پہنچتی ہے اور جب ان کے اندر کسی خیال کی کلی چٹکتی ہے تو باہر گلزاروں کے رنگ جگمگا اٹھتے ہیں''۱۸۷

غرض مجید امجد اپنے گردوپیش کے مناظر سے شاعرانہ تخیل کی ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔ موضوعاتی تنوع' نئی نئی جہتوں کی نشاندہی اور زبان واسلوب کے بندھے ٹکے اصولوں کے بجائے نئے پہلوؤں کی تلاش مجید امجد کے یہاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

اختر الایمان (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۹۶ء): سہنی قلعہ پتھر گڑھ نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مسجد میں امام تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ہریانہ کے قصبہ بوریا میں ہوئی۔ ابتدائی دنوں سے ہی شعر وشاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ تقسیم ملک کے دور میں ایک جدید' منفرد اور خود آگاہ شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم میں کامیاب ہوئے۔ وہ جدید شعرا کے ہجوم میں اپنے اسلوب اور آزادئی فکر کی بدولت دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت فعالیت' ہمہ گیری اور تاثر پذیری میں یکتا ہے۔

اختر الایمان بیسویں صدی کے اہم ترین نظم گو شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد تقریباً ان کے دس شعری مجموعے اور کلیات شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اختر الایمان کی شاعری کوئی سیاسی شاعری نہیں ہے۔ ان کا کلام پوری طرح اپنے وقت کی زبوں حالی کی تصویر ہے۔ ان کی نظموں کو دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ان کے روح کے سارے کرب نے سمٹ کر شاعری کا روپ دھار لیا ہے۔ غم اور کرب کی یہ کیفیت محض ان کی چند نظموں میں ہی نہیں ہے بلکہ پوری شاعری ہی اس کی ترجمان ہے۔ ان کے مجموعہ کلام 'گرداب' کی نظم ''مسجد'' کے مندرجہ ذیل بند ملاحظہ ہوں ؎

دور برگد کی گھنی چھاؤں میں خاموش ملول
جس جگہ رات کے تاریک کفن کے نیچے
ماضی و حال گنہہ گار نمازی کی طرح
اپنے اعمال پہ رو لیتے ہیں چپکے چپکے
ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی ندّی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی
مرثیہ عظمت رفتہ کا پڑھا کرتا ہے ۱۸۸

مندرجہ بالا بند میں شاعر نے مناظر فطرت کو علامت کے طور مسجد کی ویرانی یا پھر تہذیبوں کے زوال کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

ان کے پہلے مجموعہ کلام ''گرداب'' کی نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مناظر فطرت کا جو نقشہ بھی کھینچا ہے' آنسو ہر شئے میں محیط ہے اور ماحول کی ہر شئے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہے۔ اوس کا قطرہ' گول سا چاند' سوکھا ببول' سب کے سب سوگواری اور اداسی میں تحلیل ہو گئے ہیں۔

اختر الایمان کی نظموں میں منظر نگاری کے نمونے ہر چند کہ کم دکھائی دیتے ہی لیکن جو ہیں وہ بالکل نئی علامتوں کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں مثال کے طور پر ان کی نظم ''تاریک سیارہ'' ہے جس کے بند درج کئے جاتے ہیں ؎

جان من حجلئہ تاریک سے نکلو دیکھو
کتنا دلکش ہے یہ رات میں تاروں کا سماں
آسماں چھلکے ہوئے جام کی مانند حسیں
خلد میں دودھ کی اک نہر سی ہے کاہکشاں ١٨٩

آگے شاعر کہتا ہے ؎

آسمانوں کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
ظلم پروردہ پہاڑوں کی طرف دیکھو تو
خاک پروردہ بہاروں کی طرف دیکھو تو ١٩٠

مندرجہ بالا بندوں میں شاعر نے آسمان' سیارہ اور ماہ و انجم کا ذکر کر کے خیالوں کی جیسی حسین دنیا کو مناظر فطرت کے حوالے سے تعمیر کی ہے ویسی مثال خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اختر الایمان کی نظموں میں محبت کی جاودانی کا ذکر جا بجا ملتا ہے لیکن انہوں نے دوسرے شعرا سے بالکل مختلف فکری انداز میں اس کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مجموعہ کلام تاریک سیّارہ کی نظم 'محبت' کا یہ بند ملاحظہ کیجیے ؎

رات میں دیر تک اڑتے بادل کھلے چاند کی کش مکش
ٹکٹکی باندھ کر ایسا دیکھا کیا جیسے یہ ماجرا

میری ہی داستاں کا کوئی پارہ ہے' کون آوارہ ہے
تو کہ میں ؟ ایک چھوٹا سا طائر فضا میں تھا نغمہ سرا
دور نزدیک' پھر دور ہر سمت اک تان کی گونج تھی ۱۹۱

مندرجہ بالا نظم میں بادل اور چاند کی کشمکش زندگی میں مصائب اور مسرت کی آویزش کو ظاہر کرتی ہے۔ شاعر نے نئے فکری آہنگ اور علائم کو اختیار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں ''شفق'' ''آخر شب'' ''رخصت'' بھی قابل ذکر ہیں اور منظر نگاری کے نمونے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

اختر الایمان کے کرداروں میں جہاں میر ناصر حسین' حبیبہ اور ایک لڑکا ہیں' وہیں ان کی نظم 'سب رنگ' کے کرداروں میں ایک گدھا' ایک سانپ' ایک بندر' ایک گینڈا اور کچھ دیگر جانور بھی شامل ہیں جنہیں ہم فطرت کے عناصر کا اہم حصہ شمار کرتے ہیں۔ ان کے مناظر خالص ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

آصف فرخی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اختر الایمان خود اپنی منظر نگاری کے سلسلے میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''میرے یہاں آپ دیکھئے کہ جو نیچر ہے وہ بدرجہ اتم ہے۔ میں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں جو نام استعمال کئے ہیں' جو پھول اور پیڑ استعمال کئے ہیں وہ ایران سے نہیں آئے' وہ جامن ہے' وہ گوندنی ہے' آم ہے' بڑ ہے' پیپل ہے' کیکڑ ہے' نیم ہے۔ تو یہ سب جو ہے یہ میرا اپس منظر ہے۔'' ۱۹۲

مجموعی طور پر اختر الایمان کی پوری شاعری بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس میں پرانی قدروں کے زوال کی کہانی اور ان سے وابستگی کا اعلان بھی ہے اور نئی قدروں کے فروغ کا امکان بھی۔ اس میں ذاتی اور قریبی تجربات کا بیان بھی ہے اور اجتماعی کرب کی داستان بھی۔

❁ ❁ ❁

حواشی

۱۔ آل احمد سرور، نئے پرانے چراغ، ص ۱۳
۲۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص ۱۴۰
۳۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری، (مقدمہ)، ڈاکٹر سیّد طلعت حسین نقوی، ص ۱۵
۴۔ کلیات نظیر، عبدالباری آسی مرحوم، ص ۵۵۶۔۶۷
۵۔ ماہنامہ نگار، بابت اگست ۱۹۴۴ء ص ۲۳، بحوالہ نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، ڈاکٹر سیّد آل ظفر، ص ۱۹۱
۶۔ ماہنامہ نگار، بابت ۱۹۴۴ء ص ۲۳، بحوالہ نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، ڈاکٹر سیّد آل ظفر، ص ۵۶۳
۷۔ ایضاً، ۵۶۵
۸۔ پروفیسر آل احمد سرور، تنقید کیا ہے؟ ص ۲۳
۹۔ ایضاً، ص ۵۴۹
۱۰۔ ایضاً، ص ۵۳۳
۱۱۔ پروفیسر آل احمد سرور، تنقید کیا ہے؟ ص ۵۸۱
۱۲۔ نیاز فتح پوری، مضمون: نظیر میری نظر میں، بحوالہ نظیر نامہ، مرتبہ شمس الحق عثمانی، ص ۱۰۱
۱۳۔ مخمور اکبر آبادی: نظیر نامہ، ص ۱۳۱
۱۴۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص ۳۴۶
۱۵۔ گرہ بند، کلیات نظیر، ص ۳۱۴
۱۶۔ نظیر اکبر آبادی کی مصوّری، سلیم جعفر، بحوالہ زمانہ، ستمبر ۱۹۴۴ء ص ۱۰۴
۱۷۔ نظیر کا درجہ اردو شاعری میں، سیّد رضی الدین، ص ۱۹۶
۱۸۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، جلد اوّل، ضمیمہ، ص ۳۹
۱۹۔ جدید شاعری کا نقطہ آغاز: اسمٰعیل میرٹھی، ڈاکٹر شاد شاداب علیم، ص ۳۹۱
۲۰۔ جدید اردو شاعری، پروفیسر عبدالقادر سروری، ص ۱۵۰
۲۱۔ حیات و کلیات اسمٰعیل، مرتبہ محمد اسلم سیفی، ص ۵۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۳۔ حیات اسمٰعیل، ڈاکٹر سیفی پریمی، ص ۱۷۵۔۷۶

۲۴۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص ۴۸۔۴۹

۲۵۔ بحوالہ جدید نظم: حالی سے میرا جی تک، ڈاکٹر کوثر مظہری، ص ۹۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۶

۲۷۔ جدید نظم حالی سے میرا جی تک، ص ۱۰۵۔۱۰۶

۲۸۔ حیات اسمٰعیل، ڈاکٹر سیفی پریمی، ص ۱۹۸

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۳۰۔ جدید شاعری کا نقطۂ آغاز: شاداب علیم، ص ۲۴۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۶۸۔۶۹

۳۳۔ پیش لفظ: حیات اسمٰعیل، سیفی پریمی، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۷۶، ص ۶

۳۴۔ بزم اکبر؛ مرتبہ مولوی قمر الدین احمد بدایونی، ص ۸۰۷، بحوالہ اکبر الہ آبادی کی شاعری، ساحل احمد، ص ۱۴

۳۵۔ کلیات اکبر، حصہ اوّل، مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس، دہلی، ص ۲۴۴

۳۶۔ نظیر اکبر آبادی اور ان کا عہد، ص ۵۲، بحوالہ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، ص ۲۲۲

۳۷۔ مناظر قدرت، محمد الیاس برنی، ص ۱۳۶

۳۸۔ اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، کلیم الدین احمد، ص ۷۱

۳۹۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری، ساحل احمد، ص ۷۹

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۹۔۸۰

۴۱۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ص ۳۶۰

۴۲۔ کار امروز، سیماب اکبر آبادی، ص ۱۵۹

۴۳۔ بیسویں صدی کی اردو نظم پر اقبال کے اثرات، رئیسہ پروین، ص ۱۹۸

۴۴۔ کار امروز، سیماب اکبر آبادی، ص ۱۹۷۔۹۸

۴۵۔ ایضاً‘ ص ۱۸۱
۴۶۔ خم کدۂ سرور‘ دیباچہ سرور جہاں آبادی‘ ص ۶
۴۷۔ ایضاً‘ ص ۲۰۵
۴۸۔ مقامات اقبال‘ ڈاکٹر سیّد عبداللہ‘ ادارۂ علم و ادب لاہور‘ ص ۸
۴۹۔ کلیّات اقبال‘ بانگ درا: علامہ اقبال‘ ص ۱۴۹
۵۰۔ ایضاً‘ ص ۲۳۶
۵۱۔ ایضاً‘ ص ۲۳
۵۲۔ ایضاً‘ ص ۲۳
۵۳۔ ایضاً‘ ص ۸۳
۵۴۔ کلیّات اقبال‘ بانگ درا‘ علامہ اقبال‘ ص ۲۴
۵۵۔ ایضاً‘ ص ۵۳
۵۶۔ ایضاً‘ ص ۹۲
۵۷۔ ایضاً‘ ص ۴۶۔۴۷
۵۸۔ ایضاً‘ ص ۱۲۸
۵۹۔ ایضاً‘ ص ۸۳
۶۰۔ ایضاً‘ ص ۹۱
۶۱۔ ایضاً‘ ص ۵۷
۶۲۔ کلیات اقبال‘ بال جبریل‘ ص ۵۸۵
۶۳۔ کلیات اقبال‘ بانگ درا‘ ص ۲۰۴
۶۴۔ کلیات اقبال‘ بال جبریل‘ ص ۵۷۴
۶۵۔ کلیات اقبال‘ بانگ درا‘ ص ۱۷۲
۶۶۔ ایضاً‘ ص ۱۰۹۔۱۱۱
۶۷۔ ایضاً‘ ص ۷۲۔۷۳
۶۸۔ ادب شناسی‘ رفعت سروش‘ ص ۸۳
۶۹۔ صبح وطن‘ چکبست‘ ص ۹۵

۷۰۔ جدید اردو شاعری' پروفیسر عبدالقادر سروری' ص ۲۷۵
۷۱۔ صبح وطن' چکبست 'ص ۱۶۸۔۶۹
۷۲۔ مضمون: میری شاعری پر انگریزی ادب کے اثرات' فراق گورکھپوری' آجکل' مارچ ۱۹۶۴ء ص ۳
۷۳۔ فراق گورکھپوری کی نظمیہ شاعری' ایوان اردو' فروری ۲۰۰۹' ص ۱۶
۷۴۔ کلیات فراق گورکھپوری' مطرب نظامی' ص ۲۱۳
۷۵۔ ایضاً' ص ۲۰۷
۷۶۔ کلیات فراق گورکھپوری' مطرب نظامی' ص ۱۸۹
۷۷۔ روپ کی رباعی' کلیات فراق گورکھپوری' ص ۴۲۸
۷۸۔ بیسویں صدی کی اردو نظم پر اقبال کے اثرات' رئیسہ پروین' ص ۱۲۳
۷۹۔ جوش ی من ٗری شاعری' ڈاکٹر محمد کوثر اعظم' ص ۵۵
۸۰۔ ایضاً' ص ۶۲
۸۱۔ بیسویں صدی کی اردو نظم پر اقبال کے اثرات' رئیسہ پروین' ص ۱۲۴
۸۲۔ انتخاب کلیات جوش' فضل امام' ص ۳۸
۸۳۔ جوش کی منظری شاعری' ص ۸۴۔۸۵
۸۴۔ جوش ملیح آبادی: فکر وفن' ڈاکٹر ثریا خانم' ص ۸۸۔۸۹
۸۵۔ جوش کی منظری شاعری' ص ۱۵۰
۸۶۔ افکار: جوش نمبر' اکتوبر۔نومبر ۱۹۶۱ء' مشمولہ شاعر فطرت جوش' از اثر لکھنوی' ص ۵۹۵
۸۷۔ تشکیل جدید: عبدالمغنی' مشمولہ جوش کی شاعری کی اہمیت' ص ۸۹
۸۸۔ پگھلا نیلم' سجاد ظہیر' ص ۱۱۲
۸۹۔ پرانا باغ: پگھلا نیلم' سجاد ظہیر' ص ۶
۹۰۔ ایضاً' ص ۸
۹۱۔ اختر شیرانی کی جنسی و رومانی شاعری' قمر جہاں' ص ۹۵۔۹۶
۹۲۔ ایضاً' ص ۱۰۰
۹۳۔ ایضاً' ص ۱۰۳

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۹۶۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۹۷۔ زبان و ادب، نگارشات خواتین نمبر، ص ۷۶

۹۸۔ اختر اورینوی: حیات اور شاعری، ڈاکٹر قاسم فریدی، ص ۵۰

۹۹۔ زبان وادب، نگارشات خواتین نمبر، ص ۵۹

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۰۳۔ نسخہ ہائے وفا، کلیات فیض: فیض احمد فیض، ص ۱۳

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۰۵۔ فیض احمد فیض: ایک تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص ۱۵۵

۱۰۶۔ نسخہ ہائے وفا، کلیت فیض ،فیض احمد فیض، ص ۳۵

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۰۸۔ زنداں کی ایک صبح، دست صبا، کلیات فیض، ص ۱۸۲

۱۰۹۔ کلیات فیض: فیض احمد فیض، ص ۲۷

۱۱۰۔ ملاقات: زنداں نامہ، بحوالہ نسخہ ہائے وفا، کلیات فیض، ص ۲۵۱

۱۱۱۔ آجکل، فروری ۲۰۱۱ء، ص ۲۰

۱۱۲۔ نقش فریادی، دیباچہ، ن م راشد، ص

۱۱۳۔ دو عشق: دست صبا، بحوالہ نسخہ ہائے وفا، کلیات فیض، ص ۴۸

۱۱۴۔ کلیات علی سردار جعفری، جلد دوم، مرتب علی احمد فاطمی، ص ۴۹۴

۱۱۵۔ آجکل، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲

۱۱۶۔ کلیات علی سردار جعفری، جلد اوّل، مرتب علی احمد فاطمی، ص ۱۹۴

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۸۷۔۸۸

۱۱۹۔ ایضاً ‘ص ۴۷

۱۲۰۔ آجکل ‘اکتوبر ۲۰۰۰ء ‘ص ۲۶

۱۲۱۔ ایوان اردو ‘اگست ۲۰۰۲ء ‘ص ۳۹

۱۲۲۔ سلام مچھلی شہری: شخصیت اور فن‘ ڈاکٹر عزیز اندوری ‘ص ۱۹۷

۱۲۳۔ ایضاً ‘ص ۱۵۸

۱۲۴۔ ایضاً ‘۱۶۰

۱۲۵۔ جدید اردو نظم ‘نظریہ و عمل ۱۹۸۰ء ‘عقیل احمد صدیقی ‘ص ۱۴۸۔۲۴۹

۱۲۶۔ جدید اردو نظم: حالی سے میراجی تک ‘ڈاکٹر کوثر مظہری ‘ص ۳۶۴

۱۲۷۔ تبسم کاشمیری لا۔ راشد ‘۱۹۹۴ء ص ۱۳

۱۲۸۔ تسلسل کے صحرا میں: لا۔ انسان ‘بحوالہ جدید نظم: حالی سے میراجی تک ‘ص ۳۶۵

۱۲۹۔ اردو نظم اور ترقی پسند عہد کے میلانات ‘جمشید احمد ‘ص ۱۲۶

۱۳۰۔ ایضاً ‘ص ۱۶۶

۱۳۱۔ لاہور کا دبستان شاعری ‘ڈاکٹر علی محمد خان ‘ص ۵۰۵

۱۳۲۔ ایضاً ‘ص ۱۶۸

۱۳۳۔ ایضاً ‘ص ۲۰۳

۱۳۴۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات ‘ڈاکٹر حامدی کاشمیری ‘ص ۴۸۷

۱۳۵۔ ایضاً ‘ص ۴۸۷

۱۳۶۔ ایضاً ‘ص ۴۸۸

۱۳۷۔ اردو ادب کی تحریکیں ‘ابتدا تا ۱۹۵۷ء ‘ڈاکٹر انور سدید ‘ص ۵۷۳

۱۳۸۔ لاہور کا دبستان شاعری ‘ڈاکٹر علی محمد خاں ‘ص ۴۹۶

۱۳۹۔ جدید نظم: حالی سے میراجی تک ‘ڈاکٹر کوثر مظہری ‘ص ۴۰۸

۱۴۰۔ ایضاً ‘ص ۴۰۹

۱۴۱۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات ‘ڈاکٹر حامدی کاشمیری ‘ص ۴۸۲

۱۴۲۔ ایضاً ‘ص ۴۸۴

۱۴۳۔ ایضاً ‘ص ۴۸۴

۱۴۴۔ پانچ جدید شاعر' حمید نسیم' ص ۲۳۳

۱۴۵۔ ایضاً' ص ۲۳۳۔۳۴

۱۴۶۔ ایضاً' ص ۲۴۲

۱۴۷۔ اردو نظم اور ترقی پسند عہد کے میلانات' جمشید احمد' ص ۲۴۰

۱۴۸۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات' ڈاکٹر حامدی کاشمیری' ص ۱۷۴

۱۴۹۔ کیدار کا روپ' منزل شب' ص ۸۴

۱۵۰۔ جدید نظم: حالی سے میرا جی تک' ص ۴۱۲

۱۵۱۔ بیسویں صدی کی اردو نظم پر اقبال کے اثرات' رئیسہ پروین' ص ۲۳۲

۱۵۲۔ ایضاً' ص ۲۳۷

۱۵۳۔ ایضاً' ص ۲۳۷

۱۵۴۔ ایضاً' ص ۲۴۲

۱۵۵۔ ایضاً' ص ۲۴۳

۱۵۶۔ مجموعہ کلام حفیظ' ۱۹۷۶ء ص ۲۷

۱۵۷۔ بیسویں صدی کی اردو نظم پر اقبال کے اثرات' رئیسہ پروین' ص ۲۴۳

۱۵۸۔ انتخاب کلام حفیظ' ص ۲۰

۱۵۹۔ حفیظ جالندھری کا تنقیدی مطالعہ' مظفر شہمیری' ص ۴۷

۱۶۰۔ ایضاً' ص ۵۷

۱۶۱۔ اردو شاعری میں منظر نگاری' ڈاکٹر سلام سندیلوی' ص ۴۲۲

۱۶۲۔ حفیظ کی نظم نگاری کا فنی ارتقا' ص ۶۴

۱۶۳۔ اردو شاعری میں منظر نگاری' سلام سندیلوی' ص ۴۲۱

۱۶۴۔ حفیظ جالندھری کا تنقیدی مطالعہ' مظفر شہمیری' ص ۱۰۵

۱۶۵۔ ایضاً' ص ۱۱۶۔۱۷

۱۶۶۔ آجکل اکتوبر ۱۹۵۲ء' ص ۴۷

۱۶۷۔ ایضاً' ص ۴۷

۱۶۸۔ ماہنامہ سہیل' گیا' علامہ جمیل مظہری نمبر' ص ۴۵

۱۶۹۔ ماہنامہ سہیل' گیا' فروری۔ مارچ' ۱۹۸۲ء' ص ۱۵۵
۱۷۰۔ جمیل مظہری بحیثیت مرثیہ نگار' ڈاکٹر نفیس فاطمہ' ص ۱۵۸
۱۷۱۔ اردو شاعری میں منظر نگاری' سلام سندیلوی' ص ۲۱۲
۱۷۲۔ جمیل مظہری بحیثیت مرثیہ نگار' ڈاکٹر نفیس فاطمہ' ۱۹۰
۱۷۳۔ مطالعہ سلام سندیلوی' نسیم انہونوی' ص ۲۱۱
۱۷۴۔ ایضاً' ص ۲۱۲
۱۷۵۔ ایضاً' ص ۲۱۲
۱۷۶۔ ایضاً' ص ۲۱۸
۱۷۷۔ ایضاً' ص ۲۱۸
۱۷۸۔ ایضاً' ص ۲۶۰
۱۷۹۔ ایضاً' ص ۲۶۱
۱۸۰۔ تفسیر فطرت' احسان دانش' مکتبہ دانش لاہور' ص ۹۲۔۹۳
۱۸۱۔ جدید اردو شاعری' عبدالقادر سروری' شیخ غلام علی لاہور' ص ۲۷۸
۱۸۲۔ لوح دل' کلیات امجد' ص ۲۹۷
۱۸۳۔ مجید امجد کی شاعری میں شجر (مقالہ) وزیر آغا' ماہنامہ اوراق لاہور' بابت نومبر دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۲۱۱
۱۸۴۔ لوح دل' کلیات مجید امجد' ص ۲۳۶
۱۸۵۔ ایضاً' ص ۹۴
۱۸۶۔ اردو نظم اور ترقی پسند عہد کے میلانات' جمشید احمد' ص ۲۵۰
۱۸۷۔ کلیات اختر الایمان' مرتب بیدار بخت' ص ۷۰
۱۸۸۔ تاریک سیارہ: ایک کشمکش' کلیات اختر الایمان' ص ۱۸۱
۱۸۹۔ ایضاً' ص ۱۸۴
۱۹۰۔ ایضاً' ص ۲۳۲
۱۹۱۔ آجکل فروری ۱۹۹۴ء ص ۵۲

❁ ❁ ❁

باب پنجم

آزادی کے بعد کا دَور

آزادی کے بعد اردو نظم

آزادی کے ان پچاس برسوں میں اردو ادب اور خاص طور سے شاعری نے اپنی تاریخ کا سب سے سرگرم دور دیکھا ہے۔ یہ دور مباحثوں، معرکوں، تبدیلیوں اور بساط ادب کے الٹ جانے کے واقعات سے پُر ہے۔ آزادی کے فوراً بعد یعنی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء تک ہمارا معاشرہ جس عبوری دور سے گذرا اس کا اظہار اس دور کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کوئی سیاسی یا سماجی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئی یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن ادب میں ایک نئی تبدیلی لانے میں اس تحریک کو ضرور کامیابی ملی۔ اس تحریک نے پورا ادبی منظر نامہ ہی بدل دیا بلکہ اس نے بنیادی فکر اور اپروچ کو متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک جو آزادی سے پہلے نوجوان نسل کے خوابوں کی تعبیر تھی، اس نے آزادی کے بعد اختلافات کے باوجود جس بنیادی فکر پر زور دیا وہ زندگی کا خوبصورت اور پر مسرت تصور، فکر و فن کی آزادی، امن اور بقائے باہم کا جذبہ تھا، جو نہ صرف اس وقت اہم تھا بلکہ آج بھی اہم ہے۔

اگر ہم آزادی کے بعد کی اردو شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو ۱۹۶۰ء کے بعد نظم میں بدلے ہوئے انداز فکر اور اسی کے ساتھ نئے طرز اظہار کی پرچھائیاں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ صنعتی دور کا آغاز ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ اس کے اثرات عام زندگی پر نظر آنے لگے تھے اس لئے ہماری نظموں میں بھی اس دور کی بازگشت دکھائی دیتی ہے۔ اس یکسر بدلی ہوئی صورت حال کا اظہار بندھی ٹکی ہیئتوں اور صدیوں سے مستعمل الفاظ، استعاروں، کنایوں اور تشبیہوں کی مدد سے ممکن نہیں تھا، اس لئے نئی زبان نئے

استعاروں اور علامتوں کا سہارا لیا گیا۔ طے شدہ موضوعات کی جگہ نئے موضوعات نے لے لی اور نظموں میں شخصی طرز احساس اور منفرد نقطۂ نظر راہ پانے لگے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''اس دور میں جو رجحان ابھر کر سامنے آیا وہ نظم میں شخصی احساس اور انفرادی زاویہ نظر پر اصرار کا ہے۔ طے شدہ موضوعات' طے شدہ نقطۂ نظر' طے شدہ نتائج تک پہنچنے کی پابندی' طے شدہ فنی طریقوں یا اسالیب سے وفاداری' ان سب کی نفی اور ان سے انحراف اور انقطاع کا عمل اس دور میں ہوا۔ یہ عمل ترقی پسند اور حلقۂ ارباب ذوق والوں کے یہاں انفرادی طور پر بعض شعرا کے پاس پہلے بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا' لیکن اب اس نے اپنے دور کے غالب رجحان اور ردیے کی شکل اختیار کر لی۔''[1]

آزادی کے بعد اردو نظم کے موضوعات میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی۔ وہ جنگ جو ایک رخ پر تھی اس میں کئی نئے رخ پیدا ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دو ڈھائی سال کا عرصہ ہندوستان کی زندگی میں بڑا ہنگامی تھا۔ فسادات نے انسانی سائیکی میں ایسا خوف' عدم تحفظ کا احساس اور بے اعتباری پیدا کر دی جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اس لئے اس عرصے کی نظموں میں موضوعات کے لحاظ سے یکسانیت ضرور ہے لیکن اس بے یقینی کے دور میں ترقی پسند نظم میں رجائیت اور انسانیت کے فتحیاب ہونے کا پیغام بھی ہے۔

ترقی پسند شاعری کی بلند آہنگی اور نظریہ سازی بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے وسط تک ختم ہو گئی اور اس کے بعد اس دور کا آغاز ہوا جسے بعض لوگوں نے نئی ترقی پسندی کا نام دیا۔ جہاں بلند آہنگی اور راست بیانی ایک نرم اور سبک دھارے میں تبدیل ہو گئی۔ یہ تبدیلی ترقی پسند شعرا کی پہلی نسل اور بعد کی نسل دونوں کے یہاں نمایاں ہے۔ علی سردار جعفری' فیض' اختر الایمان' فراق' مجاز' ن م راشد' مخدوم' شمیم کرہانی' غلام ربانی تاباں' ساغر نظامی' اور رفعت سروش' سلام مچھلی شہری' راہی معصوم رضا' قتیل شفائی' اور اس میں ان کے بعد کے دوسرے شعراء بھی شامل ہیں۔

ان شعرا کے علاوہ باقر مہدی' راہی معصوم رضا' نریش کمار شاد' حسن نعیم' شاذ تمکنت'

مغنی تبسم، مظہر امام، ظفر گورکھپوری، زہرہ نگار، رفعت سروش، زاہدہ زیدی، اجمل اجملی، ان شعرا میں ہیں جنھوں نے ترقی پسندی سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ گوپال متل، خلیل الرحمن اعظمی، عمیق حنفی، وحید اختر وغیرہ کچھ دور چل کر نظریاتی اختلافات کی بنا پر علیحدہ ہو گئے۔ جہاں تک ترقی پسند فکر کا تعلق ہے، ان کی شاعری میں احساس جمال کے ساتھ جو عصری حسیت ہے، اسے ترقی پسند فکر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بعض شعرا کا شمار جدیدیت کے رجحان کو فروغ دینے والوں میں ہوتا ہے لیکن میرا مقصد انہیں گروہوں میں تقسیم کرنا نہیں ہے بلکہ ترقی پسند فکر اور اس کے اثرات کی نشاندہی ہے۔ یہ شعرا کسی نظریاتی وابستگی کے قائل ہوں یا نہیں، لیکن ان کی شاعری نے ترقی پسند فکر سے توانائی حاصل کی ہے اور وہیں سے اپنی انفرادی راہیں بھی تلاش کی ہیں۔

اردو ادب میں ۱۹۶۰ء کے بعد جو رجحان غالب رہا وہ جدیدیت کا رجحان ہے۔ اردو میں جدیدیت کا رجحان بھی دوسرے رجحانات کی طرح مغرب کے زیر اثر آیا۔ اردو ادب میں جب ترقی پسند تحریک کے تحت سماجی عوامل، تاریخی حسیت، مقصدیت، کمٹمنٹ اور اس طرح کے دوسرے خیالات کا شور و غلغلہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اسے اشتہار بازی کے نام سے نوازا جانے لگا۔ اور اس کا شدید ردعمل ''جدیدیت'' کی شکل میں سامنے آیا۔ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر فروغ پانے والے اس جدیدیت کے رجحان کو بعض طبقے نے ترقی پسندی کی توسیع قرار دیا۔

۱۹۸۰ء کے بعد کے دور کو Post-Modernism یعنی مابعد جدید کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ ۱۹۸۶ء کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر جب جدیدیت کا رجحان پنپنے لگا تو عام طور پر ادیبوں نے اس کا استقبال کیا۔ لیکن جب یہی جدیدیت غلو اور اغراق کی حد کو پہنچ گئی اور نظمیں آڑی ترچھی اور ٹیڑھی میڑھی لکیروں سے عبارت ہو گئیں تو فطری طور پر اس کا ردعمل شروع ہوا۔ خود جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''جدیدیت کوئی مذہب نہیں، کوئی الہامی فلسفہ نہیں جس سے انحراف کفر ہو

لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ ابھی تک تو جدیدیت سے انحراف کی کوئی شکل سامنے نہیں آئی۔۔۔۔۔۔ایک دن وہ بھی ہوگا جب جدیدیت اپنا کام اچھا برا کر چکے گی۔ کوئی اور نظریہ ادب اس کی جگہ لے گا۔ میں اس دن کا منتظر ہوں۔'' ۲ے

اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ نے اسے فطرت کا ایک عام اصول گردانا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ترقی پسند جب ادعائیت اور Establishment کے درجے کو پہنچ گئی تو جدیدیت نے باغیانہ کردار ادا کیا۔ پھر جدیدیت بھی ادعائیت اور Establishment کے درجے کو پہنچ گئی تو مابعد جدید فکر نے اس کی کوتاہیوں کو آشکارہ کیا۔ ردوقبول اور اقرار واختلاف کا یہ سلسلہ ادب میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔'' ۳ے

۱۹۸۵ء تک جدیدیت کا طوفان تھم چکا تھا اور اردو شاعری کی زمین کے ایک بار پھر زرخیز ہو جانے کی وجہ سے ایک نئی نسل اپنی شناخت قائم کر رہی تھی۔ اس نئی نسل کے یہاں ترقی پسند شعری فکر، نئی تازگی، نئے استعارے، نئی علامت کے ساتھ ایک نئی روایت اردو شاعری کو دے رہی تھی جس میں فکر اور تخلیقی آزادی بھی تھی، اپنی تہذیبی قدروں سے وابستگی کا احساس اور لفظ و معانی کا نیا ادراک بھی۔ ان میں وہ شاعرات بھی ہیں جو نئی فکر اور ایسے مسائل لے کر سامنے آئیں جن مسائل سے اردو اس طرح آشنا ہی نہیں تھی۔ اس عہد میں بعض سیاسی حالات کے تحت علامتوں کے پردے میں گفتگو کا فن بھی ابھرا۔ غرض اس زمانے نے ترقی پسند فکر کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ان شعرا میں شہریار، شہاب جعفری، ندا فاضلی، بلراج کومل، پروین شاکر، زبیر رضوی، حسن عابد، عشرت آفرین، راج نارائن راز، صادق، نامی انصاری، بلقیس ظفیر الحسن، کمار پاشی، شاہد ماہلی، کشور ناہید، جون ایلیا، شجاع خاور اور اس طرح کے بہت سے لوگوں کے نام ہیں جن کے یہاں استعاروں کی معنویت، پیکر تراشی اور علامتوں کی تہہ داری کا مطالعہ کریں اور زبان کے کھردرے پن اور حقیقت کی تلخی کو

دیکھیں تو ایک نیا جہان فکر و معنیٰ صاف نظر آئے گا۔ ان شعرا نے غزل اور نظم دونوں میں اپنی فکر کے جوہر دکھائے ہیں۔

اس عہد میں ترقی پسند شاعری میں ایک اور موضوع جسے بہت زیادہ اہمیت ملی وہ ہجرت اور بے گھری کا موضوع تھا۔ جہاں تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) اور انتزاع مشرقی پاکستان اور قیام بنگلہ دیش (۱۹۷۱ء) کے نتیجے میں انتقال آبادی کی شکل میں رونما ہوا وہیں زندگی گزارنے کے بہتر مواقع کی تلاش میں یورپ، شمالی امریکہ، کینیڈا اور عرب ممالک میں قسمت آزمائی کے لئے ہجرت کے سلسلے میں سامنے آیا۔ ان ہجرتوں نے بہت سے نئے معاشرتی مسائل پیدا کئے جن میں اپنی زبان و تہذیب سے دور ہونے کا غم بھی تھا اور وہاں پرورش پانے والی نئی نسل کے تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل بھی تھے۔ اس طرح اس زمانے میں شاعری میں ایک نیا کرب ابھر کر سامنے آیا۔ ان میں وہ تمام شاعر شامل ہیں جو سکون اور فارغ البالی کی نئی دنیاؤں کی تلاش میں گھر سے بے گھر ہوئے جن میں خاص طور پر افتخار عارف، اشفاق حسین، ساقی فاروقی، خالد سہیل، عابد جعفری و باقر نقوی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد کے دیگر اہم شعرا میں شاہد کلیم، پرتپال سنگھ بیتاب، بلقیس ظفیر الحسن، عنبر بہرائچی، فرحت احساس، عبدالاحد ساز، مصحف اقبال توصیفی، سرشار بلند شہری، شاہد عزیز، رؤف خلش، غیاث متین وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان شعرا نے جدیدیت کے انتہاپسندانہ دور کے اثرات سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اپنے انداز میں نظمیں کہی ہیں۔

۱۹۹۰ء کے بعد جن شعرا کی نظموں نے متوجہ کیا ان میں جینت پرمار، نعمان شوق، ریاض لطیف، شکیل اعظمی، سلیم انصاری، عطاالرحمٰن طارق، سلیم محی الدین، جاوید ندیم، فرحان حنیف وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اس درمیان ایک نیا موضوع جو ترقی پسند فکر کا حصہ بنا وہ عورتوں کے مسائل تھے۔ ترقی پسند شاعری کے زیر اثر نہ صرف یہ کہ بڑی تعداد میں شعر کہنے والی خواتین سامنے آئیں بلکہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ایسے مسائل اور ایسے سوالات اٹھائے جو اردو شاعری میں اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھائے گئے تھے۔ ان سوالات میں سب سے بڑا سوال Male

dominated society میں عورت کے اپنے ان حقوق کا تھا اور دوسرا مرد کی بالادستی اوراس کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف احتجاج کا۔ان شاعرات نے اس احتجاج کے ساتھ اردو شاعری کوایک نئی زبان اور فکر عطا کی۔ان کی شاعری کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے جو کہ عام شعرا سے مختلف بھی دکھائی دیتا ہے۔اس سلسلے میں خاص طور پر زہرہ نگاہ' ادا جعفری' پروین شاکر' کشور ناہید' نسیم سید' حمیرا رحمٰن' بلقیس ظفیر الحسن' ساجدہ زیدی' زاہدہ زیدی' فہمیدہ ریاض' پروین فنا سید' عشرت آفرین' ثمینہ راجا' نزہت صدیقی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

آزادی کے بعد اردو نظم میں موضوع کے اعتبار سے جو تنوع آیا ہے اور جو نئے ابعاد پیدا ہوئے ہیں ان سے ایک پر اعتماد شاعری کا دور شروع ہوا۔ان نظموں اور غزلوں میں ایک بات جو خصوصیت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جنس کے اعتبار سے عورت اور مرد صرف عاشق و معشوق' قاتل و جفاجو' بے وفا و ستم گر' نہیں رہے بلکہ ایک دوسرے کے دوست اور ہم سفر کی شکل میں سامنے آئے۔ان میں ہجر و وصال کی ایک نئی کیفیت' شکوہ کا ایک نیا انداز' اپنے جذباتی سماجی اور معاشرتی حقوق کا ایک نیا احساس ملتا ہے جو روایتی سماجی قدروں کے بجائے ایک نئی عصری حسیت اور عزت نفس کو ظاہر کرتا ہے۔اس کے علاوہ نئے سائنسی تجربات' گلوبلائزیشن' عالمی سیاسی صورت حال' عالمی طاقتوں کی بالادستی اور صارفیت کے فروغ سے پیدا ہونے والے حالات نے موضوع' اسلوب اور زبان و بیان کے رویوں کو متاثر بھی کیا اور پیچیدہ بھی بنایا۔

مابعد جدیدیت کی نئی فکر و دانش' نئی لفظیات اور نئے تہذیبی رویے وغیرہ واضح اور نمایاں ہیں۔موجودہ دور میں مغرب اور مشرق کے درمیان کشمکش جاری ہے۔مغربی معاشرے کے اثرات ہمارے معاشرے پر تیزی سے اثر انداز ہوتے جارہے ہیں۔خیر و شر کے درمیان تصادم جاری ہے۔صدیاں لمحوں میں تبدیل ہوتی جارہی ہیں۔زندگی میں موت کا خوف چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔کب اور کون سی جنگ کون سی صورت اختیار کرلے' کچھ معلوم نہیں۔مابعد جدیدیت کے شعرا ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے معروف و مروجہ موضوعات

اور فنی لوازمات سے استفادہ بھی کر رہے ہیں اور نئے رویوں کا اظہار بھی ہے۔

نئی عالمی صورت حال نے الیکٹرانک میڈیا' صارفیت' بین الاقوامیت اور انفارمیشن ایکسپلوزن کی زائیدہ ہے' جس نے دنیا کو ایک گلوبل ویلیج میں تبدیل کر دیا ہے اور نئے فکری اور تہذیبی رویوں' چیلینجوں اور خطروں کو جنم دیا ہے نیز ادبی تصورات کو متغیر بھی کیا ہے۔ ان شعرا میں جینت پرمار' شاہد عزیز' ساجد حمید' شاہد کلیم' حنیف ترین' چندر بھان خیال فرحت احساس' عبدالاحد ساز' پرتپال سنگھ بیتاب' خالد سعید' شائستہ یوسف' شبنم عشائی' عزیز پریہار' شکیل اعظمی' ریاض لطیف' راشد انور راشد' عادل حیات وغیرہ نے اپنی شعری شناخت کی روشن مثالیں پیش کی ہیں۔

آزادی کے بعد نظم کے منظر نامے میں موضوعات میں تنوع اور وسعت اور لہجوں اور اسلوب میں نیاپن اور رنگا رنگی پیدا ہوئی۔ پابند' معرا اور آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم بھی لکھی جا رہی ہے۔

اس مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں جدیدیت کا آغاز سنہ ۵۵ کے بعد ہوتا ہے گو اس کے لئے ن م راشد' میرا جی' اختر الایمان' مجید امجد وغیرہ پہلے ہی فضا ہموار کر چکے تھے لیکن بعد میں آنے والے شعرا نے ان سے اثر قبول کرنے کے باوجود اپنی الگ راہ نکالی۔ ۵۷ سے ۶۰ تک اور ۶۰ سے موجودہ دور تک جدید نظم نے مختلف مراحل طے کئے اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔

❁ ❁ ❁

دورِ جدیت

(۱۹۶۰ء کے بعد)

خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۹۲۷ء): اختر الایمان اور ناصر کاظمی کو آزادی کے بعد کی نئی شاعری کا ٹرینڈ سیٹر مانا جاتا ہے۔ خلیل الرحمٰن کی شاعری نئی ہونے کے باوجود سو فیصدی سماجی سروکار کی شاعری مانی جاتی ہے۔ ان سروکاروں کا رشتہ اعلیٰ انسانی اقدار سے ملتا ہے جو ماضی اور حال سے زیادہ مستقبل کا اشاریہ ہے۔

خلیل الرحمٰن نے مشرقی یوپی کے دیہی ماحول میں اپنی زندگی کا سفر شروع کیا۔ علم اور تجربات کی مختلف منزلوں کو طئے کرتے ہوئے وہ علی گڑھ پہنچے۔ ادب کے بہترین ناقد کے ساتھ ساتھ ان کا شمار ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے جن کے اسلوب سے جدید نظم اور غزل کو اپنی ابتدائی منزل میسر آ گئی۔

ان کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے وطن کی مٹی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا دیہی مناظر دکھائی دیتے ہیں جو ان کے بچپن کے ساتھ ساتھ پیچھے چھوٹ گئے۔ وہ اپنے مجموعہ کلام ''آسماں اے آسماں'' میں خود فرماتے ہیں:

> ''انسان اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے چاہے جہاں بھی رہے۔ لیکن رہتا ہے اپنے وطن میں۔ وطن کی مٹی پہچاننے میں صرف اس کو آسانی ہی نہیں ہوتی بلکہ لذت بھی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی بھی سماں پلکوں کے نیچے دھوم مچا سکتا ہے۔ ہر ایک اپنے وطن کو اور وطن اس کو مبارک ہوتا ہے۔ جانی پہچانی راہوں کی دھول چاہے جتنی بار روندی جائے لیکن پیروں سے لپٹی رہتی

ہے۔ سارے جہاں کے اتنے بڑے پھیلے ہوئے رقبے کا یہ چھوٹا سا حصہ
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بڑے جسم کا مختصر سا دل۔'' ۴۴

خلیل الرحمٰن نے ایک باغ لگوایا تھا جس میں مختلف پھولوں کے پودے تھے۔ مثلاً ہار سنگھار' موتیا' بیلے' گیندے' گلاب وغیرہ۔ اس باغ کی یاد کو خلیل صاحب اپنے اشعار میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

کچھ دنوں گاؤں کی گلیوں میں اداسی ہوگی
کچھ دنوں کھل نہ سکے ہونگے مرے ہار سنگھار
کچھ دنوں کے لئے سنسان سا لگتا ہوگا
آم کے باغ میں بے چین پھری ہوگی بہار ۴۵

ان کے مجموعہ کلام ''آسماں اے آسماں'' کی نظمیں شام اودھ' کنج محبت' سایۂ دیوار' تسلسل وغیرہ منظر نگاری کے باب میں اضافہ کرتی ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ: اردو نظم نگاروں میں بلا شبہ اپنے اسلوب موضوعات' اپنی لفظیات نیز اپنے لہجے کے اعتبار سے ممتاز اور منفرد ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی روایات سے اپنے رشتے کو مستحکم کیا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام آفاق نو' کرن کرن' یاداشت اور سلسلہ مکالمات وغیرہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری مذہب' اساطیر' معتقدات' روحانیت' تصوف' روایات' تاریخ اور معاشرت کے حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ ان کے مطالعہ میں وسعت ہے لہٰذا ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے قاری کو بھی اس مطالعے سے گذرنا پڑے گا۔ ان کی شاعری فکر انگیز ہے۔ زمانے کی ٹیڑھی چال' استحصال' زبوں حالی' ابتری اور بحرانی کیفیت کی فاطمہ شعریٰ نے اپنی نظموں میں بہترین ترجمانی کی ہے۔

شعریٰ نے اپنے بیشتر ہم عصر شاعروں کے مقابلے سبک رفتاری کے ساتھ ہی سہی لیکن واضح اور زیادہ توانا انداز میں ارتقائی منزل طے کی ہے۔ ان کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ

انہوں نے اپنے آپ کو جدیدیت کے عام دھارے میں سمونے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں دوسرے ممتاز شعرا مثلاً قاضی سلیم احمد، بلراج کومل، محمد علوی، شہریار، کمار پاشی اور ندا فاضلی وغیرہ کی نظموں کی طرح عام قاری کی سطح پر زیادہ مشہور نہیں ہوئیں لیکن ان کی نظمیں بلاشبہ برگد کی پارنیوں کی طرح جدیدیت کی زمین کے اندر پھیلتی اور جڑ پکڑتی رہیں۔

شعریٰ کی ابتدائی شاعری غیر معمولی حد تک غنائی اور داخلی ہے۔ نسوانی اور نو بلوغت کے دور سے تعلق رہنے والے ایسے شدید جذبات جو آج بھی کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر جیسی پاکستانی شاعرات کی بہت سی نظموں کا طرۂ امتیاز

بنے ہوئے ہیں، جدید شاعری میں سب سے پہلے شعریٰ کے توسط سے داخل ہوئی ہیں۔ ان کی ایک نظم ''صدا بہ صحرا'' جہاں ان کے کلام کی غنائی کیفیت کی ترجمان ہے وہیں منظر نگاری کے وصف سے بھی مزین ہے۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے ؎

سکھی پھر آ گئی رت جھولنے کی گنگنانے کی
سیہ آنکھوں کی تہہ میں بجلیوں کے ڈوب جانے کی
گگن میں رنگ آنچل میں دھنک کے مسکرانے کی
امنگوں کے سبو سے قطرہ قطرہ مئے ٹپکنے کی
گھنیرے گیسوؤں میں ادھ کھلی کلیاں سجانے کی [6]

مندرجہ بالا بند میں جدید شاعری کے مشہور و معروف تکنیکی اور فنی عناصر یعنی علامتوں، استعاروں اور امیجری کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو کہ شعریٰ کا خاصہ ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ نے 'صدا بہ صحرا' سے لے کر سلاست و سبو چہ ترا ساقیا' بازگشت' افتاد گاہیں نجوم کی' زرِل میٹھے پانی کی تلاش' فدائیت نمود خواب' اور نگاہ آرتی تک جو طویل شعری سفر طے کیا ہے نیز جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی ان کا شعری اسلوب پیچیدہ ہوتا گیا لیکن ان کی منکسر المزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

شعریٰ کی شاعری کے تین مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ آفاق نوا، کرن کرن،

یادداشت، گلۂ صفورہ اور سلسلہ مکالمات۔ ان کا مشاہدہ کافی گہرا ہے اور انہوں نے مبہم علامتیں کافی استعمال کی ہیں جنھیں سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ نے نعتیں بھی کہی ہیں۔ ایک نعت کا یہ حصّہ دیکھئے جس میں صفات احمد کی بالکل نئی جہات نئی طرح نظم ہوئی ہیں۔ مثال درج کی جاتی ہے ۔

یتیم کی ہنسی، اسیر کی رہائی
پھول کی شگفتگی،
کھلی فضاؤں میں طیور کی اڑان ۔۔انہیں پسند
درندوں کی نگاہوں کے
شراروں سے بھرے
گھنے بنوں میں راستے تراشتے
مچانیں باندھتے جوان۔۔۔انہیں پسند ؎

ان کے مجموعہ کلام ''گلۂ صفورہ'' (۱۹۶۵ء) کی ایک نظم 'اسیر' ہے جو نہایت خوبصورت اور نسائیت کے احساس سے بھرپور ہے۔ کچھ بند ملاحظہ ہوں ۔

افق کے زرد کہرے میں کہستاں ڈوبا ڈوبا ہے
پکھیرو کنج میں جھنکار کو اپنی سموتے ہیں
تلاطم گھاس کے بن کا تھما' تارے درختوں کی
گھنی شاخوں کے آویزوں میں موتی سا پروتے ہیں ۸

مندرجہ بالا بند میں ڈھلتی ہوئی شام کے خوبصورت منظر کو پیش کیا گیا ہے جو کہ گہری ساخت کے ساتھ بیانیہ عنصر بھی رکھتا ہے۔

محمد علوی: اپنے عہد کے نمائندہ شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا امتیاز ان کے شعری رویے کی سادگی ہے۔ یہ سادگی ان کی نظموں میں بھی ہے اور غزلوں میں بھی ہے۔ مشکل سے مشکل خیال، پیچیدہ سے پیچیدہ تجربہ' سب محمد علوی کے شعری رویے میں آنے

کے بعد پانی کی طرح سیال ہو جاتے ہیں۔لفظوں کی سادہ بیانی، مشکل سے مشکل تصویر کو سہج بنا دیتی ہے۔محمد علوی کی نظموں کا مطالعہ قاری کو بتا دیتا ہے کہ انہیں نظم کو پیش کرنے کا ہنر معلوم ہے۔مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ پیشکش کسی پیٹرن یا فارمولے کو وضع نہیں کرتی ہر نظم کا موضوع خیال ہی اس پیٹرن کو خلق کرتا ہے۔ان کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ محمد علوی کیفیات کے شاعر ہیں۔ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں منظر نگاری کے نمونے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ان کی ایک نظم ''ایک رات بارش کی'' کے کچھ بند درج کئے جاتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے ؎

آدھی رات

ہوا کا زور

ٹین کی چھت پر

بارش کے قطروں کا شور

گھر کے اندر

گم سم سی

باہر کتے بھونکتے ہیں!!9

مندرجہ بالا بند بارش کی رات کا نقشہ پیش کرتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی نظمیں ہوا سرد ہے، ریت، سورج، ایک منظر وغیرہ میں بھی منظر نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔محمد علوی کو ان کی مختصر نظموں کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔

ساجدہ زیدی (پ:۱۹۲۷ء): کا شمار جدید عہد کی ان نمائندہ شاعرات میں ہوتا ہے جنہوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکوں، فارمولوں اور نعروں کے زیر سایہ شاعری نہیں کی۔انہوں نے ہمیشہ خود کو ادبی گروہ بندیوں سے آزاد رکھا۔ان کی شاعرانہ حیثیت کی اصل نمائندہ ان کی تخلیقات ہیں۔

ساجدہ زیدی نے بی ایڈ اور ایم ایڈ کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی نیز ایم

فل لندن سے کیا۔ انہوں نے درس و تدریس کو اپنا پیشہ بنایا اور کئی اہم تعلیمی و تدریسی اداروں کی اعزازی رکنیت سے سرفراز کی گئیں۔ ساجدہ زیدی کی نظموں میں ترقی پسندی کی شدید خارجیت اور جدیدیت کی پیچیدہ داخلیت نہیں دکھائی دیتی ہے بلکہ دونوں کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس امتزاج نے ان کی شعری زبان میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کا ایک طلسمی سلسلہ قائم کر دیا ہے جس سے ان کی منفرد آواز کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان کی آواز میں پانی کا سا بہاؤ، آبشاروں کا سا ترنم، کہکشاں کی سی رنگا رنگی اور دل کو موہ لینے کی ساری ادائیں موجود ہیں۔

ساجدہ زیدی کی شعری اور نثری تخلیقات پینتالیس سال کے عرصے پر محیط ہیں۔ چار شعری مجموعے جوئے نغمہ، آتش سیّال، سیل وجود اور آتش زیر پا نیز ایک شعری ڈرامہ تنقید اور تراجم بھی شامل ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی چار ضخیم کتابیں اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔

ساجدہ نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن بیشتر شاعری آزاد نظم میں کی ہے۔ ان کی شاعری کلاسیکیت، جدید طرز فکر اور پراسراریت کا سنگم ہے۔ فطرت اور اس کے مظاہر، اور ان کے پس پردہ قادر مطلق کی کارفرمائی کا احساس، فطرت اور انسان کے درمیان گہرے اور پراسرار رشتے کی آگہی، ان کے تخلیقی وجدان کا حصہ ہیں۔

ان کی شاعری کے بیشتر استعارے و علامات فطرت سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً آسمان، سمندر، بحر، دریا، چاند، تارے، سورج، صحرا، دشت، کوہسار، وادی، آبشار، آتش، دھواں وغیرہ وہ استعارے ہیں جن سے انسانی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ فطرت سے اخذ کردہ ان استعارات سے ساجدہ نے ترکیب سازی کا کام بھی لیا ہے۔

ساجدہ کی شاعری تلاش ذات اور انکشاف ذات کا ایسا سفر ہے جس کی حدیں عرفان کائنات سے جا ملتی ہیں۔ ان کی طویل نظم ''یوم حساب'' کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

کئی صحرا مرے گام تمنا کے شناسا تھے

وہ حرف و موت کی وادی

وہ ذوق شعر کا جادو
وہ عرفاں کے گریزاں آستانوں پہ جبیں سائی
وہ دانش کی پذیرائی
وہ معنی کی گھنیری چھاؤں
ذہن رسا کا کشف۔۔۔وہ
اسرار کے پردے کے پیچھے
دل کی محشر خیز آوازیں
وہ غم ہائے نہانی سے فروزاں ذوق بینائی
کا ہر اک خار مغیلاں سے الجھنا
طول عرض دشت و دریا پار کر جانا
وہ ہر ذرے میں دھرتی کی صدا سننا
وہ ہر قطرے کے آئینے میں
نور حسن مطلق کا گذرنا
دل۔۔نظر۔۔۔حرف و ہنر کا ایک ہو جانا
تکلم، جستجو رفتار و غم کا مدعا پانا[10]

نظم ''یوم حساب'' کا مندرجہ بالا بند حیات کی تگ و دو کی علامت ہے۔ساجدہ نے زیادہ تر شاعری صیغہ واحد متکلم میں کی ہے۔یہ 'میں' کہیں ذاتی واردات' کہیں کائناتی اسرار' کہیں انسانی وجود اور کہیں عورت کی وجودی تقدیر کا اشاریہ ہے۔

ان کی نظموں میں جابجا کائنات قدرت کی جلوہ سامانیوں کا ذکر ملتا ہے۔اپنے مجموعے کلام '' آتش زیر پا'' پیش لفظ میں وہ کچھ اس طرح فرماتی ہیں:

''اور پھر قدرت کا یہ کاشانہ یہ حسن' یہ رفتار۔۔یہ رنگ یہ آہنگ' یہ تاروں کا کارواں' سمندروں کا تلاطم' پہاڑوں کی آسمان گیر سربلندی' چشموں کی بیتابی'۔۔سبزہ زاروں کی فیاضی' صحراؤں کی عریانی' خزاں کی تندی'۔۔ہوا

کی نرم روی' چرندو پرند کی فطری نمو' فطرت کے حسن ترتیب کے بالمقابل
انسان کی اوبر کھابر زندگی۔۔حسن ازل کی لامحدودیت۔۔۔۔۔ ہر چیز ہے
محوِ خود نمائی ہر ذرہ شہید کبریائی یہ دل بھی شہید کبریائی ہی تو ہے۔۔۔۔''[11]

ان کی نظمیں صبح صادق' سرشام' جب جیون ساگر ٹھہر گیا' یہ دنیائے وحدت' کلیاں۔۔ نیلا آسمان۔۔ زنجیریں' ایک آواز' وقت کی رہگزر' فردوس برروئے زمیں است وغیرہ فطری منظر نگاری کے حوالے سے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ان کی شاعری کے بنیادی محور فنا و بقا' عشق' محبت' غم' انسانی ذات' آگاہی ذات' تلاش ذات' آرزومندی' انسان کی ازلی تنہائی' وجود کا المیہ' انسان اور فطرت کا ازلی رشتہ' شکست وریخت کا المیہ وغیرہ رہے ہیں۔

زاہدہ زیدی: کی شخصیت دنیائے شعروادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ان کے چار شعری مجموعے زہر حیات' دھرتی کالمس' سنگ جاں اور شعلہ جاں شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی تخلیقات میں ڈرامہ' تنقید' ناول اور تراجم بھی شامل ہیں انگریزی میں بھی ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

زاہدہ نے اردو' فارسی' انگریزی نیز مغربی شعروادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ان کی شاعری میں جدید حسیّت اور اپنے دور کے مسائل سے آگاہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زاہدہ کی بیشتر شاعری نظم آزاد کے فارم میں ہے۔ایک مثال ان کے مجموعہ کلام 'دھرتی کالمس' کی نظم ''تحت الثریٰ'' کے چند بندوں کے ذریعہ دی جاسکتی ہے ۔

نیچے اتروں۔۔۔
ابھی کچھ اور۔۔۔
مگر آہ اندھیرا ہے بہت۔۔۔
نہ زمیں زیر قدم
اور نہ روزن کوئی
زینہ نہ چٹان

جس کو ہاتھوں سے ٹٹولوں تو

کوئی سمت ملے

مگر اتروں ابھی کچھ اور

کہ شاید کہیں تھک جائیں قدم

ایسی دھرتی پہ جہاں

نیم تاریک سے ساحل کے قریب

مرتعش موج پہ بے باک کرن رقص کناں ۱۲

مندرجہ بالا بند میں تاریک گہرائیوں کا یہ سفر لاشعور کی عمیق گہرائیوں کا استعارہ ہے۔ یہاں جس دھرتی پر شاعر کے قدم ٹکے ہوئے ہیں وہ نیم تاریک ہے لیکن مرتعش موج پر بیباک کرن کا رقص تخلیق کی پہلی کرن پھوٹنے کا مژدہ سنا رہا ہے۔

زاہدہ زیدی کی ایک نظم ''شام تنہائی'' ہے جو ان کی منظر نگاری کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔اس کے کچھ بند ملاحظہ ہوں ؎

وہی مانوس منظر ہے

وہی دم ساز تنہائی

نہ جانے کتنی واماندہ امیدوں

کے سلگتے داغ

سینے میں چھپا کر

پھر یہ شام آئی

شفق کے شعلہ رخ جلووں کو

ڈستی جارہی ہے

بے بصر تاریکیوں کی تہہ بہ تہہ لہریں

فلک ہر ماہ نو

اک سرمئی بادل کی ہلکی سی ردا اوڑھے

خود اپنے نور سے عاری
پشیماں ہے ہراساں ہے
ہوا ساکت۔ فضا محشر بداماں ہے۔۔
خموشی کے سمندر کی تہوں میں

یوں لرزتا ہے
شکست دل، شکست خواب کا بکھرا ہوا منظر
کوئی اندوہ گیں نغمہ ہو جیسے

یا رگ جاں میں
کوئی ٹوٹا ہوا نشتر۔۔
یہ میری زندگی کی شام ہے
یا شام تنہائی
ہزاروں کاوشوں کی
نا رسائی کا دہکتا بوجھ
پہلو میں دبا کر
کیوں یہ شام آئی؟ [۱۳]

زاہدہ زیدی کی نظموں میں ہوا چل رہی ہے، وہ جس کا انتظار تھا، ایک انہونی سی بات تھی، فردوس گم شدہ، سیاہ سوراخ، وغیرہ منظر نگاری کے نمونوں کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں میں منظر نگاری کے علاوہ کائنات کے اسرار کو پانے کی کوشش بھی دکھائی دیتی ہے نیز ان کے یہاں عصری آگہی کے ساتھ ساتھ ایک آفاقی وژن بھی جاری و ساری دیکھائی دیتا ہے۔ زاہدہ زیدی کے تخلیقی سروکار کے سلسلے میں وحید اختر اس طرح رقمطراز ہیں ؎

''ہر دور میں شعر انسانی شعور کا بیباک اور نڈر اظہار رہا ہے۔ زاہدہ زیدی شاعری کے اس دھارے کی ترجمان ہیں جو نقطہ بہ نقطہ، شمع بہ شمع روشنیوں کے ارتقا کا اعلانیہ ہے۔۔۔ ان کی شاعری میں مشرق کے جذبۂ خود شناسی

سے لے کر مغرب کے دل میں دھڑکنے والی انسانی ضمیر کی آوازیں لہر لہر مصرع مصرع رواں دواں ہیں۔''[۱۴]

عمیق حنفی (۱۹۲۸ء۔۱۹۸۸ء): کی پیدائش مہو چھاؤنی مدھیہ پردیش میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد سیاسیات اور تاریخ میں ایم اے کیا۔ ریڈیو میں ملازمت کرتے ہوئے ۱۹۸۷ء میں ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انکی شعری تصانیف میں ''سنگ پیراہن'' ''شب گذشت'' ''صلصلتہ الجرس'' اور ''شجر صدا'' قابل ذکر ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں ''شعر چیزے دیگر است'' اور ''شعلے کی شناخت'' شامل ہیں۔

عمیق حنفی صرف ایک شاعر نہیں بلکہ وہ ایک فلسفی، منطقی، تاریخ داں، ماہر نجوم، سنسکرت کے عالم، آرٹسٹ، پینٹر، مفکر، مبلغ اور عابد و پرہیز گار انسان تھے۔ انہوں نے شاعری کی ابتدا اس دور میں کی جب جدید اردو شاعری میں طویل نظم نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے سلسلے میں ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ۳۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں تصوف کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کی دھن سوار ہوئی اور اس کے لئے انہوں نے کافی مشقتیں اٹھائیں، کراچی اور ملتان کا سفر بھی کر آئے لیکن قدرت کو ان کی یہ تمنا پوری ہونا مقصود نہیں تھا لہٰذا وہ اپنی یہ خواہش پوری نہ کر سکے۔

عمیق حنفی کا مطالعہ شش جہتی ہے۔ ان کو نئے نئے موضوعات کو برتنے اور تجربے کرنے کی ایک ایسی للک ملتی ہے جو انہیں ہر سمت بکھری ہوئی اس حسین کائنات کو اپنے تجربے اور مشاہدے کا حصہ بنانے کو مجبور کرتی ہے۔ عمیق اپنے ہم عصروں میں اس لئے الگ تھلگ ہیں کہ وہ اپنی نظموں کو کبھی جنگل میں تو کبھی سپاٹ چٹیل میدانوں میں، کبھی پہاڑوں اور کبھی قہقہہ بردوش انجمنوں میں لئے پھرتے ہیں تو کبھی ہوا، سمندر، بادل، بارش اور شبنمی فضا میں اس لئے یہ نظمیں ایک دوسرا ہی شعری منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔

عمیق حنفی کی شعری اساس کے سلسلے میں بلراج کومل اپنے مضمون میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''عمیق حنفی کی شعری حسّیت کا مرکزی نکتہ اور محور فطرت کی طرف لوٹ جانے کی خواہش اور جنگل کی بازیافت ہے۔ لیکن وہ عصری منظرنامے کی دہشتوں کا تجربہ بھی اسی شدت کے ساتھ کرتے ہیں جس انہماک اور شدت سے وہ جنگل کی بازیافت کا تجربہ کرتے ہیں۔'' ۱۵؎

عمیق حنفی کے یہاں قدم قدم پر مندرجہ بالا منظرنامے کی تصویریں ملتی ہیں۔ عصری انسانی صورت حال کے منظرنامے کی ان گنت تصویریں عمیق حنفی کے کلام میں شروع سے آخر تک بکھری ہوئی ہیں۔ عصری زندگی کا منظرنامہ پیش کرتے وقت وہ ہر قدم پر خود شناسی کے عمل سے گذرے ہیں جن میں فطرت اور ان کے مظاہر کی طرف لوٹ جانے کی خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

فطرت کی جانب لوٹ جانے کی خواہش اور جنگل کی دریافت عمیق حنفی کی شعری حسّیت کا مرکزی نکتہ رہی ہے۔ وہ جنگل کو کبھی کبھی گوشۂ عافیت کے طور پر اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں لیکن اصل جنگل ان کے دائرہ فکر میں سانس لیتا ہوا جنگل ہے۔ ان کی نظم ''جنگل ایک ہشت پہلو تصویر'' کے چند بند درج کئے جاتے ہیں ؎

وہ کھجوروں کے درختوں کی قطار اندر قطار
ایک دم سیدھی کھڑی سمبندھ ریکھائیں زمین وآسماں کے درمیاں
آسمانی شامیانہ ان ستونوں کے سروں کو چھوڑ کر
بے ستوں گنبد سا خود لٹکا ہوا
آم کی ڈالوں پر چکنے سبز پتے
سبز پتوں پر لٹکتی کیریاں
رنگ، رس اور اور سواد کے خوابوں کے تعبیروں کے انکھوئے کھل گئے
سبز پیلا، سبز بھورا، سبز کالا، سبز زرّیں، سبز نیلا
سبز سبز، سبز سبز
سبز غالب رنگ کتنی جوڑیوں کے ساتھ ہے پھیلا ہوا

سبز غالب رنگ باقی گویا اس کے شیڈ

راس منڈل میں کنہیا سبز باقی رنگ اس کی گوپیاں

تیز بے حد تیز بے دم ہانپتی موج ہوا کی لئے

تیز بے حد تیز لیکن نغمہ ریز

جھومتا گاتا تھرکتا ناچتا ماحول

ایک لے میں رقص کرتے ہیں فضا، دیہات، جنگل، کھیت

رقص میں ہے موج رنگ

موج میں آواز

اور پھر آواز میں خوشبو کا رقص

سب کے سب ایک لے کے دائرے میں ہم نوا ہم رقص باہم ایک ا [16]

مندرجہ بالا بندوں میں شاعر نے جنگل کی طرف لوٹ جانے کی فطری خواہش کا اظہار کیا ہے جو کے شاعر کی حسّیت کا مرکزی نقطہ ہے۔ لیکن وہ عصری منظر نامے کی دہشتوں کا تجربہ بھی اسی شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

عمیق حنفی کی بنیادی و مرکزی وابستگی غالباً زندگی کے ان مناظر سے ہے جو تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے، اپنے خداداد حسن سے منور ہیں، اپنی اوّلین خوشبو سے سرشار ہیں اور اپنے اندر ان فطری عناصر کی قوت محسوس کرتے ہیں۔ عمیق حنفی نے ''سیارگاں'' جیسی فکر انگیز نظم لکھی اور پوری کائنات میں انسانی وجود کے مرئی اور غیر مرئی تلازموں کو پرت پرت کھولنے کا جتن کیا۔ ایک بند ملاحظہ ہو ۔

آفتاب عز و جل

میری آمد کی سحر

میرے جنم سے دو گھڑی اور پانچ پل پہلے

سرد اور بھیگی زمیں سے اوس چننے کے لئے

جب گلابی انگلیوں سے اس کو چھونا چاہتا تھا

کانپ اٹھا خود گرفتار بلا تھا آفتاب

راس منڈل کے دوراہے پر تذبذب کا رتراز و تھام کر تھا مبتلائے

پیچ وتاب

سرد لہروں اور شبنم کی ڈھٹائی پر خفا

بے بس و مجبور نادم اور خجل

اپنا غصہ' اپنی خفّت' اپنی جھنجھلاہٹ مرے سر میں

انڈیلے جارہا تھا [۱۷]

مندرجہ بالا بند سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے عہد کے تخلیقی اذہان میں عمیق حنفی کے یہاں جذب کرنے کی اور اس جذب کئے ہوئے کو پھر دوبارہ اتنی ہی حرارت اور شدت کے ساتھ تخلیقی صورتوں میں منتقل کر دینے کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ ایک بار اگر ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا ابال آ گیا تو پھر کیا ہے' آسمان' ستارے' چاند اور سورج کا سارا حسب نسب عمیق حنفی کے حافظے اور مطالعے کی مٹھی میں بند ہو گیا۔

عمیق حنفی کی بنیادی شناخت ان کی طویل نظموں کے سیاق وسباق میں موجود ہے۔ ان کی نظمیں شجر صدا' سیارگاں' جنگل ایک ہشت پہلو تصویر اور صوت الناقوس وغیرہ جدید شاعری اور جدید نظم نگاری کے عبوری دور میں اپنا انفرادی مقام رکھتی ہیں۔

عمیق حنفی جس دور کے نمائندہ شاعر ہیں اس کے سلسلے میں بلراج کومل اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

''عمیق حنفی جس تہذیبی معاشرتی منظرنامے کے شاہد ہیں وہ اس طرح ہے۔ جانی پہچانی اقدار کا انہدام' سچے ایمان کی موت' نصب العین کا فقدان' میکانیکیت اور آٹو میشن کی یلغار' احساسات' جذبات اور محسوسات کی تذلیل اور پراگندگی' تصنع اور بناوٹ' فطرت سے دوری' علم و دانش کی غیر دانشورانہ جہت اور ان کا غیر دانشورانہ استعمال' خوف و ہراس' ظلم و تشدد' دہشت اور بربریت کی یورش' جذباتی و فکری کھوکھلا پن و بنجر پن' حسن فطرت کی بازیافت' جنگل کی تلاش۔'' [۱۸]

مظہر امام (۲۰۱۲ء): کا شمار عہد جدید کے چند معتبر اور اور نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی شعر گوئی کے منفرد انداز اور رنگ و آہنگ کی بدولت اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں زخم تمنا' رشتہ گونگے سفر کا اور پچھلے موسم کا پھول بطور خاص ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعی مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ان مجموعوں کی اشاعت کے دوران ارتقائے شعور کی مختلف منزلوں سے گزرے ہیں۔

مظہر امام نے ابتدائی دور کی شاعری پر میر' مومن' حالی' درد' اقبال' جگر' میر حسن' دیا شنکر نسیم' جوش' فیض' راشد' یوسف' اختر الایمان' منیب الرحمٰن اور فراق وغیرہ مختلف کلاسیکی اور جدید نظم نگار شعرا کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ مظہر امام کی شاعری پر ان کے ذاتی مشاہدات کے علاوہ ان کے عہد کے دو اہم ادبی رجحانات' ترقی پسندی اور جدیدیت کا خاصا اثر رہا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''زخم تمنا'' اور دوسرا ''رشتہ گونگے سفر کا'' علی الترتیب ترقی پسندی اور جدیدیت کے میلان کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مظہر امام کی جدیدیت سے اثر پذیری کسی رد عمل یا تقلیدی رویے کا نتیجہ نہیں کہی جا سکتی ہے بلکہ اسے دراصل ان کی طبیعت کا خاصہ کہی جا سکتی ہے۔ مظہر امام کا امتیازی وصف ان کے شعری اظہار میں اعتدال و توازن کی کارفرمائی ہے جو ان کے یہاں جدت و قدامت کے حسین امتزاج کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ ان کی شاعری کے اس پہلو کا بجا طور پر اعتراف کیا گیا ہے اور جدید شعرا میں اس لحاظ سے انہیں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں مختلف مقامات پر منظر نگاری کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''آنگن میں ایک شام'' کو پیش کیا جا سکتا ہے ؎

شام کی لمحہ لمحہ اترتی ہوئی دھند میں
سر جھکائے ہوئے گھر کے
خاموش آنگن میں بیٹھے ہوئے
میری واماندہ آنکھوں کی جلتی ہوئی ریت سے

اک بپھرے سمندر کی آوارہ لہریں اچانک الجھنے لگیں!
شام کی رستہ رستہ اترتی ہوئی دھند میں
اس بپھرتے سمندر کی آوارہ لہروں کو
چوری چھپے دفن کرنا پڑا[191]

بلراج کومل (۱۹۲۸ء): کا شماران شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اختر الایمان کے بعد غزل گوئی سے کنارہ کشی اختیار کر کے صنف نظم ہی کو مستقلاً اپنے تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اس میں شہرت و انفرادیت حاصل کی۔ بلراج کومل کی نظم نگاری اپنی منفرد لسانی شناخت اور داخلی تجربات کے شخصی برتاؤ کے تعلق سے ایک دلچسپ اکتشافی مطالعے کے لئے زمین ہموار کرتی ہے۔ ان کا شمار عمیق حنفی کے معاصر شعرا میں ہوتا ہے۔

بلراج کومل اردو میں نئے شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شناخت نئی نظم نگاری کے میدان میں ملکی تقسیم کے بعد قائم ہوئی۔ ان کا مزاج اور افتادِ طبع نئے دور کے تقاضوں سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اردو دنیا میں بلراج کومل کی آواز انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ میری نظمیں' پرندوں سے بھرا آسمان' سفر مدام سفر' نژاد سنگ' اور رشتۂ دل کے نام اس ضمن میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام ''پرندوں بھرا آسمان'' کے لئے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے انہیں نوازا گیا۔ ان کی اہم نظموں میں کاغذ کی ناؤ' سائے کا ناخن' کاغذی پھول' سرکس کا گھوڑا' پرندہ' ہیرو' موسم گل' میرا پوتا' وصال' سمندر میں' شاعر' میں فنکار' یہ زرد بچے' ایک آفتاب کی صدا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظم ''آخری پودا' نخلستان' ناریل کے پیڑ' سمندر' بہار کے بعد' میں شاعر میں فنکار اور' پرندہ' میں منظر نگاری کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

بلراج کومل کے مجموعہ کلام ''سفر مدام سفر'' جو کہ نظموں کا مجموعہ ہے' میں منظر نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس مجموعے کی ایک نظم ''شکار'' کے چند مصرعے درج کئے

جاتے ہیں ۔

گھنے درختوں میں شیر چیتے' مہیب ہاتھی
شریر بندر' سیہ خونخوار ریچھ اور بھیڑیے ہزاروں
گلہریاں' سانپ اور اژدر
حسین شاخوں پہ بلبلیں' فاختائیں تیتر
کہیں پہ نغمہ کہیں پہ لرزش
کہیں پہ دھیمی سی سرسراہٹ
فضا میں آویزاں گنگناہٹ [۲۰]

مندرجہ بالا مصرعوں میں شاعر نے فطرت کے مختلف افراد کا ذکر منظر نگاری کے حوالے سے کیا ہے جو ایک جنگل کے منظر کی جیتی جاگتی تصویر کشی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے منظر شکاریوں کو شکار کے دوران دیکھنے کو اکثر ملتے ہیں۔

ان کی نظمیں روح عصر کے درد و کرب' روحانی اذیت' فرد کی داخلی کیفیت' غم ذات' وغیرہ کو خاص طور پر بیان کرتی ہیں۔ وہ مغرب کے فلسفے سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ نئی شاعری کے حوالے سے اپنے موقف کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میں نے اپنی ذات کا مرثیہ کہنا بند کر دیا ہے۔ اگر میری نظمیں صرف شخص کا نغمہ' نوحہ' مرثیہ' یا قصدہ ہیں' تو وہ ایسا ہے جو جدید تہذیب کی پیداوار ہے۔ جو میرے اندر بھی اور انسانی سماج کے لاکھوں کروڑوں افراد کے اندر بھی'' [۲۱]

بلراج کومل دیگر معاصر شعرا ہی کی طرح عصر حاضر میں بڑھتی ہوئی میکانکیت' کاروباریت' اور مقابلہ آرائی کے بے چہرہ معاشرے میں انسانی اقدار کی بے حرمتی اور پامالی کے لرزہ خیز مناظر و واقعات کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے جدید اردو نظم کو لفظیات' ترکیب سازی' پیکر تراشی اور ہیئتی و لسانی ساخت کے اعتبار سے ایک بالکل نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ نظم نگاری کے تاریخی پس منظر میں ان کی آواز بالکل

منفرد اور شخصی معلوم ہوتی ہے۔

بلراج کومل کی شاعری کے بارے میں وحید اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اپنے موضوعات اور رویے کے لحاظ سے وہ ترقی پسند نقطہ نظر کی ہی توسیع کرتے ہیں لیکن ان کا طرز اظہار بالکل مختلف ہے۔ان کی نظم پر نہ تو راشد کا اثر ہے، نہ سردار جعفری کا۔آزاد نظم میں ان دو اثرات سے محفوظ رہنا بڑی چیز ہے۔''۲۲

شاذ تمکنت (۱۹۳۳ء۔۱۹۸۵ء): حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کا نام سید مصلح الدین تھا۔ابتدائی تعلیم پلی ہائی اسکول سے ہوئی۔اسکول میں تعلیم کے درمیان ہی والد کا انتقال ہو گیا اور چند سال بعد والدہ بھی ہیضہ کی وبا کا شکار ہوگئیں۔اس حادثے کا ان کی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔امتحان میں بار بار فیل ہونے لگے لیکن ان کے ماموں نے ان کو دلاسہ دیا اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے میں ان کی حوصلہ افزائی کی۔انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔بعدازاں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ان کے چار مجموعہ کلام تراشیدہ (۱۹۶۶ء)، بیاض شام (۱۹۷۳ء)، نیم خواب (۱۹۷۷ء) اور دست فریاد (۱۹۹۴ء۔ بعد از مرگ) منظر عام پر آئے اور پذیرائی حاصل کی۔ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''مخدوم محی الدین۔۔ حیات اور کارنامے'' ۱۹۸۶ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

شاذ نے ابتدا میں طویل نظمیں لکھیں جیسے تراشیدہ، لذت سنگ، نیند کی وادی، اے باد خزاں کے جھونکو، آخر شب، میرا فن میری زندگی، ایک صبح، نغموں کی مسیحائی، طیور آوارہ وغیرہ۔ شاذ نے اپنی نظموں میں محبت کی جتنی کیفیات کا ذکر کیا ہے، شاید ہی کسی شاعر نے کیا ہوگا۔

شاذ نے اپنے ذہن کی کھڑکی کلاسیکی شاعری اور ترقی پسند شاعری دونوں کے لئے کھلی رکھی۔وہ میر، غالب، مومن، سودا اور مصحفی سے بھی متاثر تھے اور جوش، فراق، سردار جعفری کے

علاوہ جاں نثار اختر اور اختر الایمان سے بھی متاثر رہے۔

شاذ تمکنت ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کے منظر نامے پر ابھرے لیکن انہوں نے ایک منفرد غزل گو کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی۔ ان کی ابتدائی دور کی نظموں کی نمایاں خصوصیت مرقع نگاری ہے۔ وہ اپنے جذبات وخیالات کو حسین اور دلکش پیکروں میں ڈھال دیتے ہیں۔ پیکر تراشی کے لئے انہوں نے تشبیہہ نگاری سے خاص طور پر کام لیا ہے۔ ان کی تشبیہوں میں خارجی فطرت مختلف کیفیات' جذبات اور مشاہدات کو اپنے دامن میں سمیٹے انوکھے انداز میں جلوہ ساماں نظر آتی ہے۔ وہ منظر نگاری سے خاص فضا تعمیر کرتے ہیں جو آنے والے واقعے کا پس منظر بن جاتی ہے۔ نظم 'اے باد خزاں کے نرم جھونکو' کا یہ منظر قابل ذکر ہے۔

یہ نرم اداس رت خزاں کی / شاخوں میں ہوائیں کھوگئی ہیں / نیموں کی مہکتی ٹہنیوں سے
نمکولیاں پک کے جھڑ چکی ہیں / دہلیز خزاں پہ چپکے چپکے / پروا کے ہلورے رو رہے ہیں
برگد کے حسن بریدہ گیسو / شانے کو ترس ترس گئے ہیں / کلیوں کا مزار بن گئی ہے
شبنم کی سجل لچکتی چلمن / ہر برگ تیاگی بن چکا ہے / دکھلا گئی ہے چھب خزاں کی جوگن [۲۳]

باد صبا کی' صبح کی' بھیگی رتوں کی نظموں سے اردو شاعری بھری پڑی ہے لیکن خزاں کی اتنی مکمل تصویر کہیں نہیں ملتی۔ یوں تو شاذ کی ہر نظم منظر نگاری سے شروع ہوتی ہے اور رات کا ذکر خاص طور پر متعدد نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم ''آخر شب'' مکمل طور پر منظر نگاری پر مشتمل ہے جس میں شاذ نے بے شمار پیکر تراشے ہیں۔ نظم رات کے پچھلے پہر سے شروع ہوتی ہے اور صبح کے آغاز پر ختم ہوتی ہے۔ انیس اور جوش نے صبح کی مختلف انداز میں تصویر کشی کی ہے لیکن شاذ نے شب کا آخری پہر منتخب کیا ہے اور وہ منظر دکھایا ہے جو عام آدمی بہت کم دیکھ پاتا ہے۔ پو پھٹنے کا یہ منظر ملاحظہ ہو ۔

پو کا چھلکا ہوا شفاف لہو ہے کہ نہیں
مہکا مہکا ہوا سونے کا دھواں چھایا ہے

قسمت شرق حسیں جاگ رہی ہے شاید
میری محبوب زمیں جاگ رہی ہے شاید ۲۴

آخری مصرع میں محبوب سے مخاطبت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے کسی عاشق نے پورا منظر محبوب کے تصور میں جاگ کر دیکھا ہو۔ ان کی نظم 'خلوت' میں بھی منظر نگاری کے نمونے ہیں۔ نظم 'وعدہ' میں وہ اپنے محبوب کو جس جگہ انتظار کرنے کو کہتا ہے' ملاحظہ فرمائیں ؎

گھنیری شام جہاں دونوں وقت ملتے ہیں
شفق کے زینہ پہ تم میرا انتظار کرو

شاذ نے چاند کو مختلف انداز سے دیکھا ہے ؎

پارۂ برف طلافام کی مانند قمر
جب شفق رنگ جزیروں میں پگھل جائے
سہمی ہوئی رات کا جزیرہ
سناٹے کی چیخ سن رہا ہے
مہتاب کا دل فگار کنگرہ
خاموشی کی لو میں جل رہا ہے ۲۵

شاذ کی نظم 'آخر شب' کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

یہ سرخ چرخ دمکتا ہوا مہتاب نہیں
رات کا ناگ ہے کاڑھے ہوئے منقش کا پھن
شکریں شب یہ گل یہ رنگ یہ میٹھا کہرا
چاند کے سینے میں لو دیتا ہے سنگیت کنول
اس میں ڈوبا ہوا سرتال میں بوجھل بوجھل ۲۶

چاند کبھی ایسا نظر آتا ہے جیسے 'پارہ' 'برف طلافام' جو پگھل رہا ہے۔ مہتاب کا دل فگار کنگرہ جل رہا ہے۔ کبھی وہ رات کے ناگ کا پھن لگتا ہے اور کبھی سنگیت کے رس میں ڈوبا ہوا سرتال سے بوجھل نظر آتا ہے۔ شاذ کو پیکر تراشی میں ملکہ حاصل ہے وہ کبھی تشبیہی مرکبات سے

پیکر تراشی کرتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''شاذ تمکنت کے یہاں لمسیاتی احساس خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ نقوش کے ابھارنے میں صرف رنگوں کے امتزاج یا آوازوں کے تال میل سے ہی کام نہیں لیتے بلکہ ان کا ادراک چھو کر بھی کیا جاسکتا ہے۔ کسی جذبے یا احساس کو مجسم کر دینے سے ہم ایک سیال اور سیمابی کیفیت کو لفظوں میں اسیر کر لیتے ہیں۔ ایسے متعدد محاکات کو جو متخالف حواس کو آسودہ کریں' ایک دوسرے سے متعلق کرنا اور ان میں ایک ترتیب قائم کرنا یقیناً ایک دشوار کام ہے۔'' ۲۷

شاذ تمکنت نے اپنی ایک نظم 'یاد' میں منظر نگاری کے نمونے کچھ انوکھے ڈھنگ سے پیش کئے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے ؎

چاندنی راتوں میں پیڑوں کا گھنیرا سایہ
پو پھٹے دور سے مسجد کی اذاں کا لہرا
ڈوبتی شام چراغوں کا جل اٹھنا کم کم
بھیگے بھیگے ہوئے برسات کے گہرے بادل
نیم خوابی میں برستے ہوئے پانی کی صدا
دور میدانوں میں گم ہوتی ہوئی پگڈنڈی
لو سے تپتی ہوئی ویران کوئی راہگذر
سوکھے سوکھے ہوئے جھڑتے ہوئے پتوں کی کراہ
گھر کی دیوار پہ بیٹھی ہوئی چڑیوں کی چہک ۲۸

مندرجہ بالا نظم میں بیک وقت چاندنی رات' پو پھٹنے کا منظر' برسات کی رات' لو کی تپش' خزاں کا موسم اور چڑیوں کی چہچہاہٹ کا ذکر کر کے شاعر نے ایک ہی نظم کو منظر نگاری کی قوس قزح بنا دیا ہے جو کہ شاذ کا ہی خاصہ ہے۔

شاذ کی منظر نگاری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں ؎

اوس کی آنچ سے پتیاں جل اٹھیں
نرم کہرے کی ضو جھلملاتی رہے

(لذت سنگ)

اوس کی پیاس سے کھلتی ہوئی ہونٹوں کی کلی
رس سے چھلکی ہوئی باتوں کی چھنکتی جھانجھن

(نیند کی وادی)

جب کرن آتی ہے پابوسئ شبنم کے لئے
جگمگا اٹھتے ہیں وجدان کی طاقوں کے دیے[۲۹]

(میرا فن میری زندگی)

شاذ کی تراکیب میں نغمگی ہوتی ہے۔ نیلم کے نگینے، چھنکتی جھانجھن، گلابی لہراؤ، التفات کے برگ، سپردگی کی چھاگل، گل التفات کی مہکار، دہلیز خزاں، کہکشاں کا لچکا، لگاوٹ کی شبنم، ان تراکیب میں ندرت اور دلکشی ہے۔ بنیادی طور پر شاذ جذبہ واحساس کے شاعر ہیں۔ اعلیٰ انسانی قدریں، محبتیں محرومیاں، پیار، خلوص، اور انسانی روابط شاذ کی نظموں کے موضوعات ہیں۔ شاذ تمکنت کی تخلیقات کے سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بے مثال شاعر ہیں۔ لفظوں کے انتخاب اور ان کی باہمی ترکیب سے انہوں نے اپنے فن کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔

گلزار: ایک ایسے شاعر ہیں جن کی فنکارانہ شخصیت ہمہ جہت ہے۔ ان کی حیثیت ایک شاعر کے علاوہ فلم ساز، مکالمہ نگار اور گیت کار کی بھی ہے۔ ان کے ادبی سروکار بہت گہرے اور توانا ہیں۔ انہوں نے جہان فلم کو بھی اپنی ادب نوازی سے زرخیز بنایا ہے۔ ان کی نظموں میں پرانی قدروں کے ٹوٹنے کا درد اور کرب نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

گلزار کے یہاں منظر نگاری کے نمونے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ خاص طور سے دیہاتی زندگی کے مناظر اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ ان کی نظموں میں جلوہ گر ہیں۔ ان کا

مجموعہ کلام 'جولا ہے' اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ وہ فطری مناظر کے حسن اور فطری زندگی کی معصومیت کو بڑے خوبصورت انداز میں اپنی نظموں میں ڈھال لیتے ہیں۔ وہ اپنی انوکھی پیکر تراشی کی وجہ سے ایک الگ فضا قائم کر لیتے ہیں۔ ان کی نظم ''ایندھن'' کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

چھوٹے تھے' ماں اپلے تھاپا کرتی تھی / ہم اپلوں پر شکلیں گوندھا کرتے تھے
آنکھ لگا کر۔۔۔کان بنا کر / ناک سجا کر
پگڑی والا' ٹوپی والا

وہ پنڈت تھا / اک منا تھا
اک دشرتھ تھا شمشان میں بیٹھا سوچ رہا ہوں
آج رات اس وقت کے / جلتے چولہے میں
اک دوست کا اپلا اور گیا [۳۰]

وحید اختر (۱۹۳۵ء۔۱۹۹۶ء): کا شمار علی گڑھ کے ادبی معاشرے میں آل احمد سرور اور جذبی کی نسل کے بعد کی صف میں نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش مومن پورہ اورنگ آباد میں ہوئی لیکن ان کا تعلق دراصل نصیر آباد (جائس) رائے بریلی' یو پی سے ہے۔ ان کے گھر کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی اس لئے تعلیم حاصل کرنے میں انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۴۹ء میں امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور بعد ازاں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ انہیں ''میر درد: تصوف وشاعری'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی تفویض کی گئی۔

وحید اختر کا تعلق سرزمین دکن سے ہے جو کہ اردو کا ایک بڑا ادبی مرکز رہا ہے اور یہاں کے نظم گو شعرا بھی قابل ذکر تعداد میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ان کی نظموں کا سرمایہ ان کی غزلوں کے مقابلے زیادہ ہے۔ ان کی اکثر نظمیں فکر انگیز اور معنویت سے بھر پور ہوتی ہیں لیکن شعریت کی کمی اور روکھا انداز دکھائی دیتا ہے۔

وحید اختر کے کئی مجموعے کلام منظر عام پر آئے جن میں ''پتھروں کا مغنی''، ''شب کا رزمیہ''، ''زنجیر کا نغمہ'' اور مراثی کا مجموعہ ''کربلا تا کربلا'' قابل ذکر ہیں۔ ان کی تنقید پر ایک کتاب بعنوان ''فلسفہ اور ادبی تنقید'' شائع ہوئی جسے اردو دنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۹۶۰ء کے بعد شاعری میں جو رجحانات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں، وہ ترقی پسند شاعری سے مختلف ہیں۔ یہ رجحان ایک قسم کی بے چینی، مایوسی، ذہنی اضطراب، تنہائی اور داخلی کشمکش کی پیداوار ہیں۔ وحید اختر کی شاعری بھی انہیں رجحانات سے عبارت ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے عہد کو جس شکل میں دیکھا اور پہچانا ہے اسے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ بیسویں صدی کے میکانکی دور میں انسانی زندگی جس مشینی عمل سے گزر رہی ہے اس کا شدید ردّ عمل وحید اختر کی نظموں میں موجود ہے۔

وحید اختر کے یہاں عمومی طور پر جدیدیت کے دوسرے شاعروں کی طرح منظر نگاری کے نمونے بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ان کی رومانی شاعری میں منظر نگاری کی جھلک جا بجا ملتی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں ایک پر کیف فضا چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ نظم 'پیمانِ وفا سے پہلے' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تم سیہ خانۂ تنہائی میں اترا ہوا اک ماہ تمام
یا تمہیں اپنے ہی خورشید بکف خواب کا چہرہ سمجھوں
تم خموشی کے سمندر میں ہو سرشارئ موجِ نغمہ
یا تمہیں اپنی ہی کھوئی ہوئی آواز کا نغمہ سمجھوں
تم تڑپتے ہوئے صحرا میں نسیم سحری کا ہو خرام
یا تمہیں تشنگی عمر تمنا کا مداوا سمجھوں ۳۱

مندرجہ بالا نظم میں شاعر نے محبوب کو کبھی ماہ تمام، کبھی موج نغمہ تو کبھی نسیم سحری سے تعبیر کر کے نظم کو ایک تمثیلی رنگ دے دیا ہے۔ محبوب کے یہ مختلف رنگ دراصل ان کی تمناؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔

نظم ''سفر نکہت گل'' کے چند اشعار دیکھئے ؎

وہی گھٹاؤں کی رت ہے' وہی پھوار کے دن
وہی عروس چمن ہے' وہی سنگار کے دن
نہ جانے چھوڑ کے اس جان رنگ و بو کو کہاں
پلٹ کے موسم دیوانہ گھر پھر آیا ہے
لہو کی بوندیں ٹپکتی ہیں کیسے یادوں سے
یہ راز دامن تر میں چھپا کے لایا تھا
بھڑکنے لگتی ہے کس طرح آگ پانی سے
جھلس کے روح کو پروا نے اب بتایا ہے
وہ پھول چھوڑ کے جس کو چلی گئی نکہت
رہ ایک برگ کو دے کے دہان زخم کے لب
یہ دے رہا ہے دعا نکہت پریدہ کو
کسی بھی دل میں رہے وہ قرار بن کے رہے
کسی بھی پھول میں مہکے بہار بن کے رہے۳۲

مندرجہ بالا نظم میں 'نکہت' محبوب کا اور 'گل' عاشق کا استعارہ ہے۔ اس نظم کا ہر بند گھٹاؤں اور بہار کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ رت وہی 'موسم وہی' مگر گل کو چھوڑ کر نکہت کے چلے جانے سے موسم نے اپنی سابقہ دل آویزی کھودی ہے۔ اس کے باوجود گل کے زخمی لبوں پر کوئی شکوہ نہیں بس اس کی سلامتی اور خوشی کی دعا ہے جو وحید اختر کی کلاسیکی مزاج کی غماز ہے۔

وحید اختر کا رجحان طویل نظم نگاری کی طرف خاص طور پر رہا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی جزیات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور اپنی نظم میں منظر پس منظر کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم 'ہوسٹل کی ایک شام' ہے۔ اس کے کچھ بند ملاحظہ ہوں ۔

دن ڈھلے ہی سے ہے فضا گم صم
خامشی' بے کلی' ہراسانی

درو دیوار پر برستی ہے
آخر روز کی سنہری دھوپ
سقف و محراب سے اتر آئی
صحن میں ایستادہ پیڑوں پر
اب لپٹ کے وداع ہوتی ہے
سایے لیٹے ہوئے ہیں قدموں میں
رو رہی ہے ہوا درختوں میں ۳۳؎

مندرجہ بالا نظم کی شروعات ایک سوگوار، خاموش اور ویران شام سے ہوتی ہے۔ جس میں شاعر کی فکر مختلف مناظر سے الجھتی ہوئی فکر فردا پر ختم ہوتی ہے۔ پوری نظم میں منظر نگاری کے کچھ خوبصورت نمونے ملتے ہیں جو وحید اختر کے مشاہدے سے عبارت ہیں۔

نظم 'ایک شام: دو نظمیں' میں شام حال کی علامت ہے۔ یہ شام پر ہول، ویران، اداس اور طوفان زدہ ہے جہاں ایسا موسم ہے جو نہ سرما ہے نہ گرما پھر بھی یہاں لو خاک اڑاتی ہے اور سڑکوں پر برف ہی برف ہے، یہاں ایک دھند لکا ہے جو نہ تیرگی ہے نہ روشنی، سناٹا ہے جو نہ صدا ہے نہ خاموشی، نہ دن کا ہنگامہ ہے نہ رات کی آسودگی۔ شام کی جھولی میں کچھ بھی نہیں۔ اس خالی شام کو وحید اختر نے دو زاویہ سے دیکھا ہے۔ پہلا زاویہ شام کی اجتماعی شکل پیش کرتا ہے جہاں خالی اسکول، کالج، دفتر، اور کارخانے ہیں اور سڑکوں پر ایک دوسرے سے اجنبی لوگوں کا ہجوم۔ دوسری نظم میں شاعر نے ذاتی زندگی میں شام کی صورت حال کو نظم کیا ہے۔ ذاتی زندگی میں رشتوں کے بکھراؤ نے انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ تنہائی کا یہ کرب وحید اختر کی اکثر نظموں میں پایا جاتا ہے۔

وحید اختر نے بڑے چھوٹے، امیر غریب، جسم روح، معمولی غیر معمولی اس طرح کے دوسرے بے شمار تضادات کا ذکر اپنی نظموں میں کیا ہے۔ جس کی مثال ان کی ایک نظم ''شب سال نو'' ہے۔ یہ نظم ان متضاد لفظوں کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کے نمونے بھی پیش کرتی ہے۔ اس نظم کی ابتدا موسم گرما کی منظر کشی سے ہوتی ہے جو جوش کی یاد دلاتی ہے۔ نظم کے دو

بند ملاحظہ ہوں ؎

آسماں سرد برفیلے موسم کی بے رحم بانہوں میں جکڑا ہوا
دیو زمستاں کی شب کا ہے کہرے کی میلی رضائی میں لپٹا ہوا
برف بستہ ہوا سرد مفلوج پیروں سے بڑھتی ہے اک اک قدم
چپ دریچوں کی بستہ صفوں میں ہیں بجھتی ہوئی شمعیں غرق الم
شب سیہ شال اندھیرے کی اوڑھے شجر دیر سے سو رہے ہیں
اور سن سن کے نوحے ہواؤں کے پژمردہ گل رو رہے ہیں
ٹہنیوں سے ٹپکتے پگھلتے چراغ آنسوؤں کے بجھے جا رہے ہیں
رات کی یخ زدہ انگلیوں پر اجالوں کے قطرے جمے جا رہے ہیں
کہیں کچھ مکاں اور کہیں پوری آبادیاں خواب میں ہیں
شبستانوں میں بلب خاموش ہیں، شمعیں گم طاق و محراب میں ہیں۳۴

مندرجہ بالا بندوں میں موسم سرما کی منظرکشی کی گئی ہے۔ اس میں انہوں نے علائم، استعارات اور تلمیحات کا استعمال خوب کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی نظموں میں دھندلکا، کسی قسم کی سریت اور پیچ نہیں کے برابر ہے۔

''کربلا تا کربلا'' وحید اختر کے مرثیوں کا مجموعہ ہے۔ عام طور پر مرثیوں میں صبح اور رات کی منظرکشی بیان کی جاتی ہے لیکن وحید اختر کے مرثیوں میں موضوعات کا تنوع اور فکر کی گہرائی ملتی ہے ان کے یہاں مضمون آفرینی، مرقع نگاری، جذبات نگاری اور مکالمہ نگاری کی اچھی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ تشبیہات اور استعارات کا استعمال بہت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مرثیے کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

وہ جام جیسے ہیرے کی ترشی ہوئی کنی
وہ جام جیسے چادر انوار ہو تنی
وہ جام جیسے چھٹکی ہوئی شب کی چاندنی
وہ جام جیسے پہلی کرن میں ہو روشنی۳۵

بحیثیت مجموعی وحید اختر کی مرثیہ نگاری قدیم اور جدید طرز اسلوب کا حسین سنگم ہے۔ وحید اختر نے جدید مرثیہ کو نئی علامتوں، نئے تلازموں، نئی امیجری اور پیرایہ اظہار کے جدید پیکروں سے نئی شناخت اور نیا لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ ان کے مرثیوں میں رجز، رخصت، آمد، جنگ، شہادت اور بین کے ساتھ ساتھ کردار نگاری اور منظر نگاری کے قابل قدر نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وحید اختر کے مرثیوں میں انیس و دبیر کے علاوہ جوش کا اثر بھی دیکھائی پڑتا ہے۔

زبیر رضوی (۱۹۵۳ء): کو جدید نظم کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانا جاتا ہے۔ جدید اردو نظم ان کے تذکرے کے بغیر ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے نظم اور غزل دونوں میں یکساں طور پر اعلی مقام حاصل کیا۔ ان کے تین مجموعے ''لہر لہر ندیا گہری''، ''خشت دیوار'' اور ''مسافت شب'' منظر عام پر آ کر دیر پا اثرات مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن ''پرانی بات ہے'' نامی مجموعہ میں شامل نظمیں نہ صرف ان کی اپنی بلکہ ان کے اہم ہم عصروں کی نظموں سے بھی مختلف اور منفرد ہیں۔ اس مجموعے نے انہیں نئی شاعری کی تاریخ میں وہ مقام عطا کیا ہے جس کے عرصے سے وہ متلاشی تھے۔ آنے والے برسوں میں وہ اسی حوالے سے جانے اور پہچانے جائیں گے۔

زبیر رضوی کا سلسلہ وار نظموں کا مجموعہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ بقول شاعر یہ نظمیں اس احساس کے تحت لکھی گئی ہیں کہ راتوں کو قصہ سنانے کی روایت آج بھی چوپالوں اور آنگنوں میں زندہ ہے۔ ہر نظم 'پرانی بات ہے' سے شروع ہوتی ہے جو کہ کسی نہ کسی قصے پر مبنی ہے۔ تمام نظمیں داستان کے اسلوب میں ہیں۔ نظموں کی قدیم پیکریت 'راتوں میں جلتے ہوئے الاؤ' خانہ بدوشوں کے خیمے' اونٹوں کی قطاریں' کھجوروں کے پیڑوں' دف بجاتی عورتیں' مخملیں سرکتے پردوں' عود و عنبر' سلگتے لوبان' اور ہرے تابوتوں سے پرانی فضا تازہ ہو جاتی ہے۔ نظموں کی پیکریت پر اثر ہے لیکن لگتا ہے کہ مقصود گویا فضا سازی ہی ہے۔

زبیر چونکہ رومانیت کے حوالے سے جانے جاتے ہیں، اس لئے جہاں رومانیت ہے

وہاں منظر نگاری کسی نہ کسی شکل میں دکھائی دیتی ہی ہے۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے یہاں الفاظ کی روانی دھیمی ہے۔ اس سلسلے میں خان حسنین عاقب اپنے مضمون ''زبیر رضوی: جدید نظم کا نمائندہ شاعر'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''وہ بہت احتیاط سے' بڑی ملاحت سے استعارہ بہ استعارہ' علامت بہ علامت آگے بڑھتے ہیں جیسے تیراک پانی کی دھار کو کاٹتے ہوئے آہستہ روی سے آگے بڑھتا ہے۔'' ۳۶

زبیر کی ہر نظم بتاتی ہے کہ ان کے شاعرانہ مزاج میں نرم روی ہے۔ ان کی ایک نظم ''چارہ ساز'' کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے ؎

تم اپنے منظروں میں گم تھے
جب ہم نے صبا کے ہاتھ پر
رسم حنا بندی کا اک وعدہ نبھایا تھا
خزاں کے زرد چہرے پر
ہرے پتوں کی جب ابٹن لگائی تھی۔۔۔

زبیر کی مندرجہ بالا نظم خالص مشرقیت اور مشرقی جمالیات نیز شگفتہ اسلوب کی آئینہ دار ہے۔ ان کی ایک اور نظم جس کا عنوان ''پرانی بات ہے'' ہے۔ اس نظم کا تذکرہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ نظم حکائی لہجے کی نظموں میں سے ہے جو اہل نقد کی توجہ کا مرکز بھی رہی ہے۔

زبیر کی شاعری کا نمایاں عنصر ان کی غنائیت ہے۔ یہی غنائیت ہے جو ہر پل قاری کو موسم گل کا احساس دلاتی ہے۔ متذکرہ بالا مجموعے کی ہر نظم کا پہلا مصرعہ یا فقرہ 'پرانی بات ہے' سے شروع ہوتا ہے۔ جو شاعر کو زمانی اعتبار سے دو مختلف دریچوں میں موجود دکھاتا ہے۔ ایک دریچہ زمانۂ حال کا ہے جہاں وہ راوی کی حیثیت سے کھڑا ہے اور دوسرا دریچہ ماضی کا ہے جس کی وہ بات کر رہا ہے۔ اگر اس مجموعے کی نظم 'علی بن متقی رویا' کو لیا جائے تو ہمیں شاعر کی نئی شاعری کی تخلیقی جہت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے ؎

پرانی بات ہے لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
علی بن متقی مسجد کے منبر پر کھڑا
کچھ آیتوں کا ورد کرتا تھا
جمعہ کا دن تھا مسجد کا صحن
اللہ کے بندوں سے خالی تھا
وہ پہلا دن تھا مسجد میں کوئی عابد نہیں آیا
ہوا پھریوں منڈیروں پر' گنبدوں پر ان گنت پر پھڑ پھڑائے
کاسنی' کالے کبوتر صحن میں اتر آئے
وہ پہلا دن تھا مسجد میں
وضو کا حوض تھا خالی
صفیں معمور تھیں ساری! ۳۷

مندرجہ بالا بندوں کے تین مدارج ہیں۔ پہلے میں علی بن متقی کے مسجد میں نمازیوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے رونے کا ذکر ہے' دوسرے میں کبوتروں کا مسجد میں اترنا اور تیسرے میں نمازیوں کے نہ ہونے کے باوجود صفوں کا معمور ہونا' ایک مکمل کیفیت کا اظہار کرتی ہیں اور اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ فطرت کا کوئی بھی کام اللہ صرف انسانوں کے بھروسے نہیں چھوڑتا۔

ان کی ایک طویل نظم ہے جس کا عنوان ''صادقہ'' ہے۔ یوں تو یہ نظم براہ راست اپنے شریک سفر سے مکالمہ کی شکل میں ہے۔ لیکن اسے بھی منظریہ نظموں کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ نظم منظر بہ منظر آگے بڑھتی ہے۔ استعارات کا ایک بہتا ہوا دریا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ نظم زبیر کے اسلوب بیان کی جدت اور ندرت خیال سے عبارت ہے۔

شہر یار (۱۹۳۶ء) : کا شمار ۱۹۵۵ء کے بعد کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر اپنے تخلیقی ذہن کی غیر معمولی کارگذاریوں کا احساس دلایا۔ شہر یار کے یہاں شخصی سطح پر عصری حسیت کی پیچیدگی کا اظہار ملتا ہے اور جہاں تک زبان و

بیان کے برتاؤ کا تعلق ہے، وہ روایت شکنی کے بجائے روایت کے تحفظ اور اس کی توسیع کے قائل ہیں۔

شہریار نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ریٹائیر ہوئے۔ ان کے کلام کے پانچ مجموعے اسم اعظم، ساتواں در، ہجر کے موسم، خواب کا در بند ہے، نیند کی کرچیں، منظر عام پر آئے۔ ان کے مجموعوں کے انگریزی اور دیوناگری میں بھی تراجم ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کئی نظموں کے ترجمے فرانسیسی، جرمن، روسی، بنگالی اور تیلگو میں بھی ہوئے ہیں۔ اپنے کارہائے نمایاں کے لئے انہیں مختلف اعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا۔

شہریار کا شمار جدید شعرا کی کھیپ میں صف اوّل میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر مانے جاتے ہیں اور اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری تقریباً چار دہائیوں پر محیط ہے۔ ان چار دہائیوں میں انہوں نے زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا اور برتا ہے۔ جدید شاعروں نے کنکریٹ کے جنگل جیسے سنگلاخ شہروں کی افراتفری اور ہماہمی میں اپنے وجود کی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ شہریار کی شاعری میں ان شہروں کی کسیلی فضا ملتی ہو یا نہ ملتی ہو لیکن آج بھی ان کے اشعار سے مٹی کی سوندھی خوشبو آتی ہے۔ ان کی نظم ''دھند کی حکومت'' کا یہ بند ملاحظہ ہو ۔

سورج اک نٹ کھٹ بالک سا، دن بھر شور مچائے
ادھر ادھر چڑیوں کو بکھیرے، کرنوں کو چھترائے
قلم، درانتی، برش، ہتھوڑا، جگہ جگہ پھیلائے
شام، تھکی ہاری ماں جیسی
اک دیا ملکائے دھیمے دھیمے
ساری بکھری چیزیں چنتی جائے [۳۸]

شہریار کی اکثر نظموں میں پیکر تراشی کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظمیں افتاد، نیا افق، خوف کا قہر، فیصلے کی گھڑی، خواہشوں کا قہر، بند آنکھوں سے ایک دعا اور

رنجگوں کا زوال پیش کی جا سکتی ہیں۔ نظم ''فیصلے کی گھڑی'' کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

آنکھ کی اوس کے چند قطروں سے، بنجر زمیں کے کسی گوشے میں
پھول پھر سے اگانے کی کوشش کرو۳۹

دوسری نظم ''ایک دعا'' کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں؎

اے ہوا/ طائروں کی توتلی آواز کو
اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہی ہے تو کہاں
دیکھ چٹانیں زمیں کے گوشے گوشے سے ابھرتی/ آ رہی ہیں۴۰

شہریار کی نظموں اور غزلوں میں رات اور دن کے بنیادی استعارے سے جو تلازمات جنم لیتے ہیں وہ دونوں اصناف میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ رات کے ساتھ نیند' خواب' چھایا' پرچھائیں' دھند' سناٹا اور دن کے تلازمے کے طور پر بیداری' سورج' دھوپ' شعائیں اور تمازت جیسے الفاظ ایک طرف ایک دوسرے کا تقابل اور تخالف کا منظر پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف اس صورت حال میں اجنبیت' لاحاصلی اور بالآخر زوال کو انسانی سماج کے سرگرم عمل اور ابتری سے نبرد آزما ہونے کا جواز بنا دیتے ہیں۔

شہریار کی ایک مکمل اور جامع نظم جس کا عنوان ''پہلے صفحے کی پہلی سرخی'' ہے جسے منظر نگاری کے حوالے سے نظر انداز ہرگز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک بند درج کیا جاتا ہے ؎

ہمالہ کی بلند چوٹی پر/ برف کے اک سبک مکاں میں/ بجھی ہوئی مشعلوں کا جلسہ
عظیم اور عالمی مسائل پہ/ ایک ہفتے سے ہو رہا ہے/ صفر تک درجہ حرارت پہنچ چکا ہے
مزید تفصیل راز میں ہے۴۱

مندرجہ بالا نظم میں ہمالہ کی برفیلی چوٹی کے پس پردہ عالمی مسائل اور صورت حال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ 'ہمالہ کی بلند چوٹی' کے الفاظ جہاں ایک طرف موسم سرما کے پرفضا مقام کا اشاریہ ہیں وہیں چوٹی کانفرنس کی اہمیت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ برف کا مکان' بجھی ہوئی مشعلیں' درجہ حرارت کا صفر تک پہنچنا' جیسے استعارے' منفی سوچ' بے معنی غور و فکر' انسانی مسائل کے حل میں سرد مہری کے رویے' دانش وروں یا پیشہ ور سیاست دانوں کی پوری

نفسیات کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ شہریار کی نظموں میں جہاں ایک طرف وقت اور اس کے پس منظر میں دن رات کے بدلتے منظر نامے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے وہیں تاریخ کا جبر بار بار اپنا احساس دلاتا ہے۔

ندا فاضلی (۱۹۳۸ء): کا شمار رجحان ساز شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں جہاں محرومیوں، مسرتوں، اداسیوں اور ناگواریوں کا عکس ملتا ہے وہیں سماجی، سیاسی اور اقتصادی سطح پر بھی زندگی سے گہرا سروکار نظر آتا ہے۔ زندگی کے منظر نامے پر ابھرنے والے سبھی موضوعات کو انہوں نے بڑی چابکدستی سے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے انہوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور فلموں میں نغمہ نگاری کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کا مجموعہ کلام لفظوں کا پل، مور ناچ اور آنکھ اور خواب کے درمیان قابل ذکر ہیں۔

ان کا خاصہ یہ ہے کہ وہ بہت آسان زبان اور اس سے زیادہ آسان اسلوب میں بہت بڑی بات کہہ جاتے ہیں جو فیشن کا حصہ نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری قاری کے اذہان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ شکست و ریخت اور ناہمواریوں سے گذرنے کے باوجود ندا فاضلی کی شاعری میں تمام رنگوں میں زندگی کا رنگ سب سے نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ انہیں غزل، نظم، گیت، دوہے ہر صنف شعر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

ندا فاضلی کی شخصی نظمیں خارجی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ اپنی ذات کے توسط سے کائنات تک پہنچتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں بلا کسی تمہید کے شروع ہوتی ہیں۔ کچھ بند ملاحظہ ہوں ؎

شکرا اے درخت تیرا رتری گھنی چھاؤں میرے راستے کو ڈھکتی ہے
شکرا اے چمکتے سورج رتری شاخوں سے ترے آنگن میں روشنی
شکرا اے چمکتی چڑیا رترے سروں سے مری خوشی میں نغمگی ہے
پہاڑ میرے لئے بھی موسم سجا رہا ہے رندی کا پانی ہوا سے بادل بنا رہا ہے[۲۴]

❁ ❁ ❁

دور مابعد جدیدیت

(۱۹۸۰ء کے بعد)

عنبر بہرائچی (۱۹۴۹ء): سکندر پور بہرائچ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ جغرافیہ میں ایم اے کیا اور صحافت میں ڈپلومہ کی ڈگری حاصل کی۔ عنبر بہرائچی کو اردو، ہندی، انگریزی، اودھی، برج، بھوج پوری اور سنسکرت پر عبور حاصل ہے۔ ان کے کئی مجموعہ ہائے کلام اردو میں منظر عام پر آچکے ہیں، جن میں مہاتما بدھ کی حیات اور تعلیمات پر مبنی ادبی رزمیہ 'دوب' اور 'سوکھی ٹہنی پر ہریل' قابل ذکر ہیں۔ اردو نظموں کا مجموعہ 'سوکھی ٹہنی پر ہریل' کو ۲۰۰۰ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

عنبر بہرائچی بہ یک وقت ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر، اردو کے معتبر ادیب و شاعر، سنسکرت شعریات اور اس کی روایات کے واقف کار اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان ہیں۔ عصر حاضر میں عنبر بہرائچی اس اعتبار سے اردو کے پہلے ادیب کہے جاسکتے ہیں جنہوں نے سنسکرت شعریات کے تنقیدی تناظرات و معیارات کی بازیافت میں بھرپور توجہ صرف کی اور اردو زبان وادب میں ان کا باضابطہ تعارف کرایا۔ ان کی شاعری اردو کی روایتی شاعری سے مختلف ہے۔ 'دوب' اور 'سوکھی ٹہنی پر ہریل' دونوں کے نام پر غور کریں تو ایک ارضیت اور غیر روایتی اسلوب اور رنگ کا احساس ہوتا ہے۔

ان کے مجموعے میں شامل نظموں میں ایک احساس پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ ہے فطرت میں مدغم ہونے کا احساس۔ فن کار فطرت سے اپنے آپ کو کتنا زیادہ متعلق محسوس کرتا ہے اس کا اندازہ ان کی نظموں میں پائی جانے والی جزئیات نگاری کے نمونوں سے کیا جاسکتا

ہے۔ایک بات اور اہم ہے وہ یہ کہ فن کار نے اپنے اس تعلق اور فطرت سے وابستگی کو نہ تو ROMANTICISE کیا ہے اور نہ ہی IDEALIZE کرنے کی کوشش کی ہے۔

عنبر کی ایک طویل نظم ہے''لم یات نظیرک فی نظر (آپ ﷺ کا نظیر کسی کو نظر نہ آیا)'' جس میں اعلان نبوت سے فتح مکہ کے واقعات کو شعری تجربوں میں جذب کیا گیا ہے۔اس نظم کی سب سے بڑی خوبی موضوع اور اس کے آہنگ کی وحدت کا قائم ہونا اور CONCENTRATION ہے۔شاعر نے اس نظم میں امیجری کی جو فضا قائم کی ہے وہ نمائشی اور مصنوعی نہیں ہے۔شاعر نے حقیقت کو اپنے باطنی احساس کے ساتھ پیش کرنے میں بیانیہ انداز کا سہارا لیا ہے اور بعض جگہ خوبصورت منظر نگاری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔نظم کا درج ذیل بند انہیں خیالات کا غماز ہے ؎

دھواں دھواں دیار زعفران زار ہو گیا
فضا میں مور پنکھ رنگ ابر جھومنے لگا
لچک رہی ہیں ریتیوں میں دوب کی کلائیاں
رقم ہیں زرد کے بدن پہ چمپئی رباعیاں
گلاب آنچلوں میں لا جورد چاند بھر گئے
بہار بارشوں میں خار و خس سنور نکھر گئے
سر جبل بھی شوخ مرغ زار جھومتا ہوا
سحاب کیف و رنگ' برگ و بار جھومتا ہوا ۴۳

عنبر کا دوسرا شعری مجموعہ''سوکھی ٹہنی پر ہریل'' بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس میں انہوں نے فکری' فنی' لسانی 'ہیئتی' سبھی سطحوں پر کامیابی سے تجربے کئے ہیں۔نظموں پر مشتمل اس مجموعے نے عنبر بہرائچی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتگان کی صف میں جگہ عطا کی ہے۔اس مجموعہ کی نظموں کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

۔۔ابھی تو کچنار کے شگوفوں پر تتلیاں بھی
اڑی نہیں تھیں

ابھی املتاس کے جوگیا پیرہن کی جانب
سیاہ بھنورے بڑھے نہیں تھے
ابھی پلاشوں کے سرخ چونز سے شوخ پروا
لڑی نہیں تھی
تمہارے سر ہر سنگھار لپکیں
تمہارے تلووں میں تازگی کے گلاب مہکیں
(۔۔ابھی تو)
گلابی چونچ میں کیڑے لیے اڑتی ہے گوریا
۔۔۔وہ اک ننھا بیا
ہر پتیوں کے تنکے تراش کر اک ببول کی
زر خمیدہ ٹہنی میں
آشیانہ بنا رہا ہے
(نظم: گلابی چونچ)
وہ شہد کی مکھیاں، کہ جن کی درود خوانی
کے ساتھ
بھاری مشقتوں کے مہکتے جھالے سنہرے چھتے
سجا رہے ہیں
(نظم: یہ سلسلے ہیں کمال فن کے)
گولر کے کچے پھل بھی ہر جانب ہیں
میٹھے پانی والی جھیل ہے پہلو میں
الگ تھلگ برگد کی سوکھی ٹہنی پر
ہریل پنکھ بچھائے بیٹھا ہے

(نظم: سوکھی ٹہنی پر ہریل)

عنبر بہرائچی کے یہاں نظیر اکبرآبادی کی طرح ایسے الفاظ کی کثرت ہے جو عام طور پر شاعری میں مستعمل نہیں ہیں۔تتلیوں کی اڑانوں' کچنار کے شگوفوں' املتاس کے جوگیا پیرہن' پلاشوں کے سرخ چونر' ہارسنگھار کی لہک' جھینگروں کی راگنی' مینڈکوں کے دھرپد اڑانے' کیکڑ کی سبز شاخوں' گھونسلوں' اڑتی ہوئی گوریا' ابابیل کے آشیانہ بنانے' شہد کی مکھیوں کی درود خوانی' گولر کے کچے پھول' برگد کی سوکھی ٹہنی اور اس پر بیٹھے ہریل وغیرہ کا جو ذکر عنبر کے یہاں ملتا ہے وہ عام طور پر کسی حسین شعری پیکر یا کسی معنی خیز استعارہ کی تخلیق کرنے کے بجائے ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کی ORIGINALITY سے ہم آغوش ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

عنبر بہرائچی کا مجموعہ ''سوکھی ٹہنی پر ہریل'' کی اشاعت سے شاعر اور شاعری دونوں کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا ہے۔آل احمد سرور اس مجموعے کے امتیازی خصائص اور اس کے تخلیق کار کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ان کی شاعری میں فطرت کا حسن ہے' مشرقی یوپی کی دھرتی کی بوباس ہے' پیڑوں' پودوں' دریاؤں' جنگلوں' کچے مکانوں' تالابوں' معصوم شریر امنگوں اور تلخ حقائق کی دھوپ چھاؤں ہے۔ترقی کے جنون میں فطرت کی پامالی کی دلدوز داستان کبھی آدمی کے جانور بن جانے اور کبھی اس کے فرشتہ نظر آنے کے مناظر بھی ہیں۔ان کی زبان میں ایک نیا ذائقہ ہے۔ یہاں نعرے بازی نہیں' صرف تصویریں ہیں جو اپنی بات اشاروں میں کہہ دیتی ہیں۔ مجھے یہ مجموعہ فطرت کی طرف واپسی اور فطرت اور انسان کے پرانے رشتے کی نئی استواری کا رجز لگتا ہے۔''[۴۴]

درحقیقت عنبر بہرائچی آدمی' زندگی' کائنات' خدا اور فطرت کی حسین اور عظیم ہستی میں بہ یک وقت زندگی اور آخری سچائی کے شاعر ہیں۔HE IS A POET OF ULTIMATE۔

صلاح الدین پرویز (۱۹۵۴ء): نے ادبی وشعری سفر کا آغاز نظم سے کیا۔ ان کی ابتدائی نظمیں مستقبل کی بہت ہی اچھی شاعری کی نقیب بن کر ابھریں اور نقد ونظر کے اکابرین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ صلاح الدین پرویز کے تقریبا ڈیڑھ درجن شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں کچھ کے نام ژاژ' نیگیٹو' جنگل' دھوپ سمندر سایہ' دھوپ سراب' لوریاں' خطوط' کنفیشن' سبھی رنگ کے ساون' پرماتما کے نام آتما کے پتر' دشت تحیرات' کتاب عشق' بنام غالب قابل ذکر ہیں۔

صلاح الدین پرویز کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا طریقئہ کار جو ابتدا میں الجھا ہوا تھا' بتدریج واضح اور روشن ہوتا گیا۔ پرویز کا شاعرانہ امتیاز مر وجہ فارسی زدہ اردو اسلوب کی کوکھ سے ہی جنم لیتا ہے۔ لیکن ان کی خاص پہچان کا وسیلہ ہندو دیو مالا اور اور ہندی الفاظ ومحاورات کا تخلیقی استعمال ہے۔ پرویز کی جو چیز معاصرین کے انبوہ میں ایک امتیازی خدوخال عطا کرتی ہیں اس کا تعلق مختلف النوع شعری تصورات' رویوں اور رجحانات میں ان کی مخصوص انتخابی صلاحیت سے ہے۔

صلاح الدین پرویز کی تخلیق کا بنیادی استعارہ 'عشق' ہے۔ ایک طرف وہ خدا سے عشق کرتے ہیں' رسول سے عشق کرتے حضرت علی' زینب فاطمہ سے عشق کرتے ہیں' رام' بھلے شاہ' حضرت نظام الدین' خواجہ اجمیری' کبیر اور ان گنت صوفی سنتوں سے ان کا عشق عیاں ہے۔ صلاح الدین پرویز کی شعری کائنات کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ عشق کا عنصر ان کے کلام میں غالب دیکھائی دیتا ہے اور یہی عشق ادبی دنیا میں ان کی غیر معمولی شہرت کا محرک بنا ہے۔

ان کی پوری شعری کائنات جہاں روحانی زخموں اور درد کی کسک سے معمور ہے' اپنے اندر ایک قوت شفا بھی رکھتی ہے۔

پرویز کی شاعرانہ نظر اپنی خداداقوت کے سبب زندگی کے تمام مظاہر میں مخفی ہم آہنگی کا جلوۂ صد رنگ دیکھ لیتی ہے بلکہ کائنات آب وگل میں کلی داخلی صداقت کا تعاقب اپنا ایک مستقل وظیفہ بنا لیتی ہے۔

صلاح الدین پرویز نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ شاعری کی افق پر رومانی شاعر کیٹس (keat s) کی طرح نمودار ہوئے جن کی زندگی تمام تر عشق اور رومان کی طربنا کیوں اور حیرت نا کیوں کے گرد رقص کناں رہی ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''سبھی رنگ کے ساون'' کی نظموں کو ان کی رومانی شاعری کا لینڈ مارک کہا جا سکتا ہے۔

صلاح الدین پرویز کی شاعری میں جذبے کی تپش، گرمی حرارت، زندگی کا درد اور مٹی کی سوندھی خوشبو اس طرح رچ بس گئی ہے کہ قاری بھی اس کو بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل نظم کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنی مٹی سے کس قدر جڑا ہوا ہے۔ کچھ بند ملاحظہ ہو ؎

میرا باپ ایک گڈریا تھا
دن بھر بھیڑوں کے پیچھے بھاگتا
اور ایسا کرنے سے جنگل کے ہزاروں کانٹے
اس کے تلووں پیوست ہو جاتے ہیں، پھر بھی وہ مسکراتا رہا
لیکن رات آنے پر جیسے ہیں وہ گھر میں گھستا
تو اس آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں
میرا باپ ایک لکڑ ہارا تھا
دن بھر لکڑیاں کاٹتا اور شام
ان کا گٹھر پیٹھ پر لاد کر
شہر کے سوق میں بیچ دیتا
اور ایسا کرنے سے اس کی پیٹھ پہلے سے
اور زیادہ جھک جاتی، پھر بھی وہ مسکراتا رہتا
لیکن رات آنے پر جیسے ہی وہ گھر میں گھستا
تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں ؎۴۵

مندرجہ بالا نظم میں شاعر نے اپنے باپ کو ایک لکڑ ہارے اور ایک گدڑیا کی علامت کے طور پر بیان کر کے ایک عام انسان کے دکھ درد کو محسوس کرنے اور اسے اپنی نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

صلاح الدین پرویز کے یہاں منفرد انداز، مخصوص لب ولہجہ، پرواز تخیل اور احساسات و مشاہدات کی آنچ سے تپ کر نظم کا جو نیا روپ سامنے آیا ہے وہ ان ہی کا خاصّہ ہے۔ ان کی نظمیں پڑھنے والے کو ایک ایسی فضا میں لے جاتی ہیں جہاں مسرت و بصیرت کے کئی دروازہ کھلتے ہیں اور سرشاری کی نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ نظم ''سابرمتی ایکسپریس میں ایک رات'' ملاحظہ فرمائیں ؎

سابرمتی ایکسپریس میں اک رات
میں نے گذاری جلتے ہوئے شعلوں کی طرح
راکھ کے ساتھ
پلیٹ فارم سنسان، تھا کوئی نہیں وہاں
اسٹیشن ماسٹر، قلی، چائے بیچنے والا
سبھی
ہو گئے تھے گماں
خاموش ہو گئی تھی یقیں کی گھڑی۔۔
پاس کے گاؤں سے اٹھ رہا تھا
اچانک میں زور سے چلایا
'ہے رام'
گیان ہوا جیسے میرے بالکل قریب
بیٹھے ہوئے ہوں باپو
لاٹھی ان کے ہاتھ میں اب بھی ہے
لیکن اس میں پڑ گئی ہے درار

ناک پہ گول گول عینک
اب بھی ٹکی ہوئی ہے
لیکن شیشوں کا رنگ چیخ کے
ہوگیا ہے لال۔۔
باپو۔۔باپو۔۔باپو
میں نے ان سے کچھ کہنا چاہا
پر نت رکھ دیا انھوں نے
میرے منہ پر تر نت ہاتھ
گویا ہوئے لقوائی لہجے میں
آج میں بھی گذاروں گا تمہارے ساتھ
اسی سابرمتی ایکسپریس میں
یہ رات
صبح پرلے ہوگی
تو دونوں ہاتھ پسار کے
ایک ہی سر میں روئیں گے
مناجات۔۔۔
ایشور، اللہ، تیرو نام
سب کو سمتی دے بھگوان ۴۶؎

مندرجہ بالا نظم میں صلاح الدین پرویز نے تیکھے طنز کے ذریعے احوال و مسائل کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ لائق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر اپنی شعری کائنات سے محبت کے ایسے پھول کھلاتا ہے جس کی خوشبو دور دور تک پھیلتی جاتی ہے۔ صلاح الدین پرویز نے بھی اپنی نظموں کے ذریعے ایسے ہیں پھول کھلائے ہیں جس کی خوشبو نہ صرف دور تک پھیلتی ہے بلکہ دیر تک پھیلی رہتی ہے۔

عذرا پروین: کا تعلق ملیح آباد سے ہے۔ ۸۔۹ سال کی چھوٹی عمر سے ہی ادبی کاوشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور روز نامہ ''قومی آواز'' میں بچّوں کے گوشے میں چھپنے لگیں۔ انہیں جانوروں سے کافی شغف تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر میں پولٹری فارم' بکریوں کا باڑہ اور کبوتر اور پرندوں کا بھی جھنڈ ہوا کرتا تھا۔ روئی کے گالے جیسے حسین' نرم' سفید چوزے کو بے جان ہو کر لڑھکتا دیکھ کر انھیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ایک بار انہوں نے کتے کے پلّے کو دسمبر کی سردی میں ٹھٹھر کر مرتے ہوئے دیکھ کر وہ اتنا متاثر ہوئیں کہ پہلی بار عذرا نے باضابطہ جو نظم لکھی وہ ''کتے'' پر ہی ہے۔

عذرا پروین کی نظموں میں جدید طرز فکر و احساس کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی شاعری کے مضامین پیچیدہ اور انداز پیش کش جدید ہے۔ وہ ہمیشہ انفرادیت کی تلاش میں کوشاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے شعری سفر کا سلسلہ غزلوں' پابند نظموں کے بعد نثری نظم پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

جینت پرمار: نے خالص نظمیہ شاعری سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ان کی تخلیقی حسّیت کا اظہار بیک وقت برش اور رنگوں کے ذریعے بھی ہوتا ہے اور قلم کے ذریعے بھی۔ ان کی نظموں میں باپ' ماں' نانی اماں اور ایسے ہی دوسرے رشتوں کا تقدّس بھی ملتا ہے اور مذموم سیاست سے پیدا شدہ ہندوستان کا کریہہ چہرہ بھی۔ ان کے یہاں دلت اور دیہی فکر پر مشتمل نظمیں ملتی ہیں جو اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتی ہیں۔ دلت مسائل کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے اپنی نظموں کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ وہ عام فہم اور آس پاس کے الفاظ اپنی نظموں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ نے جینت پرمار کی شاعری پر تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ''سامنے کا لفظ' سامنے کا بولتا ہوا رنگ۔ فارسی نژاد الفاظ مرکب بھاری بھرکم الفاظ اور اضافتوں سے گریز جینت پرمار کے اسلوب کی مخصوص پہچان ہیں۔ بہت کم لفظ میں ماورائے الفاظ معانی خلق کرنے کا فن جینت پرمار کی مخصوص قوت کے پہلو ہیں۔''[۴۷]

جینت پرمار کی شاعری میں دیسی پن اور دلت فکر کی شدّت کو نظم ''کالا سورج: اور'' کے مندرجہ ذیل بند میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

صبح سویرے/کرن کے سوکھے پتے/آنگن میں جھڑنے میں/کاگا شور مچاتا ہے
تھوہر پر بیٹھے مرغ کی/آخری چیخیں سنتا ہوں/
گھر کے اک کونے میں/کھانس رہا ہے نانی کا کمبل
دھوپ نے چھت پر پاؤں دھرا/مکئی کی روٹی اور مرچ/رہ تکتی ہے باپو کا
ٹوٹی پھوٹی چرپائی پر باپو کو/بستی کے کچھ لوگ اٹھا لے آتے ہیں
اونچی ذات کے لوگوں نے بے رحمی سے/ان کو مارا ہے[۴۸]

مندرجہ بالا نظم میں شاعر نے دلت کمیونیٹی کی ناگفتہ بہ حالت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔ نظم کی فضا بندی خالص ہندوستانی دیہات کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتی ہے۔

جینت پرمار کی نظموں کا خاص موضوع 'ماں' کا کردار رہا ہے۔ وہ ماں کے تقدّس اور ایثار وقربانی کے جذبے کو مندرجہ ذیل دو نظموں میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

سورج اگنے سے پہلے/جلا رہی تھی چولھا/دھواں سانس میں جاتے ہی/
کھانس پڑا تھا چندا
چرپائی پر جاگ پڑا میں/کٹیا میں گھستے ہی دیکھا/
چولھے میں لکڑی کی جگہ ماں جلتی تھی[۴۹]

کبھی چارپائی پہ/بستر بچھاتے ہوئے/ماں کو دیکھا بھی ہے؟
کھینچتی ہے/کبھی سیدھا کرتی ہے/چدّر کو کیسے!/کہ اک آدھ سلوٹ
تمہارے بدن میں کہیں چبھ نہ جائے[۵۰]

راشد انور راشد: کا شمار موجودہ دور کے منظر نگار شعرا میں سرفہرست ہے۔ ان کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلے ''کہرے سے ابھرتی پرچھائیں'' و ''شام ہوتے ہی اور

حالیہ مجموعہ ''گیت سناتی ہے ہوا'' جو کہ منظر نگاری کے نمونوں سے بھرا ہوا ہے۔ اردو میں کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جس کی ہر غزل کا ہر شعر یا ہر نظم کا مجموعی تاثر' فطرت کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتا ہے۔ بظاہر یہ کام بہت آسان معلوم ہوتا ہے' لیکن اگر اس پہ عمل کیا جائے تو انتہائی دشوار ہے۔ ان مجموعوں میں قابل ذکر تعداد نظموں کی ہے۔

ان کی نظموں میں جا بجا ہوا' برفیلی ہوا' گرم ہوا' اور باد صبا کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ندی' دریا' ریت' جزیرہ' قوس وقزح' آندھی' وادئ گل' درخت' پہاڑ کی برف' سبزہ' چھاؤں' موسم' پتھر' دھوپ' رات' زمین' چاندنی' پہاڑ' عندلیب' طوفان' سیلاب' صحرا' تاریکی' جیرہ' بارش اور آبشار وغیرہ کا ذکر ان کی نظموں کا لازمی حصہ ہیں۔

ان کی نظموں کے چند نمونے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام گیت سناتی ہے ہوا کی نظم 'ہوا جب گنگناتی ہے'' کا مندرجہ ذیل بوند ملاحظہ ہو ؎

ہوا جب گنگناتی ہے/تو ہر منظر/بڑا شاداب لگتا ہے
درختوں پر پرندے/چہچہاتے ہیں
پہاڑوں پر اچھلتی کودتی ندیاں نکلتی ہیں
گھٹائیں جھوم کر نغمہ سناتی ہیں[۵۱]

اس کے علاوہ شام کی اڑان' صبح کا جادو' پرندہ کا گھونسلہ' موسم کی پہلی بارش' قدرت کے تحفے' سوکھے پتوں پر بارش' اور اس طرح کی متعدد نظمیں منظر نگاری کے حوالے سے پیش کی گی ہیں۔ ان کی تمام نظموں کے مطالعے سے ان کے انفرادی رنگ و آہنگ کا پتہ چلتا ہے جسے انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ تمام نظمیں قدرت سے انسان کے لازمی رشتے کی وضاحت کرتی ہیں۔

راشد کو فطرت کے مظاہر سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مجموعے کلام کے دیباچے (اعتراف) میں فرماتے ہیں:

''گرمی کی راتوں میں چھت پر لیٹے وسیع و عریض آسمان میں جگ مگ کرتے تاروں کو گھنٹوں دیکھنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ دن میں جھلسا

دینے والی گرمی کے بعد رات کی تاریکی میں چاندنی راتوں کی ٹھنڈک فرحت بخش تازگی سے ہم کنار کرتی رہی ہے۔ جاڑے کی نرم دھوپ ذہن و دل میں تازگی اور حرارت پیدا کرتی ہے تو نسیم سحر کے خوشگوار جھونکوں سے وجود کی وادی سرشار ہو جاتی ہے۔ نیلگوں آسمان کی وسعتیں، سمندر کی تغیانی، ندی کا شور، جھیل کی خاموشی، ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، کلیوں کی مسکراہٹ، بوندوں کا سرگم، بہار کی رعنائی، غرض کہ کائنات کی ہر شئے مجھے شروع سے اپنی جانب کھینچتی رہی ہے۔ فطرت کے ان مظاہر میں نہ صرف میں خالق کائنات کے جلوے دیکھتا ہوں بلکہ انسانی زندگی سے ان کے لازمی انسلاک پر مسلسل غور بھی کرتا ہوں۔'' ۵۲

عادل حیات (۱۹۷۵ء): کا شمار موجودہ دور کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے عصری تقاضوں کو ذہن میں رکھ کر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ادب اطفال اور تنقید پر بھی انہوں نے کئی کتابیں تخلیق کی ہیں۔ عادل حیات کی نظمیں اپنے آس پاس کے تکدر آمیز ماحول اور انسانی رشتوں کے بکھراؤ سے پیدا ہونے والی صورت حال کی ترجمان ہیں۔ ان کے کلام میں مناظر فطرت تو نظر آتے ہیں لیکن ان کی خوبصورتی پر وقت اور حالات کی ہیبت ناکی کا تسلط دکھائی پڑتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''بگولے شور کرتے ہیں'' کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؂

بگولے/شور کرتے ہیں/مری خواہش کی دنیا میں
جہاں ویرانیاں ہیں اور/بہت سے بانجھ پیڑوں کی قطاریں ہیں
کہ جن کی ٹہنیوں سے اڑ گئے سارے پرندے/آسماں کی بے کرانی میں
بہت دن ہو گئے/موسم نہیں آئے بہاروں کے/نہیں تو بلبلیں چہکیں
نہیں تو پھول ہی مہکے/مدھر آواز کوئل کی نہیں آئی ۵۳

عادل حیات کی نظر دنیا کی ویرانیوں پر پڑتی ہے جہاں بانجھ پیڑوں کی قطاریں ہیں، بہار کے موسم معدوم ہیں، بلبلیں چہکتی نہیں، پھول مہکتے نہیں، کوئل کی مدھر آواز سنائی دیتی نہیں

اور گہری ویرانی کا سایہ ہر طرف ہے۔ ان احساسات سے لبریز ان کی متعدد نظمیں ان کے مجموعے میں دکھائی دیتی ہیں جو زمانے کے کرب کی ترجمان ہیں۔

مندرجہ بالا شعرا کے علاوہ بھی ایسے شاعر اور شاعرات کی قابل ذکر تعداد ہے جنہوں نے مختلف ادوار میں اپنی نظموں میں اپنے اپنے انداز میں منظر نگاری کے خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن ان تمام شعرا کرام کا تفصیلی ذکر کرنا اس کتاب میں ممکن نہیں ہے لہٰذا صرف نام پر ہی اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان تخلیق کاروں میں عرش ملسیانی، ملکہ نسیم، عذرا نقوی، شہناز نبی، فرحت احساس، شکیل اعظمی، جمال اویسی، عبدالاحد ساز اور دیگر کئی نام شامل ہیں جنہوں نے اپنے فکر و فن سے اردو نظم اور منظر نگاری کی روایات کی کسی نہ کسی شکل میں بہترین آبیاری کی ہے۔

حواشی

۱۔ اردو نظم ۱۹۶۰ء کے بعد' ڈاکٹر قاسم امام' ماہنامہ ایوان اردو دہلی، فروری ۲۰۰۸ء

۲۔ پیش رو نئی دہلی' ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء' ص

۳۔ انٹرویو' مطبوعہ استعارہ' اکتوبر۔ دسمبر' ص ۳۰ بحوالہ ایوان اردو' اکتوبر ۲۰۰۸ء' ص ۲۸

۴۔ آسماں اے آسماں' خلیل الرحمٰن اعظمی' ص ۲۱۴

۵۔ ایضاً' ص ۲۱۵

۶۔ اردو نظم ۱۹۶۰ء کے بعد' اردو اکادمی' ص ۱۵

۷۔ آزادی کے بعد اردو شاعری' مقالات و مباحث' ساہتیہ اکادمی' ص ۱۲۶

۸۔ اردو نظم ۱۹۶۰' اردو اکادمی' ص ۳۸

۹۔ محمد علوی' ص ۱۱

۱۰۔ آزادی کے بعد اردو شاعری: مقالات و مباحث' ساہتیہ اکادمی' ص ۲۳۴

۱۱۔ پیش لفظ' آتش زیرپا' مجموعہ کلام' ساجدہ زیدی' ص ۹

۱۲۔ پیش لفظ' مجموعہ شعلہ جاں' زاہدہ زیدی' ص ۱۹

۱۳۔ مجموعہ کلام شعلہ جاں، زاہدہ زیدی، ص ۸۳۔۴۸
۱۴۔ مجموعہ شعلہ جاں، زاہدہ زیدی، فلیپ از وحید اختر
۱۵۔ عمیق حنفی: ایک مطالعہ، بلراج کومل، بحوالہ آجکل اگست ۱۹۹۱ء ص ۱۷
۱۶۔ جنگل ایک ہشت پہلو تصویر، آزادی کے بعد اردو نظم، ترتیب: شمیم حنفی، مظہر مہدی، ص ۴۱۵
۱۷۔ مضمون عمیق حنفی: اندھیرے میں سوچنے کی مشق، زبیر رضوی، بحوالہ اگست ۱۹۹۱ء ص ۹
۱۸۔ عمیق حنفی: ایک مطالعہ، آجکل اگست ۱۹۹۱ء، ص ۱۴
۱۹۔ آزادی کے بعد اردو نظم، ترتیب شمیم حنفی، مظہر مہدی، ص ۴۷۷
۲۰۔ سفر مدام سفر، بلراج کومل، ص ۴۱
۲۱۔ رفتار، ہماری زبان، دسمبر ۱۹۵۶ء
۲۲۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، مرتبہ ڈاکٹر عتیق اللہ، ص ۳۵
۲۳۔ شاذ تمکنت، بیگ احساس، ص ۴۷
۲۴۔ ایضاً، ص ۴۸
۲۵۔ تراشیدہ، شاذ تمکنت، ص ۴۸
۲۶۔ ایضاً، ص ۴۴
۲۷۔ بحوالہ شاذ تمکنت، مونوگراف، ساہتیہ اکادمی: باگ احساس، ص ۴۹
۲۸۔ تراشیدہ، شاذ تمکنت، ص ۲۰
۲۹۔ بحوالہ کلیات شاذ، پیش لفظ، ص ۱۰
۳۰۔ فکر و تحقیق، نئی نظم نمبر، ص ۱۰۴
۳۱۔ پتھروں کا مغنی، وحید اختر، ص ۱۴۶
۳۲۔ ایضاً، ص ۵۲۔۵۳
۳۳۔ ایضاً، ص ۸۳
۳۴۔ زنجیر کا نغمہ، وحید اختر، ص ۸۸
۳۵۔ ایضاً، ص ۱۶۸
۳۶۔ سہ ماہی مژگان، کولکاتہ، جلد ۱۴، شمارہ ۴۰۔۴۱، ص ۵۵
۳۷۔ مجموعہ دامن، زبیر رضوی، ص ۱۲۰۔۲۱

۳۸۔ آج کل اور ادب کے پچاس سال، ص ۶۲

۳۹۔ جدید شعری منظر نامہ، حامدی کاشمیری، ۲۲۰

۴۰۔ جدید شعری منظر نامہ، حامدی کاشمیری، ۲۲۰

۴۱۔ شعر و حکمت، جلد اوّل، ص ۳۲۴

۴۲۔ فکر و تحقیق، نئی نظم نمبر، ص ۱۰۲

۴۳۔ شعر و حکمت، جلد اوّل، مرتبین: شہریار و مغنی تبسم، ص ۱۸۷

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۴۵۔ مضمون: خوش آہنگ شاعر، صلاح الدین پرویز، ایوان اردو، مارچ ۲۰۱۲ء ص ۱۵

۴۶۔ ایوان اردو، مارچ ۲۰۱۲ء، ص ۱۵

۴۷۔ پیش لفظ: پینسل اور دوسری نظمیں، ص ۳۲

۴۸۔ کالا سورج: اور، ص ۶۷

۴۹۔ ماں پینسل اور دوسری نظمیں، ص ۴۵

۵۰۔ ماں کی چتا: پینسل اور دوسری نظمیں، ص ۴۷

۵۱۔ گیت سناتی ہے ہوا: راشد انور راشد، ص ۱۴۶

۵۲۔ ایضاً، ۲۲۔۲۳

۵۳۔ خیال دریا: عادل حیات، ص ۱۹

باب ششم

گلوبل وارمنگ اور مناظر فطرت

گلوبل وارمنگ اب کوئی غیر معروف اصطلاح نہیں رہی۔ اس کا سیدھا سا مطلب کرۂ ارض کا گرم ہو جانا ہے۔ ایسا گیسوں' مثلاً کاربن ڈائی آکسائیڈ کی فضا میں گہری پرت کے چھا جانے اور ماحول میں مستقل بنتی ہوئی ہوائی آلودگی (Air Pollutants) کے سبب ہوتا ہے۔ گرم گھر والی گیسوں (Hot House Gases) کی پرت دراصل آفتاب کی گرمی پر چھا جاتی ہے اور کرۂ ارض کو گرم کرتی ہے۔

صنعتی انقلاب کی آمد اور دنیا کی متعدد سوسائٹیوں کے ماڈرنائیزیشن کے بعد توانائیوں کے یہ وسائل جس شرح پر استعمال ہوئے ہیں، وہ ڈرامائی انداز میں بڑھے ہیں اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا ہی جا رہا ہے۔ صرف گذشتہ تین دہائیوں میں دنیا میں توانائی کا استعمال تین گنا بڑھا ہے اور اس توانائی کا بیشتر حصہ اب بھی جیواشم یا حجریہ ایندھن (Fossil Fuel) سے فراہم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ وسائل بہت تیزی سے ختم ہوتے جا رہے ہیں اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ عنقریب ہی مخصوص ایندھن کا مکمل خاتمہ ہو سکتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے آنے کے بعد ہی سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے جماؤ میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ متعدد گیسوں میں کاربن ڈائی آکسائیڈ بنیادی ہے جو کہ تنہا ہوا میں ۵۷ فیصد ہے۔ اس سے درجہ حرارت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہ گیس دیگر گرین ہاؤس گیسوں کے برعکس ۵۰ سے ۲۰۰ برسوں تک برقرار رہ سکتی ہے اور اوپر ہوا میں جمع ہوتے ہوئے گرین ہاؤس کے اثر کو مزید بڑھا سکتی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ اس طرح کرۂ ارض کی حرارت میں ہو رہے مسلسل اضافے سے حیاتیات (Ecology) میں دیگر تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ سمندری سطح اوپر اٹھتی ہے اور بارش کے پیٹرن اور مقدار میں کمی واقع ہوتی ہے۔ پھر ان کمیوں سے سیلاب' قحط' گرم لہروں' طوفانوں اور ٹوئسٹرز کی راہیں ہموار ہوتی ہیں نیز کرۂ ارض کے متعدد حصے آفات آسمانی میں

مبتلا ہوتے ہیں۔

ان ماحولیاتی تبدیلی کا اثر جہاں کرۂ ارض پر موجود تمام مخلوقات پر پڑتا ہے وہیں خود بنی نوع انسان کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔صرف مناظر فطرت ہی نہیں بلکہ دیگر عناصر فطرت بشمول چرندے پرندے بھی عنقا ہوتے جاتے ہیں۔مثال کے طور پر ہندوستان میں ریاست راجستھان کے سمبھر میں واقعہ انلینڈ سالٹ واٹر لیک میں سال رواں ۲۰۱۹ء کے نومبر ماہ میں صرف دس دنوں میں ۱۸ ہزار نقل مکانی کرنے والی (Migratory) چڑیوں کی موت ایک لمحہ فکر یہ ہے۔

اس ضمن میں ۹ جون ۲۰۱۰ء کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے شیلڈونین تھیٹر میں ''اسلام اور ماحولیات'' کے موضوع پر پرنس آف ویلس چارلس کا دیا گیا تاریخی لکچر یاد آتا ہے جس میں انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ دنیا کے وسائل کے لامحدود استعمال کا بڑھتا ہوا رجحان دراصل ہمارے اردگرد کی دنیا کی ہماری سائنسی سمجھ کے میکانیسٹک اور تخفیفی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔لہذا ہمیں اس تعلق سے الہامی مذاہب جو کہ فطرت سے قریب ہوتے ہیں کی جانب لوٹنا ہوگا۔اس لکچر میں انہوں نے اسلام اور قرآن کریم کی قدرت یا فطرت سے قربت کا خصوصی طور پر ذکر کیا تھا۔انہوں نے اپنے لکچر میں شعرا بشمول انگریزی شاعر ولیم ورڈس ورتھ کے حوالے سے بتایا تھا کہ مناظر فطرت کے تحفظ کے تعلق سے شعرا کا بڑا ہی اہم کردار ہے۔ان خیالات کی تصدیق سال ۲۰۱۹ء کے نومبر میں دہلی و گردونواح میں رونما ہونے والی فضائی آلودگی بھی کرتی ہے ۔اس آلودگی کے نتیجے میں فضا میں نارمل رینج سے کئی فیصد زیادہ پالوٹینٹ پارٹیکلز کے متجاوز ہوجانے کی وجہ سے ایک بحرانی صورت حال پیدا ہوگئی لیکن جیسے ہی تیز ہواؤں کا دور چلا یہ گھٹ کر نارمل رینج سے بہت قریب آ گئی ۔اس وقت مجھے اسمٰعیل میرٹھی کی وہ نظم یاد آتی ہے جس میں انہوں نے ہوا کی رفتار اور اس کی خصوصیات کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے
ہجوم طائرانہ خوش نوا ہے

کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سن سے
کبھی آہستہ رو موجِ صبا ہے
غبار و گرد سے جو اٹ گئی تھی
صبا نے غسل کا ساماں کیا ہے

اسمٰعیل کا یہ شعراس بات کی غمازی کرتا ہے شعرا کی نگاہ بینا آنے والی صدی میں رونما ہونے والے ان حالات و واقعات پر بھی ہوتی ہے جس کا تصّور ایک عام انسان کی سوچ سے بالاتر ہے۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جیسے جیسے ماحولیاتی تبدیلی ہوتی گئی' مناظر فطرت میں کمی واقع ہونے لگی۔ جنگلات ختم ہوتے گئے' پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جانے لگیں' ندیاں سوکھتی گئیں' پھول پتّیاں عنقا ہونے لگیں' چرندے پرندے' جانوروں اور کیڑے مکوڑے' حتیٰ کہ شہد کی مکھیوں کا بھی وجود خطرے میں پڑ گیا' پھولوں پر منڈلاتی ہوئی تتلیاں بھی بہت کم دکھائی پڑنے لگیں۔نتیجتاً شعرا کی توجہ ان پر سے ہٹتی گئی۔یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں قطب شاہی دور سے منظر نگاری کا جو سلسلہ باضابطہ شروع ہوا تھا وہ صنعتی انقلاب سے لے کر گلوبل وارمنگ آنے تک بری طرح متاثر ہوا۔

سوال یہ ہے کہ کیا شعرا اس جانب آگے بڑھ کر پھر کوئی اہم کردار ادا کریں گے؟ یہ ایسا سوال ہے جس سے کرۂ ارض پر موجود تمام مخلوقات کا وجود وابستہ ہے اور اس کا مثبت جواب دینے کے وہ اہل ہیں۔اسی لئے تو جگر مرادآبادی نے کہا ہے۔

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دل شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

کتابیات

شمار نمبر	نام کتاب	مصنف/مرتب	ناشر	سنین اشاعت
۱۔	اقبال اور اردو نظم	آل احمد سرور	لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۸۶ء
۲۔	اقبال کا نظام فن	ڈاکٹر عبدالمغنی	اردو بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی	(اوّل) ۱۹۸۵ء
۳۔	اردو شاعری: میر سے پروین شاکر تک مشتاق احمد		مکتبہ جدید، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲	۲۰۰۲ء
۴۔	انجمن پنجاب: تاریخ و خدمات	ڈاکٹر صفیہ بانو	کفایت اکیڈمی، اردو بازار، کراچی	(اوّل) ۱۹۸۷ء
۵۔	اردو کی منظری شاعری	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ	(اوّل) ۱۹۶۸ء
۶۔	اردو شاعری کا مزاج	وزیر آغا	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ	۱۹۷۴ء
۷۔	اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت	ڈاکٹر ندیم احمد (مرتب)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵	۲۰۱۲ء
۸۔	اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر	اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس، سوئی والان، دہلی۔۱۱۰۰۰۲	۱۹۷۸ء
۹۔	اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا	ڈاکٹر روشن اختر کاظمی	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲	۱۹۸۴ء
۱۰۔	اردو مثنوی شمالی ہند میں (جلد اوّل)	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۱۹۸۷ء
۱۱۔	اردو شاعری کی گیارہ آوازیں	عبدالقدوس	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۹۳ء
۱۲۔	اردو شاعری کا انتخاب	ساہتیہ اکادمی	ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی۔۶	(اوّل) ۱۹۶۰ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۱۳۔	اردو شاعری کا ارتقا	ڈاکٹر ناہید کوثر	ظفر پرنٹرز، اردو اکیڈمی، لاہور	
۱۴۔	انیس شناسی	گوپی چند نارنگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶	۱۹۸۱ء
۱۵۔	انشاء اللہ خاں انشاء	ایم حبیب خاں	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔۶	۱۹۸۹ء
۱۶۔	انشاء اللہ خاں انشاء	عابد پیشاوری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۱۷۔	اردو شاعری کا انتخاب	محی الدین قادری زور	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	(اوّل) ۱۹۶۰ء
۱۸۔	اردو میں نثری نظم	عبدالسمیع	ادارہ تحقیق، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی۔۲	۲۰۱۴ء
۱۹۔	اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید		
۲۰۔	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد		
۲۱۔	آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم	ڈاکٹر عتیق اللہ	اردو اکادمی، دہلی	(چہارم) ۲۰۱۱ء
۲۲۔	آزادی کے بعد اردو نظم	شمیم حنفی رمظہر مہدی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جسولہ، نئی دہلی۔۲۵	۲۰۰۵ء
۲۳۔	اردو شاعر	خدا بخش لائبریری، پٹنہ		
۲۴۔	الطاف حسین حالی: تحقیقی و تنقیدی جائزے	پروفیسر نذیر احمد	غالب انسٹی ٹیوٹ، ماتا سندری لین، نئی دہلی	۲۰۰۲ء
۲۵۔	اکبر الٰہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریہ	احمد ندیم قاسمی، ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۸۰ء
۲۶۔	اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵	۱۹۸۱ء
۲۷۔	اکبر الٰہ آبادی کی شاعری	ساحل احمد	اردو اکادمی، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۲۸۔	اقبال کی شاعری کا ذہنی و فنی ارتقا	ڈاکٹر عبدالمغنی	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	۱۹۹۱ء
۲۹۔	اقبال کی تیرہ نظمیں: تنقیدی مطالعہ	اسلوب احمد انصاری	غالب اکیڈمی	۱۹۷۷ء
۳۰۔	اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی	توقیر احمد خاں		
۳۱۔	اختر الایمان: مقام اور کلام	مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔۶	۱۹۹۷ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
۳۲۔	اخترالایمان:عکس اور جہتیں	شاہد ماہلی	معیار پبلی کیشنز، تاج انکلیو گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱	۲۰۰۰ء
۳۳۔	آسماں اے آسماں	خلیل الرحمن اعظمی	اعظمی میموریل سوسائٹی، سرسید نگر، علی گڑھ	۲۰۰۰ء
۳۴۔	اخترالایمان کی نظم نگاری	ڈاکٹر شمشاد جہاں	کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶	
۳۵۔	اختر اورینوی: حیات اور شاعری	ڈاکٹر قاسم فریدی	عمران پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ۔۴	
۳۶۔	انتخاب سراج اورنگ آبادی	سراج اورنگ آبادی	مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵	۱۹۶۹ء
۳۷۔	۱۹۷۷ کا شعری ادب	ساحل احمد	انجل پریس، الہ آباد، یوپی	۱۹۷۸ء
۳۸۔	آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب	ڈاکٹر محمد ذاکر	مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۳۹۔	آزادی کے بعد اردو شاعری :مقالات ومباحث	شہزاد انجم (مرتب)	ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱	۲۰۰۲ء
۴۰۔	آخر شب	کیفی اعظمی	کتب پبلیشرز لیمیٹڈ، بمبئی	۱۹۴۷ء
۴۱۔	بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی کے رجحانات	ڈاکٹر ظہورالدین	ہندوستان آرٹ پریس، جموں	۱۹۷۸ء
۴۲۔	بیسویں صدی کی اردو نظم پر اقبال کے اثرات	رئیسہ پروین		(اوّل) ۲۰۰۹ء
۴۳۔	پانچ جدید شاعر	حمید نسیم	مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی	(اوّل) ۱۹۹۷ء
۴۴۔	پردہ ہے ساز کا	پروفیسر ساجدہ زیدی	کلاسک آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج، نئی دہلی ۲	
۴۵۔	پرندوں بھرا آسمان	بلراج کومل	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
۴۶۔	تاریخ ادب انگریزی	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	(اوّل) ۱۹۸۶ء
۴۷۔	تیسری کتاب	محمد علوی	شعور پبلی کیشنز، ۹/۵۶۔راجندر نگر، نئی دہلی ۶۰	۱۹۷۸ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۴۸۔	جدید نظم کی کروٹیں	وزیر آغا	علی گڑھ بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ	۱۹۷۶ء
۴۹۔	جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	کندن لال کندن	ایس کے آفسیٹ پرنٹرز، ٹیا محل، دہلی۔۶	۱۹۹۱ء
۵۰۔	جدید اردو شاعری میں علامت نگاری	تبسم کاشمیری	سنگ میل پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور	۱۹۷۵ء
۵۱۔	جدید اردو نظم اور یورپی اثرات	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۵۲۔	جدید شعری منظر نامہ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	(اوّل) ۱۹۹۰ء
۵۳۔	جدید اردو نظم: نظریہ و عمل	پروفیسر عقیل احمد صدیقی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۲ء
۵۴۔	جمالیات: قرآن حکیم کی روشنی میں	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	۱۹۷۶ء
۵۵۔	جدید اردو شاعری کا نقطۂ آغاز: اسمٰعیل میرٹھی	ڈاکٹر شاداب علیم	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔۶	۲۰۱۱ء
۵۶۔	جوش ملیح آبادی: فکر و فن	ڈاکٹر ثریا خانم	حکمت منزل، چار دروازہ روڈ، گنگا پول، جے پور	۲۰۱۰ء
۵۷۔	جمیل مظہری بحیثیت مرثیہ نگار	ڈاکٹر نفیس فاطمہ	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔۶	۲۰۱۱ء
۵۸۔	حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی	محمد اسلم سیفی	دیال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۳۹ء
۵۹۔	حامد اللہ افسر میرٹھی: حیات شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر مقصود حسن	۷۷/۴۰، شاہ تھن، لساری گیٹ، میرٹھ	۱۹۸۸ء
۶۰۔	دکنی مثنویوں میں منظر نگاری	ملنسار اطہر ایم اے	عارف آرٹ قومی پریس، بنگلور	۱۹۸۱ء
۶۱۔	دکنی شاعری: تحقیق و تنقید	ڈاکٹر محمد علی اثر	اسٹوڈنٹس بک ہاؤس، چار مینار، حیدر آباد	۱۹۸۸ء
۶۲۔	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	مکتبہ معین الادب، اردو بازار، لاہور	۱۹۵۲ء
۶۳۔	روشنائی	سجاد ظہیر	سیما پبلی کیشنز، منیرکا، نئی دہلی ۶	۱۹۸۵ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۶۴۔	زمستاں سرد مہری کا	اختر الایمان	اردو اکادمی، دہلی	(اوّل) ۱۹۹۷ء
۶۵۔	سحر البیان	میر حسن	نول کشور پریس	۱۹۴۵ء
۶۶۔	سلام مچھلی شہری: شخصیت اور فن	ڈاکٹر عزیز اندوری	ساقی بک ڈپو، ۴۱۵۷۔اے، اردو بازار، دہلی	۱۹۹۸ء
۶۷۔	سجاد ظہیر: حیات و جہات	ڈاکٹر نصیر الدین ازہر	مظہر پبلی کیشنز، اے۔۱، جوگابائی ایکسٹینشن، نئی دہلی۔۲۵	۲۰۰۴ء
۶۸۔	سرور جہاں آبادی: تحقیقی و تنقیدی جائزے		ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔۶	۲۰۱۰ء
۶۹۔	سیاہ سیاہ	باقر مہدی	اظہار، ای۔۱، کارٹر روڈ، باندرہ، بمبئی، ۴۰۰۰۵۰	۱۹۹۳ء
۷۰۔	شہر آرزو	باقر مہدی	خلیل احمد خاں، گوشۂ ادب، ۲۱۔ارکیڈیا بلڈنگ، ممبئی	
۷۱۔	علۂ جاں ش	زاہدہ زیدی	آبشار پبلی کیشنز، ایچ آئی جی۔۴، سرسید نگر، علی گڑھ	۲۰۰۰ء
۷۲۔	شب گذشت	عمیق حنفی	شب خون کتاب گھر، رانی منڈی، الہ آباد	(اوّل) ۱۹۶۹ء
۷۳۔	طیور آوارہ	اختر شیرانی	کتاب منزل، لاہور	(اوّل) ۱۹۴۶ء
۷۴۔	عظیم کائنات کا عظیم خدا	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	الفیصل ناشران، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور	۱۲۰۱۱ء
۷۵۔	عہد جدید کے ممتاز شعرا	زرینہ عقیل احمد	اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔۲ ۲۱۱۰۰	(اوّل) ۱۹۸۳ء
۷۶۔	عروس فطرت	اثر لکھنوی	مکتبہ نرالی دنیا	
۷۷۔	عکس جمیل	پریم بہاری لال سکسینہ رواں	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶	۱۹۹۱ء
۷۸۔	فراق گورکھ پوری: شخصیت اور شاعری	عزیز نبیل	مجلس فخر بحرین، برائے فخر بحرین اردو	۲۰۱۴ء

۷۹۔ قدیم اردو نظم	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	ڈائریکٹر ترقی بیورو، ویسٹ بلاک ’آر کے پورم‘ نئی دہلی	۱۹۹۵ء
۸۰۔ قلق میرٹھی: حیات اور کارنامے	ڈاکٹر جلال انجم	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۸۷ء
۸۱۔ کاشف الحقائق	سیّد امداد امام اثر	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۸۲۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر سیّدہ جعفر	این سی پی یو ایل، آر کے پورم، نئی دہلی۔۶۶	(دوم) ۱۹۹۸ء
۸۳۔ کلیات میر (جلد دوم)	شمس الرحمٰن فاروقی / احمد محفوظ (مرتب)	این سی پی یو ایل، ایف۔سی ۳۳/۹، جسولہ، نئی دہلی۔۲۵	۲۰۱۳ء
۸۴۔ کلیات اکبر الٰہ آبادی	اکبر الٰہ آبادی	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	
۸۵۔ کلیات اکبر	اکبر الٰہ آبادی	فرید بک ڈپو، نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۸۶۔ کلیات اختر الایمان	بیدار بخت، سلطانہ ایمان	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔۶	۲۰۰۰ء
۸۷۔ کلیات راشد	ن م راشد	نرالی دنیا، دہلی	۲۰۰۱ء
۸۸۔ گیت سناتی ہے ہوا	راشد انور راشد	عرشیہ پبلی کیشنز، ۱۷۰۔اے، دلشاد کالونی، دہلی۔۹۵	۲۰۱۵ء
۸۹۔ لاہور کا دبستان شاعری	ڈاکٹر علی محمد خاں	مقبول اکیڈمی، شاہراہ قائد اعظم، لاہور	۱۹۹۲ء
۹۰۔ لاہور میں اردو شاعری کی روایت	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	مکتبہ عالیہ، لاہور	۱۹۹۱ء
۹۱۔ لفظوں کا پل	ندا فاضلی	نیو رائٹرس پبلی کیشنز، بمبئی۔۹	۱۹۶۹ء
۹۲۔ مناظر قدرت (جلد اوّل)	محمد الیاس برنی	مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ، علی گڑھ	۱۹۲۲ء
۹۳۔ موازنۂ انیس و دبیر	مولانا شبلی نعمانی	لالہ رام نارائن لعل، الٰہ آباد	۱۹۳۶ء
۹۴۔ محمد حسین آزاد	محمد اکرام چغتائی	ایم ایم پبلیکیشنز، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۶	۲۰۱۲ء
۹۵۔ متعلقات انشاء	عابد پشاوری	نصرت پبلی کیشنز، لکھنو	۱۹۸۵ء
۹۶۔ مقامات اقبال	ڈاکٹر سیّد عبداللہ	نقوش پریس لاہور	۱۹۵۹ء
۹۷۔ مطالعہ سلام سندیلوی	نسیم انہونوی	فہیم انہونوی، نظامی پریس، لکھنو	(اوّل) ۱۹۸۱ء

۹۸۔	مظہر جمیل	کوثر مظہری	عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی	(دوم) ۲۰۱۴ء
۹۹۔	نصرتی	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	۱۹۸۸ء
۱۰۰۔	نئی نظم نئے دستخط	شاہد ماہلی	سی۔۲۰، معیار پلیکیشنز، شیخ سرائے، نئی دہلی	۱۹۸۰ء
۱۰۱۔	نئی نظم کا سفر	خلیل الرحمن اعظمی	مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی۔۲۵	۲۰۱۱ء
۱۰۲۔	نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	ڈاکٹر سید آل ظفر	انڈیان آرٹ آفسیٹ، نیا ٹولہ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴	۲۰۰۸ء
۱۰۳۔	نظیر اکبر آبادی: حیات شاعری و نثری خدمات	پروفیسر عبدالحئ فاروقی	شیروانی آرٹ پرنٹر، دہلی۔۶	۲۰۱۱ء
۱۰۴۔	نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری	ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔۶	۱۹۹۲ء
۱۰۵۔	نظیر اکبر آبادی: ایک منفرد شاعر	پروفیسر صدیق ا لرحمٰن قدوائی	عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی	۲۰۱۰ء
۱۰۶۔	نژاد سنگ	بلراج کومل	نصرت پبلیشرز، کپور مارکیٹ، لکھنو۔۳	(اوّل) ۱۹۷۵ء
۱۰۷۔	نیم خواب	شاذ تمکنت	نژاد کتاب گھر ۳۔۱۷، معظم پورہ، حیدر آباد	۱۹۷۷ء
۱۰۸۔	ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری	میر حسن	احمدیہ پریس، حیدر آباد، دکن	(اوّل) ۱۹۳۲ء

❁ ❁ ❁

رسائل و جرائد

- ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (جوش نمبر) محبوب الرحمٰن فاروقی شمارہ نمبر ۔۱۴ اپریل ۱۹۹۵ء
- ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (گوشہ عمیق حنفی) شمارہ نمبر ۔۱ اگست ۱۹۵۸ء
- ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (گولڈن جبلی نمبر) شمارہ نمبر ۔۱۹ اپریل ۱۹۹۲ء
- ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (اختر الایمان نمبر) شمارہ نمبر ۔۷ فروری ۱۹۹۴ء
- ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (اقبال نمبر) شہباز حسین شمارہ نمبر ۔۴ نومبر ۱۹۷۷ء
- نقوش (اقبال نمبر ۔۲) محمد طفیل شمارہ نمبر ۱۔۲۔۳ دسمبر ۱۹۷۷ء
- نیرنگ خیال (اقبال نمبر) بدرالدین حسن ستمبر ۔۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء
- ماہنامہ بیسویں صدی (جوش نمبر) مئی ۱۹۸۲ء
- ماہنامہ ایوان اردو، نئی دہلی (کیفی اعظمی نمبر) سیکریٹری اردو اکادمی شمارہ نمبر ۔۱۱۶ اگست ۲۰۰۲
- ماہنامہ ذہن جدید زبیر رضوی
- ماہنامہ شاعر، ممبئی (اقبال نمبر) افتخار امام صدیقی شمارہ نمبر ۔۱ تا ۶ جنوری تا جون ۱۹۸۸ء
- شعر و حکمت شہریار رمغنی تبسم
- فکر و تحقیق، نئی دہلی (نئی نظم نمبر) ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین شمارہ نمبر ۔۱ جنوری ۔فروری ۔

  مارچ ۲۰۱۵ء
- سہ ماہی تحقیق، جمشید پور احمد بدر اپریل تا جون ۲۰۱۵ء
- ماہنامہ اردو دنیا، نئی دہلی پروفیسر ارتضیٰ کریم شمارہ نمبر ۔۹ ستمبر ۲۰۱۵ء
- ماہنامہ ایوان اردو ایس ۔ایم ۔علی شمارہ نمبر ۔۷ نومبر ۲۰۱۵ء
- ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی خالد محمود شمارہ نمبر ۔۱۱ نومبر ۲۰۱۴ء

❁ ❁ ❁

کتب خانے

- ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ، نئی دہلی
- جامعہ ہمدرد لائبریری، نئی دہلی
- ہارڈنگ لائبریری، چاندنی چوک، دہلی
- جے این یو لائبریری، نئی دہلی
- داراشکوہ لائبریری، اردو اکادمی، دہلی
- ہردیال پبلک لائبریری، دہلی

ENGLISH BOOKS

1. **An Essay on Nature**
   by Fredrick F E Woodbridg
   Columbia University Press, New York, 1961

2. **Nature And Man**
   by Paul Weiss , New York ,1947

3. **The Concept of Nature in Ninteenth Century English Poetry**
   by Joseph Warren Beach
   Pegeant Book Company, New York, 1956

4. **A Short History of English Literature**
   by E Albert
   New York, Oxford University Press,1950

5. **Nature and Man**
   by Paul Weiss, New York, 1947

6. **Mountain Gloom and Mountain Glory**
   by Marjorie Hope Nicolson
   Comel University Press , New York , 1959

7. ***The Romantic Poets***
   by Graham Hough
   Hutchinson House, London, 1 Edition, 1953

ڈاکٹر صبیحہ ناہید کا گھرانہ شروع سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ چچا شوکت علی آزاد شاعر نانا خواجہ عبدالحسیب فارسی واردو کے مفکر و مصنف تھے۔ ان کے علاوہ عبداللہ ہلال صدیقی شاعر اور ڈرامہ نویس و نظیر صدیقی ناقد و دانشور سے بھی قرابت داری تھی۔ خوش دامن صاحبہ ام آسیہ بھی شعر وادب سے کافی دلچسپی رکھتی تھیں اور ان سے بھی شغف حاصل کرنے کا موقع ملا۔

پانچ دہائیوں کے لمبے عرصے کے بعد تصنیف و تالیف میں باضابطہ انٹری انہیں ان قلیل افراد کی صف میں لاکھڑا کرتی ہے جن میں انگریزی ادب کی مایہ ناز شخصیت نیرد سی چودھری شامل ہیں۔ نیرد بابو کی بھی پہلی کتاب ''ایک انجان ہندوستانی کی آپ بیتی'' ان کی عمر کی آدھی صدی گذرنے کے بعد آئی تھی۔

گاؤں میں پلی بڑھی ڈاکٹر صبیحہ ناہید فطری مناظر سے ابتدا سے ہی قریب رہیں۔ غالباً ان کی اس قربت نے ہی انہیں منظر نگاری کی علمی و تحقیقی کاوش سے جوڑ دیا ہے۔ توقع ہے کہ چھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب جو منظر نگاری کا مکمل احاطہ کرتی ہے، محققین کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

ماہرین کی آرا

کائنات کے اس کرۂ ارض پر جہاں ہماری آپ کی بود و باش ہے، قدرت کے بے مثال مظاہر و مناظر ہیں جو اپنے غیر معمولی حسن، پرکشش انداز اور فرحت بخش نظاروں کے باعث اولاد آدم میں ہمیشہ سے موضوع گفتگو رہے ہیں۔ تمام آسمانی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ ہر عہد اور ہر طبقے کے انسان نے حسب استعداد ان پر غور و خوض کیا ہے اور اپنے نتائج فکری سے دوسروں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعری میں بھی ان اشیائے عالم کا ذکر کثرت سے موجود ہے۔ جنگل، پہاڑ، سمندر، ندیاں، آبشار، چاند، سورج، ستارے، باغ، پھول، پھل، آگ، پانی، مٹی، ہوا، بہار، خزاں، سردی، گرمی، برسات، کے حوالوں سے کوئی صنف سخن خالی نہیں۔ ہر زبان کے شعراء میں یہ چیزیں یکساں طور پر مقبول رہی ہیں اور شاعری کے محبوب ترین موضوعات میں شمار ہوتی ہیں۔ صدیوں سے شاعروں کے جذبات و احساسات فطرت کے انہیں اشاروں کے توسط سے فروغ پذیر ہے۔ ہماری اردو بھی اس سے الگ نہیں۔ ڈاکٹر صبیحہ ناہید کی پیش نظر کتاب ''اردو نظم میں مناظر فطرت: قطب شاہی دور سے گلوبل وارمنگ تک'' اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔

مذکورہ کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اپنے موضوع کا سنجیدگی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کی نظر سے پوشیدہ رہا ہو۔ حالانکہ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور اس کا دائرۂ کار صدیوں کو محیط ہے۔ کوئی دانا و بینا شاعر ایسا نہ ہوگا جس نے مناظر فطرت جیسے سحر انگیز موضوع سے صرف نظر کیا ہو یا مناظر و مظاہر کی کرشماتی فضا نے اس کے دل و دماغ کو متاثر نہ کیا ہو۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تا حال اس پر اتنا کام نہ ہو سکا جتنا اس کا حق تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر صبیحہ ناہید نے اس کمی کو محسوس کیا اور اس کا ازالہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی یہ مخلصانہ کاوش مقبول خاص و عام ہوگی۔

پروفیسر خالد محمود، سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مناظر فطرت صرف کرۂ ارض ہی کا خاصہ نہیں ہے بلکہ جنت کی خصوصیات میں بھی قرآن کریم میں اس کا حوالہ موجود ہے۔ گویا مناظر فطرت سے اس کائنات میں رنگ ہے۔ اتنا ہی نہیں کرۂ ارض یا کسی اور سیارہ میں زندگی ہے تو اس کا وجود بھی اس کے دم سے ہے۔ تبھی تو ماحولیاتی تبدیلی کے اس دور میں قدرتی مناظر ہی نہیں بلکہ دیگر مخلوقات بشمول چرندے پرندے بھی عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی تناظر میں ہندوستان میں جے پور کے نزدیک سمبھر کے اطلینڈ سالٹ واٹر لیک میں نومبر ۲۰۱۹ء میں محض دس دنوں کے اندر پائی گئی 18 ہزار مائیگریٹری چڑیوں کی لاشیں باعث تشویش بنی ہوئی ہیں۔
ایسے حالات میں ڈاکٹر صبیحہ ناہید کی ماہرین ماحولیات اور شعرا و ادباء کو ماضی کی منظوم خدمات کے حوالے سے توجہ دلاتی ہوئی یہ کتاب بروقت محسوس ہوتی ہے۔

اے یو آصف، ڈائرکٹر، پریس کلب آف انڈیا، نئی دہلی

Urdu Nazm mein Munazire Fitrat : Qutub Shahi Daur se Global Warming tak)
by Dr. Sahiha Naheed

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
ISBN 93-89455-33-2
9789389455335
A for Arshia Publications

+91 9971-77-5969
www.arshiapublications.com

arshiapublicationspvt@gmail.com

اردو نظم میں مناظر فطرت : قطب شاہی دور سے گلوبل وارمنگ تک

ڈاکٹر صبیحہ ناہید